

پچی اور آپ بیتی تحریروں کا انتخاب

# خوفناک کہانیاں

ماہنامہ  
April 2018



سچی اور آپ بیتی تحریروں کا انتخاب

# ماہنامہ خوفناک کہانیاں

کراچی

جلد نمبر 18 شمارہ نمبر 4 اپریل 2018ء

مینیجر ایڈیٹر خالد علی

ایڈیٹر محمد ذیشان

نگران شاہد علی

قیمت -70 روپے

سالانہ قیمت -1500 روپے

ای میل ایڈریس: Khofnakkahaniya@gmail.com

خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ خوفناک کہانیاں

نورانی آرکیڈ میزٹائن فلوور

رقن تلاء نمبر 3، کراچی

32744391



اوارہ کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متعلق ہونا ضروری نہیں خوفناک کہانیاں میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاق ہو سکتی ہے

126 مریم فاطمہ

سزا

152 ثناء احمد

خونفاک ہیلوین

185 علی اختر

سونامی

199 راجہ یاسر مظہر

بھیا تک عاشق

216 رزاق شاہد کوہل

پراسرار ہستی

234 منزہ محسن

برفانی طوفان

121 محمد نادر شاہ ظفر

خونفاک سایہ

144 عامر ملک

رقص عروسی

164 انیم لے راحت

کنارا

193 ایمل تیار احمد

شیطانی عمل

212 ادارہ

رنگ دھنک

10 ملک فہیم ارشاد

سوسال

35 طاہر عباس

ڈریکولا  
کی طاقت

44 ایم الیاس

پراسرار ہمنژاد

69 مریم شاہ بخاری

پاکیزہ محبت

91 آصف پروین

دوپٹہ

96 ساحل غامبخاری

جل پری

مفتی محمد حسام اللہ شریفی

آپ کے مسائل

29 طارق محمود

آسیبی انتقام

41 طارق محمود آکاش

چھلاوا

65 گلاب خان ونکی

کال گرل

83 سید عروج فاطمہ

گہرا راز



قارئین کرام! السلام علیکم!

اپریل 2018ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہر ماہ شمارے میں قارئین کی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے اس میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ہر سالے کی کامیابی کی پیچھے اس سالے کے قارئین کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس میں کیا شائع ہونا چاہئے یا اس میں کیا تبدیلیاں لانی چاہئے اسی لئے آپ سب اپنی رائے کا مکمل کا اظہار کرنا کریں، تاکہ ہم اس کو مزید بہتر سے بہتر بنا کر آپ لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔

ایڈیٹر

محمد ذیشان

**صبا اسماعیل**، کراچی سے، السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب امید ہے خوفناک کا تمام اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا۔ پہلے ہی مبینہ کہانی تھی اور پہلے ہی مبینہ شائع ہوئی آپ کی طرف سے اس حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ، مجھے خوفناک سے میری دوست نے متعارف کروایا تھا۔ وہ بہت شوق سے اسے پڑھتی ہے اور ہر ماہ اپنی کہانی اور خط وغیرہ بھیجتی رہتی ہے، ہمارا خوفناک میں بھی اسی نے مشورہ دیا تھا مجھے اپنی کہانی بھیجنے کا اور میں بہت شکریہ ادا کرتی ہوں اس کا اور خوفناک کے پورے اسٹاف کا جنہوں نے میری کہانی کو پسند کیا اور شائع کیا۔ انشاء اللہ میں مزید تحریریں اس میں جلد سے جلد بھیجوں گی۔ قسط دار کہانی پر اسرار ہمزاد "ایم الیاس صاحب" کی پہلی قسط بہت شاندار رہی، ایم اے راحت صاحب کی بھی قسط دار کہانی "کنارہ" بہت اچھی رہی اب آگے کی قسطیں پڑھنے کو دل بے چین ہو رہا ہے۔

☆ صبا صاحبہ: پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ اور خطوط کی محفل میں دیکھ، آپ کی کہانی شائع کر کے حوصلہ افزائی تو ہو گئی اب آئندہ ماہ کے لئے بھی اپنی ڈھیر تحریریں ہمیں ارسال کریں۔ شکریہ۔

**بلقیس خان** پشاور سے، السلام علیکم، آداب عرض ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ خوفناک ڈائجسٹ دن دو گنی رات چوکی ترقی کرے، آمین، ماہ مارچ کا خوفناک ڈائجسٹ 21 فروری کو ملا، ٹائٹل کچھ خاص تاثر دے گا۔ مگر ٹائٹل پر موجود حسینہ انگلیش فلموں کی ولن لڑکی ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ڈائجسٹ کھولا۔ مگر اپنی کہانی کو نہ پا کر تھوڑی تا امید ہی چھاپی دل پر، خیر سب سے پہلے میں ایک بہت اہم بات گزارش کرنا چاہوں گی۔ ماہ مارچ 23 تاریخ ہم سب کے لئے بہت ہی زیادہ اہم ہے۔ مگر میرے لئے یہ تاریخ سب سے زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے۔ کیونکہ 23 مارچ کو میری سالگرہ ہے اور میں اپنی سالگرہ میں خوفناک اور تمام قارئین کو شریک کرنا چاہتی ہوں۔ سو پلیز، میرے لئے اس دن پڑھیں ساری دعاؤں میں ضرور یاد رکھنے گا۔

☆ بلقیس صاحبہ: غلو نہ بنا، جمعہ کہانیوں کی تعریف کے ارسال کرنے کے لئے دیری دیری تھینکس، آپ کی کہانی اس ماہ شائع نہ ہو سکی، اگلے ماہ کے لئے وعدہ اور قوی امید ہے کہ اگلے ماہ بھی نوازش نامہ ارسال کرنا بھولیں گی نہیں۔

Thanks

**ساجدہ راجا** ہندواں سرگودھا سے، میری طرف سے تمام خوفناک راسخ ز اور ریزہ ز کو السلام علیکم، ہر ماہ خوفناک کا ٹائٹل چونکا دینے والا ہوتا ہے جو بہت زبردست بات ہے، کہانیاں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں، قسط دار میں کنارہ "ایم اے راحت صاحب" کی کہانی زبردست لگی، امید ہے آگے بھی کچھ اچھا ہی لکھا ہوگا۔ خوفناک ڈائجسٹ کو ہر عمر کے لوگ پڑھتے

ہیں۔ پلیز توجہ فرمائیں۔ میری کہانیاں یقیناً آپ کو مل گئی ہوں گی۔ کیا اپریل کے شمارے میں میری کوئی کہانی شامل اشاعت ہے۔ آئندہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆ ساجدہ صاحبہ: خط لکھنے، کہانیاں ارسال کرنے اور کہانیوں پر قلمی لگاؤ سے تمہارے لئے تھینکس، آئندہ ماہ نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔ نئی کہانی کے ساتھ۔

**ایس امتیاز احمد** کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ رواں کا شمارہ سامنے ہے۔ لطیف نائل کے ساتھ تمام تر مسئلے خوب رہے۔ آرنیل لگانے کا شکریہ، ہٹاری "راج دلاری" آپ کے پاس ہے پلیز دیکھئے۔ مزید Ad میں شعلے کی موت، زندگی اور موت، ہمہ ارسال خدمت ہے، پلیز قریبی اشاعت میں جلد دیں، آپ کو اور دیگر اسٹاف اور "خوفناک ڈائجسٹ" کے تمام خوب صورت لکھنے والے راسخ ز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دو پورز کو دعا سلام۔

☆ امتیاز صاحب: نیک تمناؤں کے ساتھ دیری دیری تھینکس، آپ کی والہانہ چاہت خوفناک ڈائجسٹ سے قابل تحسین ہے، آپ کی سخت پالی کے لئے دعا گو۔ آپ کی راج دلاری بہت جلد منظر عام پر آجائے گی۔

**قدیر رانا** راولپنڈی سے، آداب عرض: آپ کی خیریت کا طالب ہوں، دو فرمیں ارسال خدمت ہیں، کسی بھی آنے والی اشاعت میں جلد دیکر مشکور فرمائیں۔ ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ قدیر صاحب: غزل شامل اشاعت ہے۔ آپ کی خوشی کیلئے دعا گو ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید خوشیوں سے نوازے، غزل بھیجئے کا شکریہ۔

**محمد کامران** حیدرآباد سے، السلام علیکم! ہمارا خوفناک ڈائجسٹ مارچ کا شمارہ میرے سامنے ہے، میں نے کچھ کہانیاں پڑھ لی ہیں جو کہ میری خواہش کے عین مطابق ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو کافی عرصہ سے پاکستان میں بھی مختلف چینلوں پر ہر ماہ راسخ ز کی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جا رہے ہیں۔ ورنہ پہلے صرف چند انڈین چینلوں پر ہی ہر ماہ راسخ ز دکھائے جاتے تھے۔ شروع میں ایک دو ڈائجسٹ میں ہر ماہ کہانیاں بھیجتی تھیں مگر اب تو ہر ڈائجسٹ اپنے شمارے میں ایک ہر ماہ کہانی ضرور شائع کرتا ہے، ہر ماہ کہانیوں کی ڈیمانڈ کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے جہاں تک میرا اپنا خیال ہے کہ خوفناک ڈائجسٹ پاکستان کا وہ واحد ڈائجسٹ ہے جو پچانوے فیصد صرف ہر ماہ کہانیاں چھاپ رہا ہے اور اس سے ہر ماہ کہانیاں پڑھنے والوں کی دل کی تسکین ہو رہی ہے۔ میں کوئی دو سال سے خوفناک ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں مگر فرسٹ ٹائم خط ارسال کر رہا ہوں، وجہ یہ کہ اب خوفناک ڈائجسٹ کی مشہور و معروف کہانی "جل پری" جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا، یہ ایسی کہانی ہے جو کہ اپنے پڑھنے والوں کو جکڑ رکھا ہے اس کی ہر قسط میں ایک نیا پن، اچھوتے طریقے سے نظر آتا ہے۔

☆ کامران صاحب: خوفناک ڈائجسٹ میں موسٹ ویکلیم، چلے حوصلہ افزائی ہو گئی اور اب امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ بھی اپنی رائے بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ Thanks

**سبحان علی** لاہور سے، السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب امید ہے خوفناک کا تمام اسٹاف خیر و عافیت سے ہو اور خوش و خرم ہو، سلام کے بعد عرض یہ ہے کہ سر میں خوفناک ڈائجسٹ میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ میرا ہی لیٹر شائع کریں گے۔ اور میں خوفناک ڈائجسٹ کا باقاعدہ سے حصہ بننا چاہتا ہوں۔ اور اچھے امید ہے کہ آپ لوگ میرا دل نہیں تو ذرا دے اور مجھے خوفناک کا حصہ بناؤ گے۔ اور میری کہانیاں شائع کریں گے۔ یہ میرے لئے قابل فخر بات ہوگی کہ میں خوفناک کا حصہ بنوں، خوفناک کے راسخ ز میں سے کچھ میرے دوست بھی ہے انہوں نے ہی مجھے خوفناک میں لکھنے کا مشورہ دیا ہے کیونکہ میں نے سنا ہے کہ خوفناک نئے لکھنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

☆ سبحان صاحب: سب سے پہلے آپ اپنے شہر کا نام تو لکھتے۔ لیجئے جناب آپ کی حوصلہ افزائی ہو گئی اب جلد سے جلد میں اپنا اچھی اچھی تحریریں بھیجیں تاکہ ہم ان کو شائع کر کے آپ کو مزید شکریہ کا موقع عطا کر سکیں۔



# آپ کے مسائل اور ان کا حل

مفتی محمد حسام اللہ شریفی

## معاشرے کی اصلاح کا آغاز

سوال: معاشرے کی اصلاح کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟

جواب: اصلاح معاشرہ کا آغاز اپنی ذات سے کیا جائے کہ ہر شخص اپنی اصلاح کرے۔ انے قول و عمل کے تضاد کو دور کرے۔ اور سچا اور کھرا مسلمان بن جائے۔ دوسروں پر تنقید اور نکتہ چینی سے اجتناب کیا جائے۔ روز قیامت اللہ تعالیٰ ہم سے ہمارے متعلق پوچھے گا کہ تم نے کون سے اعمال کئے۔ اللہ تعالیٰ کی فرمائیں داری کے کتنے کام کئے اور کتنی نافرمانی کی۔ دوسروں کے اعمال کے متعلق وہ ہم سے نہیں پوچھے گا۔ اس لئے ہمیں صرف اپنے اعمال کو درست کرنا چاہئے۔ دوسروں کے اعمال کے ہم ذمہ دار نہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔

## فرد کی اصلاح کا دار و مدار

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرد کی اصلاح کا دار و مدار کس چیز پر رکھا ہے؟

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے کہ آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک ٹوٹخرا ہے وہ سدھر جائے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے، وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو جسم کا وہ حصہ ہے دل، جو تمہاری شخصیت کا مرکز ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں لالچ، حرص، محبت، نفرت، جذبات اور محرکات سب جمع ہو جاتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایک چوٹی سی چیز کے

بگڑنے سے زندگی کیسے بن بگڑ سکتی ہے؟ سو آج کل کینسر کا مرض بڑا عام ہے۔ جسم انسانی میں اربوں خلیے ہوتے ہیں ان میں سے اگر صرف ایک خلیہ بگڑ جائے تو یہ موت کا وارنٹ ثابت ہوتا ہے کینسر کی بیماری کی جڑ صرف ایک خلیے کے بگڑنے سے شروع ہوتی ہے، درحقیقت دل انسانی جسم میں سب سے اہم عضو ہے اس میں اللہ کی محبت، رسول کی محبت، قرآن کی محبت پیدا ہو جائے تو صرف ایک آدمی نہیں بلکہ پورا معاشرہ سدھر سکتا ہے اور ایک زبردست انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور دل کی حالت کی بہتری کی صرف ایک صورت ہے کہ اس میں قرآن کو بسالیا جائے، اس کو پڑھا جائے، اس کو سمجھے کی کوشش کی جائے اور پھر عمل کی طرف قدم بڑھایا جائے۔

## اصلاح کا عمل

سوال: آدمی کو اصلاح کے عمل کا آغاز کہاں سے کرنا چاہئے؟

جواب: اصلاح کے عمل کا آغاز آدمی کو اپنی ذات سے کرنا چاہئے سب سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے اور اس کے بعد اپنے گھر والوں کی اصلاح کی جائے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر شخص سے اس کے اپنے متعلق پوچھ چگے کرے گا۔ دوسروں کے متعلق اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ اس لئے دوسروں کا خیال چھوڑ کر ہر مسلمان کو اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے۔

## اصلاح نفس کا بہترین طریقہ

سوال: اصلاح نفس کے لئے سب سے بہترین طریقہ کیا ہے؟

جواب: آدمی اپنی خواہشات نفس کو ترک کر دے اور جس چیز کو اس کا جی چاہتا ہے اس کو کرنے کی بجائے وہ یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے اور کن کاموں کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے اور کن باتوں کو کرنے سے اس نے روکا ہے اس کی پابندی کر کے ہی آدمی اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔

## اللہ اکبر کا اصل مفہوم کیا ہے

سوال: اللہ اکبر کا اصل مفہوم در مطلب کیا ہے؟

اور نماز کے ایک رکن سے دوسرے رکن میں جاتے وقت اللہ اکبر کہنے کا حکم کس سبب سے دیا گیا ہے؟

جواب: اللہ اکبر کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے یعنی دنیا میں ایسا مقام نافذ اور قائم کرنا مسلمانوں کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ جس سے یہ حقیقت واضح ہو کہ واقعہ اللہ کی بڑائی اور اس کی کبریائی سب پر حاوی ہے اور اس کی بڑی بافضل مافی جا رہی ہے اس کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کیا جا رہا ہے اس کے حکم سے بالاتر کسی کا حکم نہ ہو اس کی بات سب سے برتر اور ارفع و اعلیٰ ہو۔

## اللہ سے وعدہ

سوال: میں نے بیماری میں اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ٹی وی وغیرہ نہیں دیکھوں گی لیکن اگر اب میں دیکھنا چاہوں تو اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ذہن کی توجہ ہٹانے کے لئے میں ٹی وی دیکھوں۔

جواب: اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کیجئے اور ٹی وی نہ دیکھنا تو ویسے بھی آدمی کو بہت سے گناہوں سے بچاتا ہے اس لئے آئندہ ٹی وی دیکھنے سے اجتناب کیجئے۔ انشاء اللہ آپ بہت جلد پورے طریقے سے صحت یاب ہو جائیں گی۔ ٹی وی دیکھنے کے بجائے اچھی اچھی کتابیں پڑھا کیجئے اس سے آپ کی توجہ بھی بٹ جائے گی۔

سوال: سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کیا وعدے کئے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں مسلمانوں سے تین وعدے کئے ہیں۔ (۱) حکومت، (۲) دولت (۳) امن اور ان تین نعمتوں کے حصول کے لئے لازمی قرار دیا ہے کہ مسلمان سب سے پہلے پابندی کے ساتھ نماز قائم کریں، دوسرے زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کریں اور تیسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری کریں۔

## نکاح میں وکیل

سوال: نکاح کے وقت عام طور سے ایک شخص لڑکی سے اجازت لے کر آتا ہے جو عام طور پر وکیل کہلاتا ہے اور نکاح پڑھانے والے سے کہتا ہے کہ میں فلاں کا وکیل ہوں اور آپ کو نکاح پڑھانے کی اجازت دیتا ہوں۔ کیا شرعاً یہ طریقہ درست ہے؟

جواب: شرعاً یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ بہتر اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ نکاح پڑھانے والا احورث یا اس کے ولی کا وکیل بنے۔ نکاح کے وقت گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

## اپنی اصلاح کی فکر کرنا

سوال: آدمی کو صرف اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے یا دوسروں کی اصلاح کی بھی کوشش کرنی چاہئے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہ بات واضح طور پر بیان فرمائی ہے کہ ایک مسلمان کو سب سے پہلے اپنی اور اپنے گھر والوں کی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے اس کے بعد پھر دوسروں کی اصلاح کا خیال کرے۔ دوسروں پر نکتہ چینی اور تنقید سے حتیٰ امکان گریز کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح اور سب سے آسان کام دوسروں پر تنقید اور نکتہ چینی ہے۔

آج کی رات مجھے انسانی روپ ملے والا تھا اس لئے میری طاقتوں میں کمی گنا اضافہ ہو گیا تھا، غائب ہونا بھی میری طاقتوں میں شامل تھا۔ سانپ چاہے سوسال کا بھی ہو جائے اپنا انتقام ضرور لیتا ہے

**دیل** گاڑی کی تیز دسل کی آواز فضاء میں گونجی تو ریل گاڑی کی کھڑکی کی سلاخوں سے سر نکائے سوئی ہوئی میرا کی آنکھ کھل گئی وہ سیدھی ہوئی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے کی ریل گاڑی اب اسٹیشن میں داخل ہوئی تھی اور اس کی اسپینڈ کا کافی کم تھی ریل گاڑی آنے پر پلیٹ فارم پر بے بیچ پریشے اکا دکا مسافر اٹھ کر ریل گاڑی کے قریب آگئے تھے ریل گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور ڈبوں میں بیٹھے مسافر اٹھ کر باہر جانے لگے پھر تھوڑی دیر بعد ریل گاڑی کی دسل کی آواز پھر فضاء میں گونجی اب گاڑی چلنے کے لئے تیار تھی پھر گاڑی نے جھٹکا کھایا اور تاریل رفتار سے چلنے لگی اور پھر اس کی رفتار میں اضافہ ہونے لگا ابھی گاڑی اس پلیٹ فارم کو چھوڑنے ہی والی تھی کہ میرا کو اپنی کھڑکی کے پاس سے ایک لڑکا بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔

پھر وہ میرا والے ڈبے میں سوار ہو گیا یہ لڑکا بھاگ کر سوار ہوا تھا میرا نے دیکھا وہ ایک پرکشش اور خوب صورت نوجوان تھا وہ چلتے ہوئے آیا اور میرا کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اس نے کندھے پر لڑکا اپنا سفری بیگ اتار اور سیٹ پر رکھ لیا۔

”گنا ہے آپ اسٹیشن پر سونگے تھے۔“ میرا نے ہنستے ہوئے اس لڑکے سے مخاطب ہوتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

”جی.....“ اس لڑکے نے سوالیہ نگاہوں سے میرا

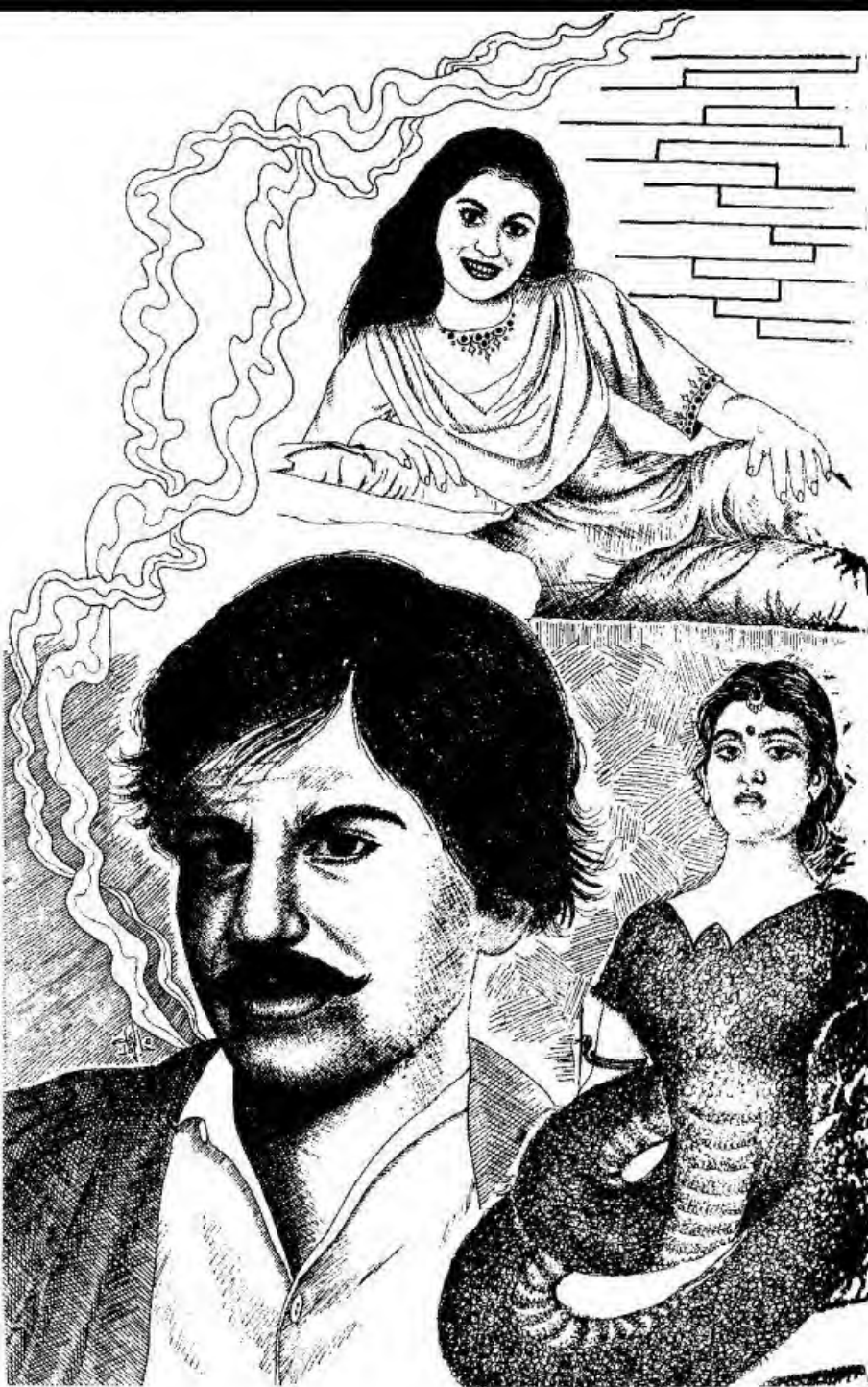
کی طرف دیکھا پھر وہ میرا کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور لٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”نہیں دراصل میں جس تانگے پر اسٹیشن کی طرف آ رہا تھا اس کا دھرا ٹوٹ گیا تھا اسی وجہ سے اسٹیشن پر پہنچنے میں تاخیر ہوئی اور یہاں پہنچا تو ریل گاڑی چل پڑی تھی اسی لئے مجھے بھاگ کر ڈبے میں سوار ہونا پڑا۔“

”اوہ.....“ میرا نے سمجھنے والے انداز میں سر کواٹیاں میں جنبش دی۔

”جی آپ کچھ کھائیں کی.....“ تھوڑی دیر بعد لڑکے نے اپنے سفری بیگ کی زپ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں..... شکریہ.....“ جواباً میرا نے مسکراتے ہوئے لٹی میں سر ہلایا، اس لڑکے نے بیگ سے بسکٹس کا ایک پیکٹ نکالا اور پیکٹ کھول کر اس میں سے ایک بسکٹ نکال کر کھانے لگا بیوگ تو میرا کو لگی ہوئی تھی اور وہ یہ بات بھی بخونی جانتی تھی کہ دوران سفر کسی اجنبی مسافر سے چیز لے کر نہیں کھانی چاہئے اسی وجہ سے اس نے اس لڑکے کو انکار کیا تھا لیکن میرا کی نظریں کبھی بھی خود بخود لڑکے کے ہاتھوں میں پکڑے بسکٹ کے پیکٹ پر پڑتی تھیں اور اس کے پیٹ میں اچھلتے چوہے مزید تاجنا شروع کر دیتے تھے اور جس رفتار سے وہ لڑکا اپنے پیٹ میں بسکٹس اتار رہا تھا اس سے پیکٹ میں موجود بسکٹس کی تعداد آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی



اجانک اس لڑکے کی نظر سیرا پر پڑی تو وہ مسکرایا اور سٹکس کا پکٹ دوبارہ سیرا کی طرف بڑھا دیا۔

”لے لیجیے۔“

”نہیں شکریہ۔“ سیرا نے اس دفعہ بھی مشکل سے انکار کیا۔

”نفسہ مت کیجیے گا میں دراصل اجنبیوں سے چیز لے کر نہیں کھاتی۔“

وجہ سن کر وہ لڑکا مسکرایا، سیرا کو اس لڑکے کی مسکراہٹ بہت بھلی لگی اس لڑکے نے سیٹ پر بڑے اپنے سفری بیگ کی زپ دوبارہ کھولی اور اس میں سے بسکٹ کا ایک بند پکٹ نکالا۔

”یہ لے لیجیے۔ یہ پکٹ بند ہے۔“ اس لڑکے نے وہ پکٹ سیرا کی طرف بڑھایا تو سیرا نے ہچکچاتے ہوئے سٹکس کا پکٹ پکڑ لیا۔

”میرا نام کاشف ہے۔“ لڑکے نے اپنا تعارف کرانے میں ہل کی۔

”اور میرا نام سیرا ہے۔“ جواباً سیرا نے اپنا نام بتایا اس نے اب سٹکس کھانے شروع کر دیے تھے۔

”ویسے آپ کہاں جا رہے ہیں۔“ سیرا نے پوچھا۔

”نواب شاہ۔“ کاشف نے بتایا تو سیرا خوشی سے چبکی۔

”ارے۔“

”کیا ہوا۔“ کاشف سیرا کے چپکنے پر حیران ہوا۔

”میرا گاؤں بھی وہی ہے۔“ سیرا نے مسکراتے ہوئے وجہ بتائی۔

”اچھا۔“ جواباً کاشف نے مسکراتے ہوئے لفظ اچھا کو لہا کیا۔

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے کہ ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے ہیں۔“

”ہاں۔“ سیرا نے تو سہی۔ ”سیرا خوشی سے بڑبڑائی

اس کی خوشی دیدنی تھی۔

”جی۔“ کاشف کو شاید سنا ہی نہیں دیا تھا۔

”م۔“ میں کہہ رہی تھی کہ آپ کی بات ٹھیک ہے۔ سیرا نے غصیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ کہاں سے آ رہی ہیں۔“ کاشف نے بسکٹ کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”اپنی تعلیم مکمل کر کے۔“ یایوں کہہ لیں اپنی آدمی زندگی گزار کر شہر سے واپس آ رہی ہوں۔“ سیرا نے آخری جملہ کھوئے کھوئے لہجے میں ادا کیا۔

”کیا مطلب۔“ کاشف نے انجمن آمیز نگاہوں سے سیرا کی طرف دیکھا۔

”اباجی نے بچپن سے ہی تعلیم کے سلسلے میں شہر بھیج دیا۔“ سارا بچپن وہی گزرا اور آج میں اپنے گاؤں واپس لوٹ رہی ہوں 22 کا ہندسہ پار کرنے کے بعد۔“ سیرا نے اپنی زندگی کا احوال مختصر الفاظوں میں بیان کیا اس کے لہجے میں دھک کا عنصر شامل تھا۔

”ارے۔“ بے اختیار کاشف کے منہ سے نکلا تو سیرا چوکی۔

”کیا ہوا۔“ سیرا نے پوچھا۔

”سیرا اور آپ کی کہاں بھی ملتی جلتی ہے۔“ کاشف نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”کیا مطلب۔“ سیرا نے بظاہر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ سیرا جی میں بھی بچپن سے ہی تعلیم کے سلسلے میں شہر تھا اور میں بھی آج اپنی تعلیم مکمل کر کے نواب شاہ واپس آ رہا ہوں۔“ کاشف نے بتایا تو سیرا ہنس پڑی۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“ وہ دیر سے مسکراتے ہوئے بڑبڑائی۔

”کیا کہا آپ نے۔“ کاشف نے سوالیہ نگاہوں سے سیرا کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“ آپ یہ بتائے کہ اگر آپ شہر سے تعلیم مکمل کر کے گاؤں واپس آ رہے تھے تو پور

سے ریل میں کیوں سوار ہوئے۔“ سیرا نے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”دراصل فتح پور میں میرا ایک دوست رہتا ہے ہم دونوں شہر سے صبح کی گاڑی سے سوار ہوئے تھے رات پورا اسٹیشن پر آئے تو وہ مجھے زبردستی اپنے گاؤں لے گیا ان کے گھروالے اتنے تھے کہ وہ مجھے آنے ہی نہیں دے رہے تھے انہوں نے میری خوب آؤ بھگت کی پڑی مشکل سے اپنی جان چھڑا کر وہاں سے نکلا تو تانگے کا دھرا ٹوٹ گیا اسٹیشن پہنچا تو گاڑی چل پڑی اور مجھے بھاگ کر گاڑی میں سوار ہونا پڑا۔“ کاشف نے ہنستے ہوئے وجہ بتائی تو سیرا بھی بے اختیار ہنس پڑی۔

”ویسے آپ شہر جانے کے تذکرے پر کافی افسردہ ہوئی تھیں۔“ گلتا ہے آپ کو شہر کی زندگی کچھ بھائی نہیں۔“ کاشف نے سیرا کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”آپ نے بالکل صحیح کہا۔“ سیرا نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

”مجھے تو اب ایک وجہ سے شہر آنا پڑا اباجی کا حیران بڑا سخت ہے۔“ ورنہ میں تو اپنے گاؤں میں خوش تھی۔“

”سیرا جی یہ بات بھی ہم دونوں میں بہت میل کھاتی ہے۔“ میں بھی اپنی اماں کی وجہ سے شہر اپنے ماموں کے ساتھ آیا تھا ورنہ میں بھی اپنے گاؤں سے بے حد محبت کرتا ہوں۔“ کاشف نے مسکراتے ہوئے بتایا تو جواباً سیرا نے بھی صرف مسکراتے ہی ہی اکتفا کیا۔

”کیا کہا آپ نے۔“

”ویسے آپ گاؤں میں کہاں رہتی ہیں۔“ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کاشف نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”میں چوہدری نواز کی بیٹی ہوں۔“ سیرا نے بتایا۔

”اوہ۔“ کاشف نے یہ جاننے کے بعد منہ سے ایک طویل اور بو جھل سانس خارج کی آگ دونوں طرف ہی لگی ہوئی تھی کیونکہ جب وہ ریل گاڑی کے اس

ڈبے میں سوار ہوا تھا تو وہ بھی سیرا کی خوب صورتی پر مرعہ مٹا تھا اور اس کی خوشی بھی دیدنی ہو گئی تھی جب اسے پتہ چلا تھا کہ سیرا اسی کے گاؤں کی ہے لیکن پھر اس خبر نے جلتی آگ پر پانی چھرنے کا کام کیا تھا کہ سیرا چوہدری نواز کی بیٹی ہے۔

”اس کا مطلب آپ بڑے لوگ ہیں۔“ وہ ٹوٹے دل کے ساتھ بولا۔

”نہیں کاشف جی بڑی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور ہماری تعلیم نے ہمیں اتنا شعور تو دیا ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔“ سیرا نے کاشف کا بچا چہرہ دیکھ لیا تھا۔

”جی بالکل۔“ کاشف نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیکن بات صرف کہنے کی حد تک ٹھیک ہے مگر ماننے کی اعتبار سے نہیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ سیرا واقعی سمجھی نہیں تھی۔

”سیرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سیرا جی کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں مگر ماننا کوئی نہیں ذات پات اور جتنے پر ابھی بھی کئی جھگڑتے ہوتے ہیں کل ہوتے ہیں ہمارا معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ ہونے کے باوجود ایسی بے معنی باتوں کو آگے رکھتا ہے اور مذہب کی باتیں کہنے تک محدود رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو انسان کو انسانوں میں پیدا کرتا ہے یعنی اپنی سب سے پیاری مخلوق اشرف المخلوقات میں۔ لیکن انسان، انسان کا ہی دشمن ہے اسے نچا دیکھتا ہے خالق تو واضح کہتا ہے کہ سب انسان میری نظر میں برابر ہیں لیکن انسان سوائے انفس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔“ کاشف دلیہر داشتہ لہجے میں بولا۔

”کاشف جی آپ کی باتیں دل کو چھو رہی ہیں اور میں آپ کی باتوں سے متفق بھی ہوں۔“ سیرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور آپ ایک اچھے انسان ہیں۔“

سیرا کی اس بات پر کاشف مسکرایا لیکن اندر سے



وہ ٹوٹ چکا تھا اس کی پہلی محبت شروع ہونے سے پہلے ہی دم توڑ چکی تھی اسی وقت ریل گاڑی کی دسل کی آواز فضاء میں گونجی۔

”جیسے باتوں ہی باتوں میں سفر کا پتہ ہی نہیں چلا اور نواب شاہ بھی آگیا۔“ سمیرا نے کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”واقعی.....“ جواباً کاشف مسکرایا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی کاشف جی.....“ سمیرا نے اپنا بیک اٹھاتے ہوئے کہا۔  
”مجھے بھی.....“ جواباً کاشف ہنسی کی لہریں بٹھاتا ہوا تھا۔

آپ نے بتایا نہیں کہ آپ گاؤں میں کہاں رہتے ہیں۔“ سمیرا نے پوچھا۔

”میں رحمت کسان کا بیٹا ہوں.....“ کاشف نے بتایا تو سمیرا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اچھا جی..... امید ہے جلد ہی ہماری دوسری ملاقات ہوگی۔“ سمیرا نے کہا تو جواباً کاشف نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا دونوں ریل گاڑی سے نیچے اترے تو اسٹیشن پر سمیرا کے باپ کا برسوں کا وقفا دار ملازم خوشیا آیا ہوا تھا اس نے سمیرا کا بیگ پکڑا وہ دونوں اسٹیشن سے باہر نکلے تو سمیرا نے دیکھا خوشیا اس کے لئے بھی لے کر آیا تھا خوشیا نے سمیرا کا بیگ بھی میں رکھا اور سمیرا کے لئے بھی کار دروازہ کھول دیا سمیرا نے بھی پرچہ ہٹنے سے پہلے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں تو آخر کار اس کی متلاشی نگاہوں نے اپنی منزل ڈھونڈ ہی لی کاشف تھوڑی دور ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے پورا ہور ہاتھ اوڑھ کر کھڑی اور بھی پرچہ ہٹا خوشیا نے بھی کار دروازہ بند کر دیا اور خود بھی کے آگے بنی جگہ پر بیٹھ گیا کہ چونانے گھوڑے کو اشارہ دیا تو گھوڑا آگے بڑھنے لگا بھی نواب شاہ گاؤں کی طرف جانے والے کچے راستے پر چارہ ہی شام کے سائے ہر طرف پھیلنا شروع ہو گئے تھے سورج اب مدھم نکلیا میں تبدیل ہو چکا تھا پرندے غولوں کی شکل میں اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے اور ہوا کا احساس خوش گوار ہور ہاتھ کھیتوں میں کام کرتے کسان اب اپنا

اپنا کام چھوڑ کر کھیتوں میں بنی پگڈنڈیوں پر چل کر اپنے گھروں کی راہ لے رہے تھے سمیرا ارد گرد لہلہاتے کھیت دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی کھیتوں میں بنی پگڈنڈی پر چلنے کسانوں کی نظارہ دیکھ کر اس کے ذہن میں کاشف کے باپ رحمت کسان کا نام ابھرا۔  
”خوشیا چاچا.....“ بھی میں آگے بیٹھے ہوئے خوشیا کو آواز دی وہ خوشیا کو بچپن میں بھی خوشیا چاچا ہی کہہ کر بلاتی تھی۔

”جی پتر.....“ خوشیا اس کی طرف گھوما۔  
”ہمارے گاؤں میں کوئی رحمت کسان رہتا ہے۔“ سمیرا نے پوچھا۔

”رحمت کسان.....“ خوشیا نے ذریعہ لفظ دہراتے ہوئے کہا۔

”ہاں پتر.....“ ہماری زمینوں پر ہی کام کرتا تھا.....“ خوشیا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔  
”کرتا تھا.....؟“ سمیرا نے سوالیہ نگاہوں سے خوشیا کی طرف دیکھا۔

”ہاں کرتا تھا.....“ مگر پھر اس نے کام چھوڑ دیا تھا۔“ خوشیا نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔  
”مگر کیوں.....؟“ سمیرا نے پوچھا۔

”وہ تو بڑی پرانی بات ہے پتر..... یہ اس دور کی بات ہے جب تو میری گود میں کھلنا کرتی تھی۔“ خوشیا نے مسکراتے ہوئے بتایا تو سمیرا اٹھ کھڑی ہو کر پڑی۔  
”ان کا گھر کہاں ہے.....؟“ سمیرا نے تھوڑے

توقف کے بعد پوچھا۔  
”تیری بھیلی ہے نہ کھکھی اس کی بھلی میں اس کا مکان ہے..... پر..... تو کیوں پوچھ رہی ہے۔“ خوشیا نے ہناتے ہوئے پوچھ لکھا۔  
”ہں ایسے ہی..... کھکھی ٹھیک ہے نہ چاچا.....“ سمیرا نے بات کو نالائے ہوئے پوچھا۔  
”ہاں پتر وہ بالکل ٹھیک ہے..... اگلے مہینے اس کا بیاہ ہے۔“ خوشیا نے بتایا تو سمیرا چوٹکتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”اچھا.....“ اس نے حیرانگی سے لفظ ”اچھا“ کو لہجہ بگڑا۔

”ہاں پتر.....“ خوشیا سمیرا کے اچھلنے پر ہنسا۔  
”میری بچپن کی بھیلی کا اگلے مہینے بیاہ ہے اور مجھے معلوم ہی نہیں۔“ اس کا لہجہ شکاقتی تھا۔

”پتر وہ کون سا بڑی لکھی ہے جو تجھے خط کے ذریعے بتاتی..... اب آگئی ہے تو مل کر کھلے شکوے دو کر لینا۔“ خوشیا نے سمیرا کے اچھلنے پر ہنسا خوشیا نے کہا تو اس نے منہ ہناتے ہوئے کہا۔  
”وہ تو میں کروں گی ہی۔“

خوشیا اس کے یوں منہ ہناتے پر بے اختیار ہنس کر اس کے لیے سمیرا نے دوبارہ بھی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا کھکھی کے تذکرے سے اسے اپنا دھندلا بچپن یاد آ گیا تھا وہ اور کھکھی گاؤں کی گلیوں میں چپکتے ہوئے کھکھی تھیں کھیتوں میں بنی پگڈنڈیوں پر دوڑتی تھیں اور اکثر ان پگڈنڈیوں پر پھسل بھی جاتی تھیں۔

بیٹے بچپن نے اس کی یادوں پر بے پیرہ کیا تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

وہ جو بھلی بچپن تو اس کا باپ چوہدری نواز اور بڑی دادی جمیلہ بیگم جو بھلی کے صدر دروازے پر اس کے استقبال کے لئے کھڑے تھے چوہدری نواز نے روایتی زمینداروں کی طرح بوکی کی قمیض کورے لکھے کی شلوار اور قیمتی واسکٹ زیب تن کر رکھی تھی سر پر اونچے شیلے والی پگڑی اور پاؤں میں تلے دار کھٹا چوہدری نواز کی نوک دار اوپر کوٹھی پر غرور محنت مند مومچیں تھیں جو اس کی شخصیت کو خاصا بارعب بناتی تھیں برسوں کی جدائی میں سمیرا جب باپ سے ملنے تو آسٹوؤں کی برسات شروع ہوئی چوہدری نواز کی آنکھیں بھی برس پڑیں سمیرا اس کی اگلی بیٹی تھی ماں اس کی بچپن میں ہی گزر گئی تھی اتنی بڑی ہوئی میں صرف باپ اور دادی اس کے اپنے گھر تھے دادی سے گھلی تو دادی اسے زور سے سمجھنے لگی زار و قطار رونے لگی جب کافی وقت گزر گیا تو چوہدری نواز اپنی ماں جمیلہ بیگم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”چل بس کراماں..... اب یہ بیکل رہے گی۔“  
جمیلہ بیگم نے اسے خود سے علیحدہ کیا اور اس کا چہرہ لرزے ہوئے ہونٹوں سے چومنے لگی پھر یہ چھوٹا سا قافلہ جو بھلی میں داخل ہوا جو بھلی بہت شاندار تھی جو بھلی کے اندر داخل ہوں تو کھلا کشادہ صحن اپنی مثال آپ تھا۔ کھانا چوہدری نواز جمیلہ بیگم اور سمیرا نے کھٹے ہی کھایا تھا سمیرا نے ایک بات نوٹ کی تھی جب سے وہ جو بھلی میں آئی تھی اس کی دادی جمیلہ بیگم بالکل خاموش تھیں کھانے کی میز پر وہ وقفے وقفے سے آنکھ چرا کر سمیرا کی طرف دیکھ لیتی تھیں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی اس نے بیک سے باریک لان کا سوٹ نکالا اور اسے تبدیل کرنے کے بعد کمرے کی اگلی اور بڑی سی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہوئی کھڑکی کے چار لکڑی کے پتے تھے جو دو دائرہ کی جانب اور باہر کی جانب کھلتے تھے بیچ میں لوبے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

رات نے اپنی سیاہ چادر ہر طرف تان لی تھی لیکن چاند کی روشنی نے رات کی سیاہی کو کافی کم کر دیا تھا سمیرا کھڑکی کی سلاخ کو کھٹا سے کاشف کے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی اس کی آنکھوں میں کاشف کا چہرہ گھوم رہا تھا وہ صبح کا انتظار کر رہی تھی تاکہ اپنی بھلی کھکھی سے ملنے کے بعد کسی بھانے سے کاشف کے گھر جاسکے۔

”چھن..... چھن.....“ کمرے میں پائل کی تیز آواز نے اسے کاشف کی یادوں سے باہر کھینچا اس نے چوٹکتے ہوئے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں اور پھر گھومی مگر کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

”چھن..... چھن.....“ ایک مرتبہ پھر اس کے کانوں میں پائل کی آواز گونجی وہ کھڑکی کی سلاخ چھوڑ کر حیرت سے ارد گرد دیکھنے لگی کمرے میں پائل کی ”چھن چھن“ کی آواز تو آ رہی تھی مگر وہ آواز کہاں سے آ رہی تھی یہ جاننے سے سمیرا قاصر تھی۔

اچانک اس کی نظر پنگ دالی دیوار کے پاس بڑی تو اسے اپنا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رکتا ہوا محسوس کیونکہ سمیرا کو دیوار پر ایک سایہ نظر آرہا تھا

جو کسی عورت کا تھا مگر اس سائے والی عورت کا وجود کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

خوف نے یکدم اس پر سیرا کیا اور اس کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔ ”چمن چمن“ ایک مرتبہ پانکوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی دیوار سے عورت کا سایہ یکدم غائب ہو گیا تھا اب ایسے لگ رہا تھا جیسے کمرے میں کوئی عورت پیروں میں پاگل پہنے ہل رہی ہو سیرا نے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پر آئے پسینے کو صاف کیا پھر سیرا نے ایک حیران کن منظر دیکھا اس کے کمرے کا دروازہ کھل اور پھر بند ہو گیا پھر اس نے کھڑکی کے ذریعے باہر برآمدے میں جو منظر دیکھا اس نے اس کے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑادی اس کے کمرے کے باہر بے برآمدے کے ستون کے پاس ایک لمبے بالوں والی عورت اپنا منہ صحن کی طرف کئے کھڑکی ہی اس عورت کی پیٹھ سیرا کی طرف تھی اور اس عورت کے ارد گرد سفید دودھیاروشی چھائی ہوئی تھی اس عورت نے گردن گھما کر سیرا کی طرف دیکھا تو سیرا کو حیرت کا ایک شدید ہلکا لگا کیونکہ اس عورت کا چہرہ ہو بہو سیرا جیسا ہی تھا۔

”آپ..... آپ.....“ سیرا ابھی چیختے ہی ارادہ کر رہی رہی تھی کہ اس کے کانوں میں تیز پھنکاری آواز پڑی وہ چونکی اس نے دیکھا ایک کالے رنگ کا سانپ کھڑکی کی سلاخوں میں سے ایک سلاخ پر لپٹا ہوا تھا سیرا چیختے ہوئے تیزی سے پیچھے ہٹی سیرا کی چیخ سے اس سانپ نے اپنے بل سلاخ پر سے ڈھیلے کئے اور باہر برآمدے میں جا کر سیرا نے کھڑکی کے باہر نظر دوڑایا تو وہ لمبے بالوں والی اس کی ہمشکل عورت بھی کہیں نظر نہیں آئی سیرا کی چیخ کی آواز باہر چلتے ہوئے پھر بیدار بھورے اور شیرے کے کانوں میں بھی پڑی تو وہ تیزی سے سیرا کے کمرے کی طرف بڑھے یہی نہیں چوہدری نواز اور جیلہ بیگم بھی اپنے اپنے کمرے سے باہر نکل آئے تھے وہ بھی سیرا کے کمرے کی طرف بڑھے۔

”کیا ہوا سیرا پتر.....“ جیلہ بیگم نے ڈری سہی سیرا کو گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ..... وہ..... وادی.....“ ڈری وجہ سے سیرا نے پکلاتے ہوئے کہا۔

”میں نے ابھی کمرے کی کھڑکی کی سلاخ پر ایک سانپ کو لپٹے ہوئے دیکھا۔“

”سس..... سس..... سانپ.....“ ڈری وجہ سے جیلہ بیگم بھی ہلکا نہیں۔

”جی..... جی.....“ سیرا نے جیلہ بیگم سے لپٹتے ہوئے کہا۔

”بھورے، شیرے اس سانپ کو جلدی سے ڈھونڈو.....“ چوہدری نواز نے باری باری بھورے اور شیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی چوہدری جی.....“ دونوں نے بیک وقت بیک زبان ہو کر مودبانہ لہجے میں کہا۔

”وہ..... وہ..... وہ سانپ باہر برآمدے میں گر گیا تھا جب میں چینی تھی.....“ سیرا نے مزید بتایا تو بھورا اور شیرا اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

”شکر ہے سوئے رب کا..... کہ اس سانپ نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“ جیلہ بیگم نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا چوہدری نواز کمرے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا تھا۔

”یہ تو اماں خواہ خواہ میں ڈر گئی.....“

”بہن یہ چوہدری نواز کی ہے اور خواہ خواہ اتنا ڈر گئی.....“ چوہدری نواز نے اپنی موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے خفا لہجے میں کہا۔

”ہر کسی کے سینے میں تیرے جیسا پتھر دل نہیں ہوتا۔“ جیلہ بیگم نفرت سے چوہدری نواز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

چوہدری نواز منہ سے کچھ نہیں بولا اس نے خوشیا کو اپنے کمرے سے حقہ لانے کا کہا جیلہ بیگم اور سیرا کمرے میں موجود پینک پر بیٹھ گئیں سانپ کے چکر میں اپنی ہمشکل عورت کا منظر اس کے ذہن سے نکل

گیا تھا خوشیا نے حقہ لا کر چوہدری نواز کے سامنے رکھ دیا اور وہ حقے کے گہرا، گہرا کش لینے لگا۔

اسی وقت باہر صحن میں ایک مردانہ چیخ کی آواز سنائی دی۔

”یہ تو شیرے کی چیخ لگتی ہے۔“ چوہدری نواز نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے کہا جیلہ بیگم اور سیرا بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں چوہدری نواز باہر صحن کی طرف تیز قدموں سے بڑھا تو خوشیا، جیلہ بیگم اور سیرا نے بھی اس کی پیروی کی باہر صحن میں چھت کی طرف جاتی میز جیوں کے پاس شیراز میں پرگرا ترپ رہا تھا اور بھورا اس پر جھکا ہوا تھا۔

”کیا ہوا ہے.....“ قریب پہنچنے پر چوہدری نواز نے پوچھا بھورا تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”چوہدری جی اس سانپ نے شیرے کو ڈس لیا ہے۔“ بھورے نے شیرے کے پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں سانپ کے کانے کا نشان تھا شیرے نے اب تڑپنا بند کر دیا تھا اس کا جسم اب ساکت ہو چکا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگی تھی۔

”کہاں گیا وہ سانپ.....“ چوہدری نواز نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”پتہ..... پتہ..... نہیں.....“ چوہدری صاحب..... لگتا ہے چھت کی طرف گیا ہے۔“ بھورے نے کانپتے ہوئے لہجے میں بتایا۔

”تو ڈھونڈو اسے.....“ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو جہاں نظر آئے بندوق کی گولی سے اس کا سراڑ اڑینا۔“ چوہدری نواز نے غصے سے بھورے کو حکم دیا اور پھر خوشیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم بھی جاؤ اس کے ساتھ.....؟“

”جی چوہدری جی.....“ خوشیا نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ دونوں خوشیا میز جیوں کی طرف بڑھے تھوڑی دیر بعد ان دونوں کی واپسی ہوئی تو وہ خالی ہاتھ تھے۔

”چوہدری جی اوپر توہ سانپ کہیں بھی نہیں ہے۔“ خوشیا نے بارے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو کیا اس سانپ کو زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا.....“ چوہدری نواز غصے سے دہاڑا۔

”جی..... چوہدری جی..... اگر آپ حکم کریں تو پاس کی جو گیوں کی بستی سے میں وہاں سے نارنگ جوگی کو لے آتا ہوں وہ آسانی سے اس سانپ کو کھڑے لے گا۔“ خوشیا نے ہلکاتے ہوئے بظاہر چوہدری نواز سے مشورہ پوچھا۔

”سانپ خطرناک لگ رہا ہے..... کہیں وہ کسی اور کو نقصان نہ پہنچا دے۔“

”ہوں.....“ چوہدری نواز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گہری سانس لی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو خوشیا..... تم دو گھوڑے لے جاؤ اور جلدی سے نارنگ جوگی کو لے آؤ۔“ چوہدری نواز نے کہا تو خوشیا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گھوڑوں والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”اور بھورے تم شیرے کی لاش کو اس کے گھر پہنچانے کا بندوبست کرو۔“ چوہدری نواز نے بھورے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو بھورے نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور شیرے کی لاش کی طرف بڑھا۔

”اماں آپ بھی اور سیرا پتر تم بھی اپنے اپنے کمرے میں چلو اور دروازہ اندر سے بند رکھنا..... اس سانپ کا کام تھوڑی دیر میں تمام ہو جائے گا۔“ چوہدری نواز نے جیلہ بیگم اور سیرا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو وہ دونوں اپنے اپنے کمرے کی طرف ہوئیں سیرا نے اپنے کمرے میں آنے کے بعد کمرے کا دروازہ بند کر لیا وہ جیسے ہی سیدھی ہونے لگی تو اچانک پردے کے پیچھے سے نکل کر کسی نے مضبوطی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا سیرا نے ڈر کر تیزی سے اس کے ہاتھوں سے نکلنے کی ناکام کوشش کی مگر پیچھے کھڑی شخصیت کے ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی ہاتھوں کے لمس سے وہ

مستند ڈاکٹروں، حکیموں اور ماہرین طب ہدایات مشوروں سے لکھی گئی مفید کتاب

قیمت -/100 روپے

## دل کی بیماریاں

اس کتاب میں، دل کی دھڑکن، خون کے دباؤ کی زیادتی، شریانوں کی تنگی و ہائی بلڈ پریشر، غذائی تبدیلیاں جو آپ کی زندگی بدل دیں گی، امراض دل کا بڑا سبب صدمات، تھائی اور خود غرضی ہے، دل کی جڑیں دماغ میں ہیں، بچپن کی تلخیاں اور ہارٹ ایک، مرض دل کا سن کر اوسان خطا نہ کریں، ایک عظیم کار خیر خون کا عطیہ دینے سے نہ گھبرائیں، سقوط قلب کیا ہے؟ دل کا دورہ زندگی بچائے، خواتین میں ہارٹ ایک کی علامات، غصے سے بچیں دل کے دورے سے بچیں غصے کے عالم میں جسم کی کیا حالت ہوتی ہے؟ غصہ آئے تو کیا کریں، غصہ کم کرنے کے لئے چند تجاویز، بچوں میں دل کی بیماریاں، ہائی پاس سرجری اور فرائیڈ جین، ایئر جنس تدابیر صحت مند دل کے لئے دس قیمتی مشورے، امراض قلب کا نباتاتی علاج، پیدل چلنے کے فوائد، دل کی دھڑکن بڑھنے کا غذا سے علاج، دل کی جلن کا غذا سے علاج، دل کے غلاف کی سوچن، ورم غلاف القلب پیری کارڈائٹس، دل کی سوچن، ورم قلب، دل کی عضلہ کی سوچن کارڈائٹس۔ اور بہت سی دل کی بیماریوں کے بارے میں جانئے اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

شعبہ ایکٹو سنی نوید اسکوائر کراچی  
اردو بازار

Ph:32773302

نے اپنے دھڑک بھٹکا دیا اور اس کا ایک پاؤں دیوار پر ٹک گیا وہ دیوار پر چڑھا اور دیوار پر لگی درخت کی موٹی شاخوں کے ذریعے درخت تک بنا کوئی آواز کئے پہنچا اور اسی احتیاط سے درخت سے نیچے اتر اور درخت کے تنے کے پیچھے چھپ کر گہری گہری سانس لینے لگا۔

جب اس کی پھولی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں تو اس نے درخت کے تنے کے پیچھے سے اپنا چہرہ باہر نکالا اور اس کی عتابی آنکھیں حویلی کا جائزہ لینے لگیں حویلی میں دو پہر بیدار کندھوں پر بندوق لٹکا کرے چوکس انداز میں حویلی کے صدر دروازے کے پاس پہرہ دے رہے تھے۔ حویلی کے باقی افراد اپنے اپنے کمروں میں موجود تھے اچانک اس آدمی کی نظر اپنے دائیں طرف پڑی تو اسے برآمدے میں گندم ڈالنے والا پڑھولہ نظر آیا اسے چھپنے کی وجہ جگہ کارآمد لگی کیونکہ وہ پڑھولہ سے تھوڑا ہٹ کر رکھا گیا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں وہ آسانی سے چھپ سکتا تھا برآمدے میں لگے پیلے بلب کی روشنی پورے برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی مگر پڑھولے اور دیوار کے بیچ اس خالی جگہ میں مکمل طور پر اندھیرا پھیلا ہوا تھا وہ آدمی دس قدموں اس پڑھولے کی طرف بڑھا اور با آسانی اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے کانوں میں تیز نسوانی چیخ کی آواز پڑی تو اس نے تیزی سے پڑھولے کے پیچھے سے اپنا سر باہر نکالا اس نسوانی چیخ سے حویلی میں ایک ہانسی سی چیخ مچی حویلی کے وہ دونوں پہریدار تیزی سے برآمدے میں اس پڑھولے سے تھوڑی دور بنے کمرے میں داخل ہوئے برآمدے میں بنے باقی کمروں سے ایک بوڑھی عورت ایک بارعب شخصیت کی مالک کا ادھیڑ عمر آدمی جس نے اونچے شلے والی پگڑی پہنی ہوئی تھی جو علیہ سے ملازم ہی لگ رہا تھا نکلے اور اس کمرے میں داخل ہو گئے جہاں سے نسوانی چیخ کی آواز ابھری تھی اس آدمی کے تیز کان جلد ہی یہ جاننے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ کمرے میں موجود لڑکی نے ایک سانپ دیکھا تھا جسے پہریداروں نے ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔

اتنا ضرور سمجھ گئی تھی کہ وہ جن ہاتھوں کی گرفت میں جکڑی ہوئی ہے وہ مردانہ ہیں۔  
”دشمن..... چلانا مت میں کوئی دشمن نہیں ہوں.....“ پیچھے کھڑے آدمی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

”اب تم ہاں کر دو گی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“ پیچھے کھڑے آدمی نے اسے چھوڑنے کی اس سے اجازت چاہی تو سمیرا نے کچھ سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا پیچھے کھڑے اس آدمی نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا سمیرا اپنی لقمی جانب کھولی تو وہ یہ دیکھ کر مزید ڈر گئی کہ اس کے پیچھے کھڑے آدمی نے اپنا چہرہ چھپانے کے لئے ڈھانٹا باندھ رکھا تھا اس آدمی نے سمیرا کی آنکھوں میں احتجاج اور الجھن دیکھی تو تیزی سے اپنا ڈھانٹا اتار دیا۔  
”تنت..... تم.....“ وہ سامنے والے آدمی کا چہرہ دیکھ کر حیرت سے بولی۔

☆.....☆.....☆

گھوڑے پر ایک آدمی نے اپنے چہرے پر ڈھانٹا باندھے بیٹھا ہوا تھا وہ گھوڑے کو بڑی تیزی سے بھاگ رہا تھا اس آدمی کی آنکھوں میں غصہ تھا اور اسی غصے کی وجہ سے اس کی آنکھیں خون کی طرح لال تھیں وہ آدمی جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا جلد ہی وہ ایک شاندار حویلی کے قریب پہنچا حویلی کی دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ ایک کچا راستہ تھا اس آدمی نے اپنے گھوڑے کا رخ اس کچے راستے کی طرف کر دیا اس کا گھوڑا حویلی کی دائیں دیوار کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا اچانک اس آدمی کی نظریں حویلی کی دیوار پر درخت کی کی لگی شاخوں پر پڑیں تو اس آدمی نے گھوڑے کی لگائیں کھینچیں اور گھوڑے سے نیچے اتر آیا اس نے گھوڑے کو باہر موجود درختوں میں سے ایک کے ساتھ باندھا اور پھر حویلی کی دیوار کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا حویلی کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی وہ آسانی سے حویلی کی دیوار پر چڑھ سکتا تھا اس آدمی نے جست لگائی تو اس کے ہاتھ دیوار تک گئے اور وہ دیوار پر لٹک گیا پھر اس



پھر اچانک اس آدمی نے تیزی سے اپنا سر پڑھولے کے پیچھے کر لیا کیونکہ ان دو پہریداروں میں سے ایک پہریدار پڑھولے کی طرف ہی آرہا تھا وہ پہریدار شاید سانپ کو ڈھونڈنے اس طرف آرہا تھا اس ڈھانچا باندھے آدمی کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی اس آدمی نے تیزی سے اپنی شلوار اوپر کی اور پنڈلی میں اسٹاسٹیز دھار چاقو باہر نکال لیا اس سے پہلے کہ وہ پہریدار اس آدمی تک پہنچتا حویلی میں ایک مردانہ آواز گونجی۔

اس آدمی نے اپنا سر پھر پڑھولے کے پیچھے سے باہر نکالا اس کی طرف بڑھتا پہریدار اب اگلے قدموں وہاں سے بھاگا حویلی کی چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے پاس دوسرا پہریدار زمین پر گر اتر پڑا تھا اور پہلے والا پہریدار اسے بشیرے کے نام سے مخاطب کر کے پوچھ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔

لڑکی والے کمرے سے حویلی کے سارے افراد باہر نکلے اس مرتبہ کمرے میں موجود خوب صورت لڑکی بھی ان کے ہمراہ تھی جسے دیکھ کر آدمی کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر مسکرایا تھا حویلی میں موجود پہریدار بشیرے کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ سانپ چھت کی طرف گیا تھا حویلی کے دونوں ملازموں خوشیا اور بھورے کو حویلی کے مالک چوہدری نواز نے اس سانپ کو ڈھونڈنے کے لئے چھت پر بھیجا منہ پڑھا تھا باندھے اس آدمی نے موقع غنیمت جانا اور دو بے قدموں اس لڑکی یعنی بشیرا کے کمرے میں داخل ہو کر پردے کے پیچھے چھپ گیا اور بھورا اور خوشیا چھت سے ناکام واپس لوٹے تھے خوشیا نے چوہدری نواز کو نارنگ جوگی کو بلوانے کا مشورہ دیا تھا جو پاس ہی جوگیوں کی بستی میں رہتا تھا چوہدری نے خوشیا کی بات مان لی اور نارنگ جوگی کو بلانے کے لئے خوشیا کو بھیج دیا اور دوسرے پہریدار بھورے کو بشیرے کی لاش اس کے گھر میں پہنچانے کا کہا اور بشیرا اور اس کی دادی جیلہ بیگم کو بھی ان کے کمروں میں جانے کا کہا اور کمروں کے دروازے اندر سے بند رکھنے کا حکم

صادر کر دیا بشیرا اپنے کمرے میں آئی اور دروازہ بند کرنے کے بعد سیدھی ہوئی تو پردے کی اوٹ میں۔ منہ پڑھا نا باندھے شخص کو دیکھ کر وہ مزید رنجی۔ اور بشیرا چیخنے کا ارادہ کرنے ہی والی تھی کہ اس آدمی نے تیزی سے اپنے چہرے سے ڈھانچا ہٹا دیا۔

”تت.....تت.....تم.....“ بشیرا نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا تو حیرت سے بولی۔

”کک.....کاشف.....تم.....“

ڈھانچے والا وہ لڑکا کاشف ہی تھا جو اسے ریل گاڑی میں ملتا تھا اور رحمت کسان کا بیٹا تھا۔

”تت.....تت.....تم.....“ یہاں کیا کر رہے ہو۔“ بشیرا نے بدستور حیرانگی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بس تم سے ملنے کو دل چاہا سو چلا آیا۔“ کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کک.....کیا مطلب.....“ وہ لرزتے ہونٹوں سے ہٹکائی۔

”مطلب یہی کہ جب سے میں گھر پہنچا ہوں تمہاری یاد مجھے سونے نہیں دے رہی تھی..... چارپائی پر بار بار کروٹ لینا تو تمہارا ہی چہرہ نظر آتا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھوڑے پر بیٹھا اور تم سے ملنے چلا آیا دل کو قہراری نہیں مل رہا تھا اب تمہیں دیکھا تو دل بہت سکون سا ملا۔“ کاشف نے مسکراتے ہوئے اپنے دل کی کیفیت بیان کی۔

”یہ.....یہ.....کک.....کیا کہہ رہے ہو.....“ بشیرا نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

وہ دونوں آپ سے تم پر اتر آئے تھے۔

”وہی جو تم سننا چاہتی ہو۔“ کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا تو بشیرا نے اس کی طرف پلکیں اٹھائیں اور پھر بھٹکائیں۔

”میں نے ریل گاڑی میں ہی جان لیا تھا کہ تم مجھے پسند کرنے لگی ہو اور میں بھی تمہیں پہلی نظر میں دل دے بیٹھا تھا۔“

کاشف آگے بڑھا اور بشیرا کو اپنا ہونٹوں میں بھر لیا۔

”یہ.....یہ.....تم کیا کر رہے ہو.....؟“ بشیرا کا چہرہ شرم سے لال سرخ ہو گیا تھا کاشف نے بشیرا کو کھٹکے سے لگایا اور بشیرا نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی بلکہ اس نے تو اسے زور سے سمجھنے لگا تھا۔

خوشیا نارنگ جوگی کو لے آیا تھا نارنگ نے کالا چوٹا پنکھ رکھا تھا اور سر پر کالے رنگ کی گڈڑی باندھ رکھی تھی اور ماتھے پر کالے رنگ کا بڑا سا بڑا لگا رکھا تھا اس کی دائیں گال پر بڑا سا مسما تھا اس نے ہاتھ میں بین پکڑ رکھی تھی اور کندھے پر کالے رنگ کا بڑا سا کپڑے کا تھیلہ لٹکا رکھا تھا وہ چوہدری نواز کے سامنے پہنچا۔

”سلام مائی باپ.....“ نارنگ جوگی نے چوہدری نواز کو سلام کیا جس کا جواب چوہدری نواز نے ہاتھ اٹھا کر دیا۔

”نارنگ تجھے معلوم تو ہو گیا ہوگا کہ ہم نے تجھے کس لئے یاد کیا ہے۔“ چوہدری نواز نے پہلے خوشیا اور پھر نارنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی مائی باپ..... راستے میں خوشیا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ نارنگ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”بس تو پھر اس خبیث سانپ کو پکڑ اور ختم کر دو۔ اس خبیث نے میرے ایک خاص بندے کو مار دیا ہے۔“ چوہدری نواز نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”دکھی ٹکرائیں نہ کرو مائی باپ..... تھوڑی دیر میں ہی وہ سانپ آپ کے قدموں میں مردہ حالت میں پڑا ہوگا۔“ نارنگ نے کہا اور اپنے کندھے پر لٹکے تھیلے میں سے ایک پٹاری باہر نکال لی چوہدری نواز نے ایک کرسی باہر صحن میں منگوا لی تھی اور اب اس پر بیٹھ کر اپنی مونچھوں کو نوا دے رہا تھا نارنگ نے اس پٹاری کا ڈھکن اٹھایا تو پٹاری میں سے ایک کالے رنگ کا سانپ پھٹکارتے ہوئے باہر نکلا۔

”پل شیر..... ڈھونڈ اس خبیث سانپ کو جس نے چوہدری صاحب کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔“ نارنگ نے اس سانپ کو چوہدری صاحب میں اٹھانے سے

بچنے فریض پر چھوڑ دیا۔

”یہ کیا کر رہا ہے تو نارنگ اگر اس سانپ نے گھر کے کسی فرد کو ڈس لیا تو۔“ چوہدری نواز نے غصے سے نارنگ کی طرف دیکھا۔

”تسی ٹکرائیں نہ کرو مائی باپ یہ میرا پالا ہوا سانپ ہے شیر..... میں نے اسے جو حکم دیا ہے یہ وہی پورا کرے گا اس کا مقصد صرف اس سانپ کو ڈھونڈنا ہے اور اسے ختم کرنا ہے۔“ نارنگ نے کہا تو چوہدری نواز مطمئن ہو گیا نارنگ وہیں زمین پر بیٹھ گیا وہ سانپ اب صحن کے فرش پر رنگ رہا تھا بشیرا اور کاشف کھڑکی سے ہٹ آئے بشیرا نے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے تھے دونوں اب پنکھ پر بیٹھ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا کاشف۔“ بشیرا فکر مند اندھ لہجے میں بولی۔

”کیوں.....؟“ کاشف نے بظاہر پوچھا۔

”حویلی کا ماحول بڑا خراب ہے..... ایک سانپ نے عجیب کھینچا کھڑا کر دیا ہے ایک موت ہو گئی ہے اور سانپ ہے کہ ابھی تک ملا نہیں۔“ بشیرا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

”تم زیادہ پریشان مت ہو میرا..... میں نے بچپن سے ہی اس نارنگ جوگی کی بڑی چڑچڑائی ہے اس کا وہ پالتو سانپ ضرور اس خونی سانپ کو ڈھونڈھ لے گا۔“ کاشف نے بشیرا کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”اگر ایسا جی نہیں حویلی میں دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا اور اگر انہوں نے تمہیں میرے کمرے میں دیکھ لیا تو قیامت سے پہلے قیامت آجائے گی ان کا غصہ بڑا تیز ہے کاشف۔“ بشیرا نے خوف زدہ لہجے میں کاشف کو آگاہ کیا۔

”تم خواہ خواہ ڈر رہی ہو میرا.....“ کاشف نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما۔

”تمہارا باپ مجھے نہیں دیکھے گا باہر حویلی کا ماحول جیسے ہی شانت ہوتا ہے میں چلا جاؤں گا..... اور اب تم

یہ ڈرنا ورنہ بند کروں جان جو کھوں میں ڈال کر تم سے ملنے آیا ہوں اور تم ہو کہ بار بار مجھے ڈر داری ہو اب اگر تم نے ایسی دیسی بات کی تو میں چوہدری صاحب کے سامنے جا کر اپنی محبت کا اعلان کر دوں گا۔“

کاشف کی اس بات پر سمیرا بے اختیار مسکرا دی اور چوہدری نواز کے پاس زمین پر بیٹھا نارنگ اپنی جگہ سے اچھلا اور پھر تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوا چوہدری نواز نے اس کے یوں کھڑے ہونے پر چوٹا۔

”کیا ہوا نارنگ.....؟“ چوہدری نواز نے حیرانگی سے پوچھا۔

”م..... مانی باپ..... گلگ..... گڑبڑ ہو گئی ہے.....“ اتنا کہہ کر نارنگ تیزی سے حویلی کی چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

”جاؤ خوشیا جا کر دیکھو کیا مسئلہ ہے۔“ چوہدری نواز نے اپنی کرسی کے پیچھے کھڑے خوشیا کو حکم دیا تو خوشیا بھی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

”آ..... مارو دیا رے..... اس خبیث سانپ نے میرے شیر کو مار دیا.....“ نارنگ کی روتی ہوئی آواز چوہدری نواز کے کانوں میں پڑی کرے میں بیٹھے کاشف اور سمیرا بھی نارنگ کے رونے سے چوٹے۔

”یہ..... یہ کیا ہوا.....“ سمیرا خوف زدہ لہجے میں ہلکائی۔

”تم ڈر مت سمیرا میں یہیں رکتا ہوں تم باہر جا کر دیکھو نارنگ کیوں رو رہا ہے۔“ کاشف نے سمیرا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”شش..... ٹھیک ہے..... تہ..... تم پبلنگ کے نیچے چھپ جاؤ میں باہر جا کر دیکھتی ہوں۔“ سمیرا کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکائی تو کاشف نے اثبات میں سر ہلا دیا اور سمیرا کرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔

نارنگ اور خوشیا سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے نارنگ دھاڑے مار مار کر رو رہا تھا اس کے ہاتھوں میں اس کا پالتو سانپ شیر و خون سے رنگا جھول رہا تھا جیلہ

بیگم بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں۔

”یہ کیا بچوں کی طرح رونا لگا رکھا ہے تو نے نارنگ.....“ ایک سانپ ہی تو مرا ہے تو تو ایسے رو رہا ہے جیسے تیرے گھر کا کوئی جی مر گیا ہو.....“ چوہدری نواز نے غصے سے نارنگ جو کڑاٹا جیلہ بیگم نے ناگواری سے چوہدری نواز کی طرف دیکھا۔

”مانی باپ یہ سانپ میرا پتر تھا، میں نے اسے بڑے نازوں سے پالا ہے ایک بیٹے کی طرح رکھا ہوا تھا اسے میں نے لیکن..... لیکن اس خونخوار سانپ نے اسے مار دیا۔“ نارنگ نے روتے ہوئے بتایا۔

”اچھا تو یہ رونا دھونا بند کر اور یہ بتا کہ تو اس سانپ کو صوبہ کر سکتا ہے کہ نہیں.....“ چوہدری نواز نے نارنگ جوگی کے دکھ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”مانی باپ میرے علاوہ اس سانپ کو کوئی نہیں پکڑ سکتا..... آپ نے دیکھ ہی لیا اس نے آپ کے ایک بندے اور میرے شیر کا کیا حال کر دیا ہے میرے شیر کا مقابلہ کوئی عام سانپ نہیں کر سکتا وہ سانپوں کی نسل میں سے خاص سانپ ہے.....“ نارنگ نے کہا۔

”خاص سانپ.....“ چوہدری نواز نے حیرانگی سے سوالیہ لہجہ سے نارنگ کی طرف دیکھا۔

”جی مانی باپ خاص سانپ ہی لئے تو وہ کسی کے قبضے میں نہیں آ رہا..... لیکن.....“ نارنگ کہتے کہتے رکا۔

”لیکن کیا.....؟“ چوہدری نواز نے اضطرابی لہجے میں نارنگ سے پوچھا۔

”لیکن اگر اس سانپ کو پکڑا نہ گیا تو وہ گھر کے افراد کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔“ نارنگ خطرناک لہجے میں بولا۔

”تو پھر میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو پکڑ دھڑا۔“ چوہدری نواز غصے سے بولا۔ اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ پریشانی نے سیر کیا تھا۔

”پکڑتا ہوں مانی باپ..... میں اس سانپ کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ اس کی آنے والی نسلیں یاد کریں

گی۔“ نارنگ نے غصے سے جڑے پہنچتے ہوئے اس نے شیر کے سر وہ سانپ کو پٹاری میں ڈالا اور تیلے میں پٹاری رکھنے کے بعد بین تیلے سے نکال لی اور زمین پر اتنی پانی مار کر بیٹھ گیا۔

”اب دیکھئے گا مانی باپ وہ خونخوار سانپ جہاں بھی ہوگا کیسے تل سے نکل کر رہے گا وہ میرے قدموں میں آئے گا۔“ نارنگ نے چوہدری نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو چوہدری نواز نے اپنے پیچھے کھڑے خوشیا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”خوشیا وہ سانپ تمہیں جیسے ہی نظر آئے بندوق کی گولی سے اس کا سر اڑا دیتا۔“

”نہ مانی باپ نہ.....“ ایسا ہرگز مت کیجیے گا وہ سانپ گولی سے مرے والا نہیں ہے..... اسے صرف میری یہ بین ہی قابو کر سکتی ہے میں آپ کی آنکھوں کے سامنے اسے سزا دوں گا۔“ نارنگ نے چوہدری نواز کو متح کر تے ہوئے کہا تو چوہدری نواز نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

نارنگ جوگی نے اب بین بجانا شروع کر دی وہاں کھڑی جیلہ بیگم اور سمیرا کی حالت کا ہی ہو رہی تھی نارنگ بین بجاتے ہوئے اپنی آنکھیں ارد گرد گھما رہا تھا بین کی آواز سے حویلی کا ماحول خاصا پر اسرار سا ہو گیا تھا۔

اچانک صحن میں گلے درخت کے پتوں میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی نارنگ کے علاوہ وہاں کھڑے سب افراد پتوں کی سرسراہٹ سے چونکے نارنگ کی آنکھیں اب اس درخت پر پگی ہوئی تھیں پھر درخت کی شاخ پر اچانک ایک کالے رنگ کا سانپ نظر آیا جسے دیکھ کر سمیرا اور جیلہ بیگم کی سٹی کم ہو گئی وہ تیزی سے چوہدری نواز کے قریب ہو گئیں اس سانپ کو دیکھ کر نارنگ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی تھی اب وہ سانپ درخت کی شاخ سے لٹک رہا تھا پھر وہ سانپ زمین پر گرا اور بیٹھتا ہوا بین بجاتے ہوئے نارنگ کی طرف بڑھا۔

چوہدری نواز، خوشیا، جیلہ بیگم اور سمیرا کے جسم میں سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی تھی سانپ رہنٹا ہوا نارنگ کے پاس پہنچا اور کنڈلی مار کر صحن پہنچا کر بیٹھ گیا اب نارنگ کی سانس جیسے ہی ٹوٹی اس نے لپک کر سانپ کو گردن سے پکڑنا تھا مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

”چمن..... چمن.....“ اچانک نارنگ کے کانوں میں پائل کی تیز آواز پڑی تو نارنگ نے سانپ سے نظریں ہٹائیں اور سامنے دیکھا تو وہ حیران رہ گیا سامنے ہو ہو سمیرا جیسی لڑکی کھڑی تھی نارنگ نے حیرانگی سے چوہدری نواز کے قریب کھڑی سمیرا کی طرف نظریں گھمائیں اور پھر اپنے سامنے کھڑی سمیرا جیسی ہو ہو لڑکی کی طرف دیکھا دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا فرق تھا تو صرف اتنا سا کہ سامنے کھڑی لڑکی کے ارد گرد سفید دو دو دھیرا روشنی پھیلی ہوئی تھی اسی حیرت نے نارنگ کی سانسوں کو اکھڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ غلطی اس کی زندگی کی آخری غلطی بن گئی۔

سانس اکھڑنے پر بین کی آواز جیسے ہی بند ہوئی کنڈلی مارے سانپ نے برق رفتاری سے نارنگ کو ہاتھ پڑس لیا اور اپنا ہر نارنگ کی ہاتھ کی رگوں میں منتقل کر دیا نارنگ کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی جس نے حویلی کے دروازے کو ہلا کر رکھ دیا۔ چوہدری نواز اور خوشیا نارنگ کی طرف بڑھے جو زمین پر لیٹا ہری طرح تڑپ رہا تھا اس کی آنکھیں اب اس لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں جواب کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی سانپ بھی نبھانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

”م..... مانی باپ..... سس..... سانپ..... لیل..... لڑکی.....“ کھڑتی ہوئی سانسوں سے نارنگ کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکل لڑکی کے ذکر پر چوہدری نواز چوٹا۔

”کون لڑکی نارنگ.....“ چوہدری نواز نے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے نارنگ سے پوچھا مگر دیر ہو چکی تھی وہ سانپ بہت زہریلا تھا وہ سانپ شاید بہت زہریلا تھا جو کسی کو بھی زندگی کی مہلت نہیں دیتا نارنگ کے منہ سے

جھاگ بنے گی تھی اور پھر وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

”اس سانپ کی تو میں.....“ چوہدری نواز نے اٹھتے ہوئے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں مگر وہ سانپ پھر نہ ملے کہاں غائب ہو گیا تھا سمیرا نے حیرانگی سے نظریں اٹھا کر اس ساری حویلی کو دیکھا جو ہر لمحے نئے سے نیا نظر پیش کر رہی تھی سمیرا جب سے حویلی میں آئی تھی ایسے ہی پراسرار واقعات اسے دیکھتے کوئل رہے تھے تاریک کے منہ سے لڑکی کا ذکر سن کر وہ بھی چونکی تھی اور برآمدے میں نظر آنے والی اس کی ہم شکل عورت یاد آگئی تھی..... دومتیں اور وہ سانپ شیر و جو یقیناً دوسرے سانپ سے اپنی زندگی کی بازی ہارنا تھا اب تو چوہدری نواز کے چہرے پر بھی خوف نظر آنے لگا تھا خوشیاں بھی کچھ خوف زدہ نہیں تھیں۔

”خ..... خ..... شہنا.....“ چوہدری نواز کو اپنی آواز دور کوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”جج..... جی چوہدری جی.....“ اس نے بھی کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

”نن..... تاریک کی لاش کو اس کی ہستی میں پہنچا آؤ.....“ چوہدری نواز نے حویلی کے صحن میں بڑی تاریک کی لاش پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”جی اچھا چوہدری جی.....“ بھورا آنے والا ہے میں اسے بھیجتا ہوں میرا یہاں سے جانا ٹھیک نہیں.....“ خوشیا نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا جوا بچوہدری منہ سے کچھ نہ بولا اور بو جھل بو جھل قدموں سے حویلی کی بیٹھک کی طرف بڑھا۔

”سمیرا پتر آپ اور اماں جی بھی اپنے اپنے کمروں میں جاؤ..... میں اس سانپ کا بندوبست کراتا ہوں.....“ خوشیا نے سمیرا اور جیلہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ دونوں بھی چپ چاپ اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھیں سمیرا نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی حویلی میں ہونے والے پراسرار واقعات نے اسے چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اچانک وہ چونکی اور خلیا لول کے ٹھنڈے سے باہر نکل

اور کمرے میں ارد گرد نگاہیں دوڑائیں اور پھر تیزی سے جھک کر پلنگ کے نیچے دیکھا پلنگ کے نیچے کا حصہ بھی بالکل خالی تھا۔

”ہیں..... یہ کاشف کہاں چلا گیا.....“ وہ پریشانی سے بڑبڑاتی باہر نکلے سے پہلے کاشف کو پلنگ کے نیچے چھپنے کا مشورہ دے کر گئی تھی اور اتنا تو وہ سمجھتی تھی کہ وہ خواب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جب سے حویلی میں آئی تھی ایک مرتبہ بھی سو نہیں سکی تھی۔

”یا اللہ یہ کیا چکر ہے.....“ اس نے ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو مسلا، دن بھر کی تھکاوٹ اور حویلی میں ہونے والے پراسرار واقعات نے اس کے ذہن کو مزید جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور آرام اس کا منتظر تھا حالانکہ ایسے وقت میں انسان کو نیند نہیں آتی لیکن اب اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور پلنگیں بھاری ہو رہی تھیں وہ پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھی اور اپنی ٹانگیں سیدھی کر لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔

”چمن..... چمن.....“ ابھی وہ نیند کی وادی میں مکمل طور پر نہیں ڈوبی تھی کہ پانکوں کی تیز آواز نے اس کی ہنگی نیند میں خلل ڈالا اس نے نیند میں ڈوبی بھاری بھاری پلنگوں کو کھولا اور گردن سیدھی کر کے سامنے دیکھا تو نیند فوراً اس کی آنکھوں سے رونچہ ہو گئی اور اس نے اپنی آنکھوں کو جھپکنے سے کھولا اس کے کمرے کے دروازے کے پاس اس کی ہمشکل عورت اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھی وہ چونکی اس نے اپنی آنکھوں کو کھولا۔

وہ عورت اب بھی اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

اچانک سمیرا کے جسم کو ایک جھٹکا لگا وہ بے اختیار پلنگ سے نیچے اترتی اور اس لڑکی کی طرف بڑی سمیرا کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو سمیرا کی ہمشکل عورت نے سمیرا کے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر برآمدے میں نکل آئی سمیرا بھی اس کی رہنمائی میں برآمدے میں پہنچی تو برآمدے میں وہ عورت کہیں بھی نہیں

تھی سمیرا کے جسم کو دوبارہ جھٹکا لگا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ابھی ابھی نیند سے جاگی ہو مگر سامنے صحن میں موجود منتظر نے اس کے روٹکنے کھڑے کر دیئے۔

صحن میں کاشف اپنے دونوں ہاتھ اوپر کئے کھڑا تھا اور خوشیا نے اس پر بندوق تانی ہوئی تھی چوہدری نواز خوشیا کے پاس ہی خستہ حالت میں کھڑا تھا اس کے سر پر اس کی پگڑی مو جو بندوق تھی سر کے بال بری طرح اچھے ہوئے تھے پچھلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا اور کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے۔

”ختم کر دے خوشیا اس نالی کے کپڑے کو.....“ چوہدری نواز نے انکارہ اٹھتی ہوئی آنکھوں سے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے خوشیا کو حکم دیا۔

”نہیں.....“ چوہدری نواز کا فرمان سن کر سمیرا زور سے چلائی چوہدری نواز، خوشیا اور کاشف نے حیرانگی سے سمیرا کی طرف دیکھا سمیرا جھاگ کر کاشف کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”نن..... نن..... نہیں اباجی..... اسے مت مارئے..... مم..... میں اس سے پیار کرتی ہوں.....“ سمیرا نے بظاہر چوہدری نواز پر ہم پیکہ چوہدری نواز عصبیلی نظروں سے سمیرا کی طرف دیکھنے لگا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری نواز بو جھل بو جھل قدموں کے ساتھ حویلی کی بیٹھک کی طرف بڑھا موجودہ واقعات اور صورت حال نے اس کے جسم کی توانائی جیسے نچوڑ لی تھی وہ اپنی پوری زندگی میں آج پہلی مرتبہ اتنا پریشان دکھائی دے رہا تھا اس سانپ نے حویلی کے ہر فرد کو پریشان کر دیا تھا خوشیا حویلی سے باہر بھڑے کو دیکھنے گیا تھا تا کہ تاریک جوگی کی لاش اس کی ہستی میں پہنچا آئے بھورا بشیرے کی لاش اس کے کمر چھوڑے گیا تھا چوہدری نواز کرسی پر ڈھیر سوچوں میں گمن تھا کہ قدموں کی چاپ سے وہ چونکا اس نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا تو بیٹھک کے دروازے کے پاس کھڑا ایک خوب صورت نوجوان وحشت بھری نظروں سے گھور رہا تھا۔

”کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو.....“ چوہدری نواز غصے سے اس نوجوان پر برسر۔

”میں تیری موت ہوں..... ظالم کینے انسان اور میں تمہیں یہاں ختم کرنے آیا ہوں.....“ وہ لڑکا غصے سے گر جا ساتھ ہی وہ چوہدری نواز کی طرف بڑھا چوہدری نواز کرسی سے اٹھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا مگر وہ لڑکا چوہدری کے قریب پہنچا اور زوردار لڑا چوہدری نواز کے سینے پر دے ماری تو چوہدری نواز بلبلاتا ہوا کرسی سمیت زمین پر جا گرا وہ لڑکا آگے بڑھا اور زمین پر پڑے چوہدری نواز پر لڑکوں اور گھونٹوں کی بارش کردی چوہدری نواز کی اوچے شیلے والی پگڑی بھی اس کے سر کا ساتھ چھوڑ گئی تھی اس نوجوان نے چوہدری نواز کو گر بیان سے پکڑا اور اوپر اٹھالیا اس اوپر اٹھانے میں چوہدری نواز کی بیٹھ کے سارے بٹن ٹوٹ گئے اور بیٹھ بھی پھٹ گئی چوہدری نواز کی حالت کافی خستہ حال تھی اس کا پچھلا ہونٹ پھٹ چکا تھا اور سر کے بال بھی بری طرح الجھ چکے تھے۔

”ڈنڈیل انسان..... بہت جی لیا تو نے اور بہت ظلم کر لیا تو نے غریب عوام پر..... پر اب تیرا آخری وقت آ گیا ہے.....“ اس لڑکے نے چوہدری نواز کو گر بیان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

”گگ..... گگ..... کون ہو تم اور میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے.....“ چوہدری نواز نے ہکلاتے ہوئے پوچھا تو اس لڑکے نے اس کی ساری چوہدری نکال دی تھی چوہدری نواز نے شاید اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنی مار نہیں کھائی تھی۔

”میں رحمت کسان کا بیٹا کاشف ہوں.....“ اس لڑکے یعنی کاشف نے بتایا تو چوہدری نواز نے حیرت سے کاشف کی طرف دیکھا۔

”آج میں تجھ سے اپنے باپ چاچا اور اپنی پھوپھی کا بدلہ لینے آیا ہوں.....“

اسی وقت خوشیا ہاتھ میں بندوق لئے اندر داخل ہوا۔

”اے لڑکے چھوڑ دے چوہدری صاحب کو نہیں



تو تیرے سر میں گولی مار دوں گا۔“ خوشیا نے کاشف کو دم کاٹتے ہوئے کہا تو کاشف نے چوہدری نواز کا گریبان چھوڑ دیا۔

”شباباش خوشیا تو بالکل صحیح وقت پر پہنچا ہے۔“ چوہدری نواز کی جان میں جان آئی تو اس نے خوشیا کو داد دیتے ہوئے کہا ساتھ ہی اس نے ایک زنائے دار پشتر کا شف کی گال پر دوسے مارا۔

”حرام زادے وہ اسی لائق تھے۔ اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا ان کا یہی حشر ہونا تھا۔“ چوہدری نواز یک دم گیدڑ سے شیر بن گیا تھا۔

”چل خوشیا اسے بھی باہر محن میں لے کر چلتے ہیں اور انہیں انہوں کے پاس بھیجتے ہیں۔“ چوہدری نواز نے کہا تو خوشیا نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ تینوں بیٹھک سے باہر آ گئے۔

☆.....☆.....☆

”اب تیری زبان کیوں تالو سے چپک گئی ہے چوہدری نواز..... کیوں حکم نہیں دیتا خوشیا کو کہ تیری اکلونی بیٹی کو مار دے۔“ جیلہ بیگم اچانک بھرائی ہوئی آواز میں پھٹ پڑیں۔

”اب تیری غیرت کو کیا ہوا چوہدری نواز..... کیوں حکم نہیں دیتا خوشیا کو کہ وہ تیری سیرا کا سینہ گولیوں سے چھلکی کر دے۔“

چوہدری نواز کا سر شرم سے جھک گیا بوڑھی جیلہ بیگم کے جس میں جیسے بجلی بھڑک اٹھی تھی۔

”سرمت جھکا چوہدری۔ خوشیا کو حکم دے کہ وہ سیرا کو بھی میری نورین کی طرح ختم کر دے۔“ جیلہ بیگم ہائی دیتے ہوئے بولیں۔

”آج تیرا اپنا خون ہے تو تیری زبان تیرا ساتھ کیوں نہیں دے رہی اس وقت تو تو نے میری نورین اور اس کے عاشق کو بھی یہیں مارا تھا میں تیرے سامنے کتنا گڑگڑائی تھی لیکن تو نے میری ایک نہ سنی اور وہ توں کو مار کر اس گھوڑوں والے کمرے میں دفن کر دیا۔“ جیلہ بیگم دوتے ہوئے بولیں۔

”چپ کر ماں اور اندر جا.....“ چوہدری نواز غصے سے جیلہ بیگم پر برستے ہوئے بولا۔

”میں چپ نہیں رہوں گی چوہدری..... آج میرے اللہ نے میرا دکھنا ہوا کچھ ٹھنڈا کر دیا آج اس نے وہی وقت تیرے سامنے لا کر کیا ہے یاد ہے تو نے نورین اور اس کے عاشق کو مارتے وقت کہا تھا کہ جب بیٹیاں عزت سے کھیلنے لگیں تو انہیں ختم کر دینا ہے۔“

آج تیرے سامنے وہی وقت کھڑا ہے تیری دمی نے بھی تیری عزت سے کھیلنا ہے، اس نے ایک غریب اور نچلے طبقے کے لڑکے سے محبت کی ہے..... اب انصاف کر چوہدری، نہیں تو میری نورین کا خون آخرت میں تجھ سے حساب مانگے گا۔“ جیلہ بیگم دوتے ہوئے بولیں برسوں سے بندھا بند آج ٹوٹ گیا تھا اس کے اتنے سالوں کے چپ ہونٹ پارا پار ہو رہے تھے سیرا کے پیچھے کھڑے کاشف نے موقع غنیمت جانا اور تیزی سے اپنی پنڈلی میں ازسا چاقو نکالا اور چوہدری نواز کی طرف پھینکا تو چاقو سیدھا چوہدری نواز کے سینہ دل کے مقام پر لگا، چوہدری نواز کے منہ سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی جس نے حویلی کے درو دیوار کو ایک مرتبہ پھر ہلا کر رکھ دیا سیرا کو کاشف سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی اور نہ ہی جیلہ بیگم کو۔

چوہدری نواز اب محن کے فرش پر پڑا بری طرح تڑپ رہا تھا سیرا گھوی اور اس نے اندھا دھند کاشف کے چہرے پر تحسینوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”یہ تم..... نے کیا کیا..... میرے باپ کو مار ڈالا۔“ وہ شدت جذبات سے چلاتے ہوئے بولی۔

”صح کیا ہے میں نے.....؟“ جواباً کاشف سیرا کے چلتے ہاتھ پکڑ کر چلایا، خوشیا زمین پر تر پڑے چوہدری نواز کی طرف بڑھا۔

تمہاری پھوپھی یعنی نورین کو جس لڑکے سے محبت ہوئی تھی وہ کوئی اور نہیں بلکہ میرا چاچا جمیل تھا۔“ کاشف نے حیران کن انکشاف کیا۔

”تمہارے باپ نے میرے چاچے کو قتل کیا مگر

کہانی وہی ختم نہیں کی تمہارے اس ظالم اور گھنڈی باپ نے اس خوشیا کے ساتھ مل کر میرے باپ کو بھی مار ڈالا اور یہی نہیں میری پھوپھی کی عزت پامال کرنے کے بعد اس کی لاش کھیتوں میں پھینکوا دی میں جب آج اپنے گھر پہنچا تو میں نے اپنی ماں سے تمہارا تذکرہ کیا میری ماں تمہارے باپ کے نام پر بھڑک اٹھی۔“ اپنے باپ، چاچے اور پھوپھی کے قاتل سے محبت کرتا ہے تو..... ماں بھرائی ہوئی آواز میں چیخی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے ماں.....“ میں نے حیرانگی سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

”سچ کہہ رہی ہوں میں.....“ میری ماں لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”تو نے آتے ہی میرے زخم ہرے کر دیئے.....

وہ ظالم چوہدری تیرے باپ تیرے چاچے اور پھوپھی کا قاتل ہے۔“ میری ماں سینہ کو پی کرتے ہوئے بولی ساتھ ہی میری ماں نے مجھے ساری بات بتائی۔

تمہاری پھوپھی نورین ایک دن کھیتوں میں آئی تو اس نے میرے چاچے جمیل کو وہاں کام کرتے دیکھا وہ کچلی نظر میں ہی میرے چاچے کو اپنا دل دے بیٹھی اور ایک دن موقع دیکھ کر اس نے اپنی محبت کا اظہار میرے چاچے سے کیا تو میرے چاچے نے تمہاری پھوپھی کو ان دونوں کے سچ ذات بات کی حامل دیوار سے آگاہ کیا مگر عشق اندھا ہوتا ہے وہ پہلے پہل بعد میں آنے والی اذیتوں کو محسوس نہیں کرتا تمہاری پھوپھی بھی نہ مانی اور میرے چاچے کو تمہاری پھوپھی کی محبت کے آگے ہار مانتا پڑی۔

جب تمہارے اس ظالم باپ کو خوشیا کے ذریعے ان دونوں کی خفیہ محبت کے بارے میں پتہ چلا تو اپنے بندوں سے میرے چاچے کو خوب پٹایا اور میرے باپ کو بھی آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ”اگر میرا چاچا باز نہ آیا تو وہ اسے مرادے گا۔“

میرے باپ نے میرے چاچے کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی مگر اب دیر ہو چکی تھی وہ اور تمہاری پھوپھی

اب محبت کے دریا میں کافی آگے بہہ چکے تھے میرے چاچے نے میرے باپ کے سامنے تو ہاں کر دی مگر وہ اسی شام تمہاری پھوپھی سے ملا اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو دونوں نے بھاگنے کا منصوبہ بنایا اور بھاگ بھی گئے مگر زیادہ دور نہیں پہنچے پائے اور خوشیا نے انہیں پکڑ لیا وہ انہیں حویلی میں لے آیا انا اور طیش میں آ کر تمہارے باپ نے دونوں کو مار دیا اور بقول تمہاری دادی کے گھوڑوں کے اطمینان میں دفن دیا۔

میرے باپ نے میرے چاچے کی گمشدگی کی رپورٹ تھا نے میں درج کرانی تو تھا نیدار بھی تمہارے باپ کے ٹکڑوں پر پلٹنے والا نکلا اس نے تمہارے باپ کو بتایا تو اس نے میرے باپ کو بھی مروادیا اور رات کے وقت میری جوان پھوپھی کو گھر سے اٹھوایا اور اس کی عزت پامال کرنے کے بعد اسے مار ڈالا اور اس کی لاش کھیتوں میں پھینکوا دی۔

میرے ماما نے مجھے اور میری ماں کو شہر جانے کا مشورہ دیا ماں نے مجھے تو ماما کی کے ساتھ بھیج دیا مگر خود نہ آئی اور جب آج اس نے مجھے اس راز سے آگاہ کیا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور ماں کے سونے کے بعد اس ظالم کو میں اس کے انجام تک پہنچانے کے لئے یہاں چلا آیا اور آج میرا انتقام پورا ہو گیا۔“ یہاں تک کہہ کر کاشف خاموش ہو گیا اور پھر تھوڑے وقف کے بعد بولا۔

”اگر اب بھی تم جھپکتی ہو کہ میں نے غلط کیا ہے تو جو چاہے مجھے مرادو۔“

چوہدری نواز کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور برسوں کے وقار و خوشیا کی آنکھوں میں نفرت کے سائے گردش کرنے لگے تھے اس نے اٹھ کر بندوق کا رخ کاشف کی طرف کیا۔

”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ خوشیا نے نفرت سے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

اسی وقت حویلی میں ایک فائر کی آواز گونجی سیرا اور جیلہ بیگم کے منہ سے چیخیں نکلیں تیسری چیخ کاشف کی

## آسیبی انتقام



درخت کے پلنے کے بعد وہ پومل قدموں سے اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور والدین کے

کمرے میں بیٹھ کر بہت رویا۔ ”میں نے آج آپ لوگوں کا بدلہ لے لیا“

آہستہ سے جھانک کر دیکھا دونوں اپنی اپنی چار پائیوں پہ سو رہے تھے اور پھر وہ مطمئن ہو کر گھر سے سرس دیکھنے کے لئے نکل آیا اور اب گھر اور والدین کا خیال آتے ہی وہ تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چلنے لگا تا کہ جلدی سے گھر پہنچ سکے۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ایک بہت پرانا اور بڑا قبرستان تھا اور گاؤں جانے کا راستہ اس کے درمیان سے ہی گزرتا تھا وہ اپنے خیالوں میں گھویا اس راستہ پہ تھوڑا سا ہی چلا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی چل رہا ہو، یہ احساس ہوتے ہی اس کو بے چینی سی ہونے لگی۔ اس نے وہیں رک کر پیچھے دیکھا پھر

**نومبر کی رات** تھی فضل سرس دیکھ کر باہر نکلا تو اسے ہلکی سی ٹھنڈا کا احساس ہوا اس نے ایک جھرجھری لی اسی وقت اسے اپنے گھر اور والدین کا خیال آیا جن سے اجازت لئے بغیر ہی وہ سرس دیکھنے آ گیا تھا کیوں کہ اسے پتا تھا کہ اگر وہ والدین سے اجازت لیتا یا انہیں بتاتا تو اسے اجازت نہ ملتی اور دوسرا اس پر نظر بھی رکھی جاتی۔ اس کا کمرہ والدین کے کمرے سے الگ تھا، وہ اپنے کمرے میں چار پائی پہ لیٹا کافی دیر تک ان کے سونے کا انتظار کرتا رہا جب اس کے ابا کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی تب وہ جلدی لیکن احتیاط سے اٹھا اور ان کے کمرے میں

بیوی پر بڑی تودہ تیزی سے اپنے بل میں گھس گئی چوہدری نواز نے خوشیا کو میری بیوی کی بل میں آگ بھجھانے کا حکم دیا خوشی نے درخت سے ایک شاخ توڑ کر اسے آگ لگا کر اور اس جلتی ہوئی شاخ کو بل میں ڈال دیا تودہ آگ میری بیوی کو گل لگی اور میں خاموشی سے ایک طرف کھڑی مارے یہ چاشو بکیر ہاتھ اور میں کرکھی کیا کھینچا تھا۔

آج کی رات مجھے انسانی روپ ملنے والا تھا اس لئے میری طاقتوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا، غائب ہونا بھی میری طاقتوں میں شامل تھا۔ سانپ چاہے سو سال کا بھی ہو جائے اپنا انتقام ضرور لیتا ہے سو آج میں نے اپنا انتقام لے لیا۔“

یہاں تک کہ کردہ انسانی سانپ جس کا نام دیپ تھا خاموش ہو گیا پھر اس کے ارد گرد دھواں چھانے لگا اور جب دھواں چھتا تو وہاں سانپ کھڑی مارے بیٹھا تھا پھر وہ رینگتا ہوا حویلی میں گئے بڑے سے درخت کی طرف بڑھ گیا۔

”دیکھا میرا پتر..... تیرے باپ کی کالی کرتوتیں اس کے قلم سے انسان تو تنگ تھے ہی مگر اس نے دوسری مخلوق کو بھی پیچھے نہیں چھوڑا اسے اگر کاشف نہ مارتا تو کوئی اور مارتا کیونکہ اس کی ساری زندگی ظلم میں گزری ہے..... جنہیں بھی نواز نے اپنے سے دور اسی لئے رکھا تھا کہ تم بھی اس کی بہن کی طرح اس کی عزت سے نہ کھیل سکو..... لیکن پیار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں پتر۔ تم جب حویلی میں اتنے سالوں کے بعد واپس آئی تو تمہاری شکل ہو ہو میری نورین سے ملتی تھی نورین کی یاد میں، میں تمہارے گلے لگ کر خوب روئی۔“ جیلہ بیگم نے بظاہر میرا دکھ بھاتے ہوئے کہا۔

میرا کہ سامنے اب اس کی ہمشکل عورت کا معرہ بھی حل ہو گیا تھا وہ اس کی چھوٹی نورین تھی جو بار بار اس کے سامنے آ رہی تھی اور اب بھی وہ سفید روشنی میں گھری اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور میرا بھی بے اختیار مسکرا پڑی۔

☆☆

بجائے خوشیا کی تھی اور حویلی میں گونجنے والا فائر ہوائی فائر کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ جیسے ہی خوشیا نے اس ہندوق ٹریگر دبا تھا چانک اس کے پیر میں درد کی تیز لہر اٹھی اور ہندوق کا رخ آسمان کی طرف ہو گیا اور کاشف کے نکلنے والی گولی آسمان کا رخ کر گئی خوشیا نے دیکھا اس پر اسرار سانپ نے اسے ڈس لیا تھا سانپ کو دیکھ کر جیلہ بیگم اور میرا کہ منہ سے ایک مرتبہ پھر جھنجھیں نکلیں اب حویلی کے گمن کے فرش پر تر پڑنے کی باری خوشیا کی تھی جلد ہی وہ ٹھنڈا ہو گیا اور اس کے منہ سے جھماک بیٹنے لگی حویلی کے گمن میں اب تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں چوہدری نواز، خوشیا اور نارنگ کی اس سانپ کے ارد گرد اب دھواں جمع ہونا شروع ہو گیا تھا پھر اس دھواں نے انسانی خدو خال اختیار کرنے شروع کر دیے تھوڑی دیر بعد وہاں ایک خوب صورت نوجوان کھڑا تھا۔

”آج میرا انتقام بھی پورا ہو گیا۔“ اس خوب صورت نوجوان کے ہونٹ ہلے کاشف بکیر اور جیلہ بیگم حیرت اور انجھن کے ملے جلے اثرات سے اس خوب صورت نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”میرا نام دیپ ہے اور میں سانپوں کی خاص نسل سے ہوں ہماری نسل کے سانپ سو سال بعد انسانی روپ دھار لیتے ہیں میرے سو سال پورے ہو چکے تھے لیکن میں انسانی روپ نہیں دھار سکتا تھا کیونکہ میں انتقام کی آگ میں جھلس رہا تھا میرے انسانی روپ میں آنے میں انتقام ہی رکاوٹ بن رہا تھا وہ آج پورا ہو گیا اور میں انسانی روپ میں آ گیا۔“

چوہدری نواز اور خوشیا نے میری زندگی میں کبھی نہ پرہونے والا غلا پیدا کر دیا تھا میں اور میری بیوی چوہدری نواز کے ڈیرے کے پاس ہی ایک بل میں ہمیشہ خوشی زندگی بسر کر رہے تھے اور ہم آنے والے بیس بجیں سالوں میں انسانی روپ دھارنے والے تھے۔

ایک دن میں بل میں موجود تھیں تھا اور میری بیوی بل کے باہر موجود تھی خوشیا اور چوہدری نواز کی نظر میری



### 63 برس کا فرق

29 سالہ چیرٹی مہا نے شادی کیا کی ان کی شامت آگئی، دراصل انہوں نے خود سے صرف 63 برس سینئر تاجر سے شادی کی ہے جس پر لوگ حیران ہیں لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ پیئر گر ورس انتہائی دولت مند ہیں اور 92 برس کی عمر اتنی زیادہ بھی نہیں کہ مرد کو شادی سے روکے۔

(جاوید علی - حیدر آباد)

احساس ہونے لگا اس وقت تک ساتھ کے گھروں سے لوگ بھی اٹھ کر نور حسین کے دروازے پہ جمع ہونے لگے وہ سب مولوی صاحب سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا لیکن ان کو خود کچھ معلوم نہ تھا تو وہ ان کو کیا بتاتے۔ انہوں نے بھر سے دستک دی لیکن اس دفعہ بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تو سب نے مشورہ کر کے ایک آدمی کو دیوار سے اندر کودنے کو کہا اور مولوی صاحب نے ایک آدمی کو مسجد میں اذان دینے بھیج دیا۔

اندر اتر کر آدمی نے کڑی کھول دی تھی پھر آگے مولوی صاحب اور ان کے پیچھے باقی لوگ گھر میں داخل ہو گئے نور حسین کے کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے پہلے ان کو اونچی آواز سے پکارا لیکن کچھ دیر تک کسی کے بھی باہر نہ نکلنے پر وہ خود ہی اندر چلے گئے سامنے ہی فضل بے ہوش پڑا تھا، انہوں نے اس کو آواز دی اور پھر اس کو بلانے لگے اس کو بلاتے ہوئے ان کا دھیان سامنے چار پائی پہ نور حسین پہ چلا گیا وہ منظر دیکھ کر مولوی صاحب کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

نور حسین کا سر ان کے جسم سے الگ نظر آ رہا تھا۔ مولوی صاحب کی زبان پہ فوراً کلمہ جاری ہو گیا کچھ دیر تک وہ با آواز بلند کلمہ کا ورد کرتے

اس کے والدین اس پہ ایک الوداعی نظر ڈال کر پیچھے کی طرف مڑے اور سفید بادلوں میں غائب ہو گئے اور وہ پیچھے سے آوازیں دیتے رہ گیا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھا اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ ”اوہ..... تو یہ ایک خواب تھا“ اس نے جب اپنے آپ کو کمرے میں اپنے بستر پر پایا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا لیکن اس کے دماغ میں جھن اب بھی تھی اس کو سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی اس نے اٹھ کر کمرہ میں رکھے نکلے سے پانی نکالا اور آدھا گلاس ہی پی سکا تھا کہ اس سے ایک جھٹکا سا لگا پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے اپنے والدین کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی اس کو یاد آیا کہ ابا تو سوتے ہوئے اونچے اونچے خراٹے لیتے تھے لیکن رات کو اس نے واپسی پہ کمرے میں جھانکا تو وہ بالکل خاموشی سے سو رہے تھے جس سے اس کے دماغ میں کھٹک سی پیدا ہوئی جو کافی سوچنے کے بعد بھی اسے سمجھ نہ آ سکی اور اب پانی پیتے یاد آ یا تو اس نے ان کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسی طرح دوڑتے ہوئے اس نے دروازہ زور سے کھولا جس سے دروازہ دھڑ دھڑا اٹھا جس سے کافی شور ہوا لیکن اس کے والدین اتنا شور ہونے کے باوجود نہ جاگے تو اس کے دماغ میں ہلچل سی ہونے لگی اسے کچھ انہونی ہونے کا ڈر سا لگ رہا تھا پھر وہ یو جھل قدموں سے آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ابا کے اوپر سے رضائی کھینچ لی لیکن لائین کی روشنی میں نیچے کا منظر دیکھتے ہی اس کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ دل تھام کر وہیں گر گیا۔

مولوی امام دین صبح کی اذان دینے کے لئے تیز تیز قدموں سے مسجد کی طرف جا رہے تھے وہ نور حسین کے گھر کے پاس پہنچے ہی تھے کہ ان کو ایک چیخ سنائی دی جسے سنتے ہی وہ رکے پر مجبور ہو گئے انہوں نے جلدی سے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کافی دیر تک اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو ان کو کسی گڑبڑ کا

سانس پھول گیا تھا کچھ دیر وہیں کھڑے رہ کر اس نے اپنا سانس درست کیا ساتھ ہی وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ پھر اپنے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا۔

اس نے آہستہ سے والدین کے کمرہ میں جھانکا لائین کی مدھم بولیں وہ اپنی اپنی چار پائیوں پہ سوتے نظر آئے لیکن بس اسے کوئی بات بے چین کر رہی تھی کچھ دیر وہ کھڑا سوچتا رہا لیکن وہ بات اس کے دماغ میں نہ آ سکی اس کے دماغ میں ایک جھن سی تھی آخر کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرہ میں آ گیا اور چار پائی پر لیٹ کر قبرستان والے واقعہ کے بارے میں سوچنے لگا اس کی آنکھیں نیند سے یو جھل ہونے لگیں وہ غنودگی میں گیا ہی تھا کہ اسے کسی لڑکی کی کھٹک دار ہنسی کی آواز سنائی دی اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں کچھ سوچتے ہوئے اس نے لائین کی مدھم بولیں کو آواز دینا کر دیا اور پورے کمرے کو فور سے دیکھا لیکن اس کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے دوبارہ سے چار پائی پہ لیٹنے ہی آیت الکرسی پڑھی اور پھر آنکھیں بند کر لیں کچھ منٹ بعد ہی وہ نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

وہ ایک پہاڑی پہ کھڑا تھا سامنے ہی دوسری پہاڑی پہ اس کے والدین صاف سہرا سفید لباس پہننے کھڑے تھے پہاڑی کی چوٹی پہ سفید سفید بادل اتر رہے تھے جو کہ آہستہ آہستہ اس کے والدین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اپنے والدین سے اپنے آپ کو اتنا دور دیکھ کر پریشان ہو گیا دونوں پہاڑیاں آپس میں جڑی ہوئی تھیں اس نے بے چین ہو کر والدین کی طرف دوڑ لگا دی لیکن ایک بہت ہی بڑی اور گہری کھائی نے اس کا راستہ روک لیا اس نے بہت ہی مشکل سے اپنے آپ کو اس کھائی میں گرنے سے بچایا۔ درمیان ہی فاصلہ بہت زیادہ تھا اس نے بے تاب سے ادھر ادھر دیکھا لیکن دوسری طرف جانے کا راستہ نہ پاس آ کر وہ اداں ہو کر اپنے والدین کی طرف دیکھنے لگا جو کہ اس کی طرف چپ چاپ پیار بھرے انداز سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بالکل بے بس ہو گیا تب

اپنے چاروں طرف نظروں کو گھمایا لیکن اسے ساتھ چلنے والا اور کوئی بھی نظر نہ آیا۔

فضل حسین حافظ قرآن اور ایک بہادر لڑکا تھا اسی لئے نا تو وہ گھبرایا اور نہ ہی اسے ڈر لگا کچھ دیر تک وہ کھڑا دیکھتا رہا اور پھر سے وہ اپنے راستے پر ہلایا اس کا دھیان اپنے ابا کی طرف چلا گیا اور وہ سوچنے لگا کہ اگر ابا جاگ گئے تو خیر نہیں کیوں کہ اس کے والد نور حسین بہت ہی سخت آدمی تھے، فضل سولہ سال کا ہو چکا تھا لیکن اب بھی اس سے اگر کوئی غلطی ہو جاتی تو اس کے والد اسے مارنے لگتے یہ بات اس کے ذہن میں آئی تو اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔

قبرستان میں ایک بہت ہی پرانا اور بہت بڑا سا یو بڑکا درخت تھا جس کی لمبی لمبی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ فضل اس درخت کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ”چمن چمن چمن“ کی آواز سنائی دینے لگی اس کو بہت ہی عجیب لگا وہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی لڑکی پائل پہنے اس درخت کے گرد گھوم رہی ہو۔ اتنی رات کو قبرستان میں لڑکی یہ کیسے ہو سکتا ہے اس نے سوچا اسی وقت پھر سے پائل کی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی نسوانی آواز نے بہت ہی پیار سے پکارا۔ ”فضل“ آواز سننے ہی وہ کھٹک گیا۔

اس آواز نے اسے سحر زدہ کر دیا اور وہ اس آواز کے تعاقب میں کھینچا چلا گیا لیکن اس نے درخت کی طرف کچھ قدم ہی بڑھا ئے تھے کہ اسے ایک زور دار جھٹکا لگا اور اسے اس قبرستان اور یو بڑکے درخت کے بارے میں سنی بہت سی پراسرار باتیں یاد آنے لگیں جن پہ اس نے بھی توجہ نہیں دی تھی، پھر اتنی سردی میں بھی اس کے ماتھے سے پینہ پھونکنے لگا اس کے منہ سے خود بخود تلاوت قرآن پاک شروع ہو گئی اس کا تلاوت شروع کرنا تھا کہ ایک بلند نسوانی چیخ سنائی دی جو سنتے ہی فضل نے اپنے گاؤں کی طرف دوڑ لگا دی ساتھ ہی اس نے تلاوت جاری رکھی اور پھر اپنے گھر کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا دوڑنے سے اس کا



رہے۔ آخر انہوں نے لائین اٹھا کر نزدیک سے دیکھا تو ان کو ایک جھٹکا لائین ان کے ہاتھ سے گرتے گرتے پئی۔

سردھڑ سے ایک طرف بڑا تھا لیکن بستر پہ خون کا قطرہ تک نہ تھا اور اس کی گردن کو دیکھ کر ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی مضبوط ہاتھوں والے آدمی نے اپنی طاقت سے گردن کو سل کر دھڑ سے الگ کر دیا ہو اس کے بعد مولوی صاحب نے ان کی بیوی کو دیکھا تو وہ ایک جھرجھری لے کے رہ گئے دونوں لاشوں کو ایک جیسا ہی حال تھا لیکن.....

جب لاشوں کی یہ حالت باقی لوگوں نے دیکھی تو وہ بہانے بہانے سے غائب ہونے لگے۔ مولوی صاحب ساری بات سمجھ گئے۔ پہلے وہ بھی لوگوں کی اس گھر کے بارے میں پراسرار باتوں کو قصے کہانیاں سمجھتے تھے لیکن یہ انوکھے فل دیکھ کر وہ بھی سوچ میں پڑ گئے ان کے علاوہ سب لوگ وہاں سے غائب ہو گئے تو انہوں نے اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو بلا لیا اور پھر خود مسجد میں نماز پڑھانے چلے گئے۔ نماز کے بعد وہ واپس آئے تو فضل حسین ہوش میں آچکا تھا اور بہت پریشان اور افسردہ تھا اپنے والدین کی اس طرح اچانک اور اتنی بے دردی سے اموات دیکھ کر اسے صدمہ تھا ہی لیکن گاؤں والوں کی بے بسی دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روئے کو چاہ رہا تھا اسی بات پہ مولوی صاحب بھی حیران تھے دس بجے ان کا جنازہ ہوا اس سے پہلے پولیس کے کچھ لوگ آئے لیکن لاشوں کی حالت دیکھ کر بغیر کوئی کارروائی کئے واپس چلے گئے۔ جنازہ میں ٹوٹل چار آدمی تھے مولوی صاحب، ان کے دو بیٹے اور خواہ فضل حسین۔

نور حسین اور ان کی بیوی پاکستان بننے ہی ہندوستان سے پاکستان اس گاؤں میں پہنچے ان کے پاس پہنچے ہوئے کپڑے اور کچھ نقد رقم بھی گاؤں کے لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور گاؤں کے ایک طرف ہندوؤں کا چھوڑا ہوا مکان جس کی چار دیواری

نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ درختوں کی شاخیں لگ کر اس مکان کے سامنے پردہ سا بنادیا گیا تھا لیکن ان لوگوں کے لئے یہ بھی بہت تھا ان کو رہنے کے لئے ایک ٹھکانہ مل گیا تھا وہ بھی بغیر کچھ خرچ کئے۔

نور حسین لوہار کا کام کرتا تھا۔ مکان کے ایک طرف انہوں نے ایک چھپر سا بنا کر اس میں بھٹی لگا کر اپنا کام شروع کر دیا اس گاؤں میں پہلے کوئی لوہار نہیں تھا اسی لئے ان کا کام خوب چل نکلا اور آمدنی ہونے لگی پھر ان کے گھر فضل پیدا ہوا۔ جب جب ان کے پاس پیسے آتے گئے وہ گھر کو دھست دیتے گئے سامنے ہی دو درخت ایک دوسرے سے ڈیڑھ دو گز کے فاصلے پہ لگے ہوئے تھے، رات کو کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن نور حسین نے کبھی ان پہ دھیان نہیں دیا۔ انہوں نے فضل کو حافظ قرآن بنانے کے لئے مسجد میں مولوی صاحب کے پاس چھوڑ دیا اس وقت گھر کی چار دیواری بڑھ کر ان دونوں درختوں میں سے ایک کو اپنے اندر لے چکی تھی۔

اسی رات بہت تیز ہوا چلنے لگی نور حسین نے جب باہر نکل کر دیکھا تو اپنی بڑا عجیب لگا ان دونوں درختوں کی شاخیں ہوا کے زور پہ ایک طرف ہی جھوٹنی چاہتے تھیں۔ لیکن وہ تو ہوا سے ہلتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر آپس میں الجھ رہی تھیں اور وہ درخت ایک ایسے دوسرے کی طرف جھک رہے تھے جیسے کہ آپس میں دونوں گلے ملنا چاہتے ہوں اور اسی وقت مردوں اور عورتوں کی مین کرنے کی آوازیں آنے لگیں یہ سب دیکھ کر نور حسین کی ٹانگیں کا پھٹنے لگیں انہوں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ ”کیا ہوا یہ باہر کیسا شور ہے۔“ ان کی بیوی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”کک کک نہیں بس چپ کر کے سو جاؤ۔“ انہوں نے کانپتے ہوئے اپنی بیوی کو جواب دیا۔

”کچھ تو ہے۔۔۔۔۔“

”میں نے کہہ دیا کہ چپ کر کے سو جاؤ۔“ انہوں نے بیوی کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے غصہ سے کہا تو ان کی بیوی حیران ہو کر ان کو دیکھنے لگی لیکن آگے سے کچھ بولے بغیر ہی وہ چار دیواری پر لپٹ گئی وہ پوری رات انہوں نے جاگتے ہوئے گزار دی یہ آوازیں سن کر فضل حسین جو کہ ابھی چھوٹا تھا وہ بھی جاگ گیا پھر اس کی امی نے بہت مشکل سے اسے سلا یا۔

پھر یہ روز کا معمول بن گیا آخر وہ تنگ آ گئے لیکن ان کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل بھی نہ تھا وہ لوگ چار دیواری کو بڑھا کر پریشان تھے اب وہ یہ گھر بھی نہیں بچ سکتے تھے کیوں کہ ان کے پاس اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا وہ لوگ بہت پریشان تھے۔ انہوں نے کوئی عامل بلائے گا سوچا لیکن کچھ عرصہ تلاش کرنے کے باوجود بھی کوئی اچھا عامل نہ مل سکا اور یہ مسئلہ جوں کا توں رہا، اب تو پورے گاؤں میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ نور حسین کے گھر کوئی آسیب ہیں لوگ ان سے دور دور رہنے لگے۔ ہر رات ان کو اب بھی آوازیں آتی تھیں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ ہوا ان کو مالی یا جانی نقصان نہ ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ان آوازوں کے عادی ہو گئے اور فضل کے پہلا پارہ حفظ کرتے ہی انہوں نے رات کو گھر کے چاروں کونے پہ تلاوت کی جس سے ایک دم ہی وہ آوازیں بند ہو گئیں وہ رات ان کے گھر کتنے عرصہ بعد سکون کی رات تھی اور یوں فضل نے روزانہ تلاوت کرنا شروع کر دی اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا وہ سب کچھ بھول بھال گئے اور جب ان لوگوں کو کچھ نہ ہوا تو گاؤں والے بھی آسیب کی بات بھول کر ان کے ساتھ گل مل گئے فضل حسین کے حفظ مکمل کرتے ہی وہ اپنے ابا کے ساتھ کام کرنے لگا۔ آسیب والے واقعہ کو کافی عرصہ ہو گیا تھا نور حسین کی دکان کی چھت کافی خستہ ہو چکی تھی انہوں نے

چھت بدلنے کے لئے اس درخت کو کاٹنے کا ارادہ بنالیا اور اس کے لئے مضبوط قسم کا ایک کھٹاڑا بنایا۔

”اس درخت کو موت کا ٹو پادٹیں جب چار دیواری ہم نے بنائی تھی تو کتنا مسئلہ بن گیا تھا۔“ انہوں کی بیوی نے اس کو یاد دلانے ہوئے کہا۔ لیکن نور حسین نے اس کی ایک نہ سنی اور اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر درخت کو کاٹ دیا اور شام تک کچھ بھی نہ ہوا تو اس نے بیوی سے کہا۔

”دیکھو کچھ بھی نہیں ہوا تم ویسے ہی ڈر رہی تھیں۔“ لیکن اس کی بیوی کو یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا تھا وہ خاموش لیکن بہت پریشان تھیں۔ انہی دنوں گاؤں کے ساتھ ایک میدان میں میلہ لگا تھا سب گاؤں والوں نے وہ میلہ دیکھ لیا تھا سوائے اس خاندان کے کیوں کہ نور حسین کو نہ تو خود ان چیزوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ وہ اپنے گھر والوں کو دیکھنے دیتے تھے لیکن..... فضل حسین کو اپنے دوستوں سے میلہ میں ملنے کی سرکس کے بارے میں دلچسپ کر تب سن سن کر سرکس دیکھنے کا اشتیاق ہوا اسی رات وہ سرکس دیکھنے کی خوشی میں تلاوت کرنا بھی بھول گیا اور امی ابو کا سونے کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے والد بھی اس رات کام کر کے بہت تھکے ہوئے تھے اسی لئے انہیں بھی تلاوت کرنا یاد نہ رہا، میاں بیوی تلاوت کرائے بغیر ہی سو گئے اور ان کے سوتے ہی فضل سرکس دیکھنے نکل گیا اور پھر مادرانی حقوق جو کب سے ان پہ تاد کھائے ہوئی تھی اس نے بہت ہی خطرناک انتقام لیا،

ان لوگوں کے پراسرار قتل کو دیکھ کر لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں کیوں کہ ان کے گلے مسل کر مردہ دے گئے تھے بستر پر خون کا قطرہ تک نہ تھا اور غسل دینے والوں نے دیکھا کہ ان کے جسموں سے بھی خون جیسے نچڑ لیا گیا تھا۔

اپنے والدین کی موت کے بعد فضل بالکل اکیلا رہ گیا اب تو لوگ بھی اس سے ڈرنے لگے تھے

## ڈریکولا کی طاقت



بابا میں جانتا ہوں تم اپنے آپ کو ایک کامل بزرگ سمجھتے ہو، مگر نواب نے بھی آج تک کئی عامل بزرگوں کو خون میں نہلا دیا ہے۔

**آدمی** رات کے وقت اچانک عبد المجید کی آنکھ کھلی، شدید گرمی کی وجہ سے اس نے ہاتھ روم کا رخ کیا، جب اس نے پانی کا ٹکڑا کھولا تو چونک پڑا، اٹل سے پانی کی جگہ گاڑھا سرخ انسانی خون نکل کر اس کے سر پر چپکنے لگا، مجید ایک بہادر نوجوان تھا وہ زندگی میں بڑے سے بڑے خطرے سے بھی نہیں گھبرایا تھا لیکن شہر سے دور اس ویران عمارت میں اس غیر متوقع صورت حال نے اس کا رنگ اڑا دیا تھا وہ جلدی سے باہر نکلا اور ساتھیوں کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ پینٹا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد جاوید اندر داخل ہوا۔ جب اس نے مجید کی بات سنی تو بولا: تم نے ضرور کوئی خوفناک خواب دیکھا ہے یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ کر ہاتھ روم میں گھسا اور اٹل کو کھولا تو پانی برقی رفتار سے نیچے بہنے لگا۔

یہ دیکھ کر عبد المجید پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کیونکہ فرش پر جما ہوا خون بھی غائب تھا۔ باقی رات انہوں نے جاگتے ہوئے گزار دی۔

صبح ناشتے کی میز پر ہال کمرے میں نواب نے تمام واقعہ سنا اور بولا جائیز درست کہتا ہے ضرور مجید نے کوئی خواب دیکھا ہوگا، اس عمر میں ایسے خواب مجھے بھی آیا کرتے تھے، بہر حال جب تک تم لوگوں کی جپ ٹھیک نہ ہو جائے میں تمہیں اپنا مہمان بنانا پسند کروں گا، آج

اسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

اور پھر سارے لوگ شور مچاتے ہوئے گاؤں سے جنگل کی طرف بھاگنے لگے۔ اتنے میں وہ درخت جمل کر کوئلہ ہو چکا تھا اور فضل اس کے سامنے کھڑا آنسو بہا رہا تھا یہ سب کر کے اسے فرحت سی محسوس ہونے لگی اور وہ اپنے آپ کو سردی میں محسوس کرنے لگا۔ درخت کے جلنے کے بعد وہ بوچھل قدمیوں سے اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور والدین کے کمرے میں والد کی چار پائی پہ بیٹھ کر بہت رویا۔ ”ابا امی میں نے آج آپ کا بدلہ لے لیا“ اور پھر وہ خیالوں میں اپنے والدین سے باتیں کرتے کرتے ادھر ہی سو گیا۔ اسے سوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کی چار پائی جلنے لگی اس کی آنکھ کھل گئی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زور کا زلزلہ آگیا ہو اس نے اٹھ کر باہر کی طرف دوڑ لگائی یہی تھی کہ اتنا زور دار جھکا لگا جس سے وہ مکان پورا جلنے لگا اور پھر ایک دھماکہ سے اس کے اوپر آگرا اس کو ایسا لگا جیسے وہ منوں بوجھ تلے دب گیا ہو پھر اس کا دم گھٹنے لگا اور اسے کوئی ہوش نہ رہا۔

سارا گاؤں جنگل میں اکٹھا ہو گیا تھا وہ سب ڈر رہے تھے کہ اب نہ جانے کیا ہوگا، وہ ساری رات انہوں نے جنگل میں گزاردی۔ صبح ہوتے ہی جب وہ لوگ گاؤں میں داخل ہوئے تو فضل حسین کے گھر کی طرف دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیوں کہ اس جگہ ایک بہت بڑی قبر سی بنی ہوئی تھی جب کہ ان کے گھروں کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ گاؤں والے وہ ڈرتے ڈرتے اس کے قریب چلے گئے مکان گر کر قبر کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اس کی چار دیواری نے اندر کی طرف گر کر اس قبر کے ساتھ ایک چوڑے کی شکل بنادی تھی قبر کے اوپر کسی جنگلی بوٹی نے سفید رنگ کے پھول کھلائے ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگ اس قبر کے پاس کھڑے حیران ہو رہے تھے اور ساتھ ہی وہ جلا ہوا درخت انہیں مسکراتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆

جس راستے سے وہ گزر رہا ہوتا لوگ وہ راستہ ہی چھوڑ جاتے یہاں تک کہ وہ مسجد میں جاتا تو وہاں بیٹھے لوگ نماز پڑھے بغیر ہی وہاں سے بھاگ جاتے جیسے کہ انہیں کوئی بھوت نظر آگیا ہو اس ساری صورت حال سے وہ بہت پریشان تھا وہ جب گھر جاتا تو اس کو اپنے والدین یاد آنے لگتے اور گھر جیسے اس کو کانٹے کو دوڑتا جب جب اس کو والدین کی یاد سنا تھی تب تب اس کے دل میں اس خوفی مخلوق کے لئے غصہ بھرا شروع ہو جاتا تھا وہ سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔

ایک رات وہ گھر کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے وہ درخت اس پہ رہس رہا ہو۔ اس نے وہیں کھڑے ہو کر اس درخت کی طرف غور سے دیکھا تو وہ فضل کو ایک بھیڑیے جیسا لگا جس کے سامنے کے بڑے بڑے دانت خون سے بھرے ہوئے تھے اور وہ بھیڑیا اس کی طرف بڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

فضل بھاگ کر اندر گیا اور کمرے میں پڑے ایک کین جو کہ مٹی کے تیل سے بھرا ہوا تھا، لے کر اسی طرح بھاگتا ہوا اس درخت تک پہنچا اسے ایک زور کا دھکا لگا لیکن اس نے اپنے آپ کو کرنے سے بچالیا اور پھر اونچی آواز سے تلاوت کرنے لگا ساتھ ساتھ درخت پہ مٹی کا تیل بھی چھڑکتا رہا۔

اسی وقت درخت سے رونے پینے اور آہ و زاری کی آوازیں آنے لگیں۔ لیکن اس نے کسی بھی آواز پر دھیان نہ دیا تیل چھڑک کر اس نے درخت کو آگ لگادی سرسبز درخت نے بہت آہستہ آہستہ آگ پکڑی اور پھر آگ تیز ہونے لگی آگ کے تیز ہوتے ہی چیخ و پکار بھی تیز ہو گئی ان آوازوں کا شور بڑھتے ہی گاؤں کے لوگ گھروں سے باہر آنے لگے پہلے ان کو سمجھ ہی نہ آئی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے لیکن جب ان کو سمجھ آئی تو وہ سارے فضل حسین کو گالیاں دینے لگے، وہ فضل کو یہ سب کرنے سے منع کر رہے تھے۔ لیکن وہ ان چیخوں کو سن کر اطمینان محسوس کر رہا تھا

جائزہ قریبی قصبے میں جا کر جیب مرمت کے لئے دے آئے گا، جیسے ہی وہ درست ہو کر آئے تم باغ جناح روانہ ہو جانا۔ جب وہ سب باتیں کرنے لگے تو نواب اپنی جوانی کے کارنامے سنانے لگا۔ جنہیں سن کر ان کا خوف جاتا رہا ایک گھنٹے بعد نواب اٹھ کھڑا ہوا، اور کہا کہ مجھے ایک ضروری کام ہے، جا رہا ہوں، یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ہم چار دوست تھے، عبد المجید، ظفر، نادر اور عباس۔ ہم ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے، نادر اور میری دوستی زیادہ تھی، ہم اگر کسی دن ایک دوسرے کو نہ ملنے تو ہمیں سکون نہیں ملتا تھا، عبد المجید کو ہم سب مجید کہہ کر پکارتے تھے اور ظفر کی شکل لڑکیوں کی طرح تھی اس لئے ہم سب اسے نیلم بلاتے تھے، ہمیں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ہم نے سوچا کہ ہم کسی خوب صورت گاؤں کی سیر کے لئے چلیں گے اور سوچ بچار کے بعد آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ باغ جناح جائیں گے، تین دن کے بعد ہم سبز پروانہ ہوئے ہم ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ چانک ہماری گاڑی ایک جھکے کے ساتھ رکی اور بند ہو گئی میں نے نیچے اتر کر دیکھا تو آجین کا ایک پرزہ عارضی طور پر کام کرنا بند کر چکا تھا، میں اور ہمارے سب ساتھی پریشان ہو گئے سڑک بالکل سنانا پڑی تھی اس لئے فوری طور پر مدد مانا بھی ممکن نہیں تھا، آخر کار ہم نے جیب کو دھکا لگا کر ایک جگہ پر کھڑا کیا اور اپنے اپنے سفری بیگ اٹھا کر جنگل میں داخل ہو گئے تاکہ اگر قریبی کوئی راستوں سے گزرتے وقت ہمیں مختلف خطرناک جانوروں کے چیننے کی آواز ہی سنائی دیں۔

دوستوں لگتا ہے آج ہم بہت برا پیچھے ہیں اس ویران جنگل میں، اگر مدد نہ ملے اور یہ نہیں ہمارا کیا شہر ہوگا۔ میں نے زبان کو کھلی لیکن اب کوئی نہ کوئی راستہ تو بچاؤ کا ہوگا۔ ڈھونڈنا ہوگا نیلم نے کہا۔

باقی دونوں دوستوں نے بھی اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

جنگل بہت طویل ثابت ہو رہا تھا۔ آخر کار ایک

گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد چانک نادر کی نظر ایک عمارت پر پڑی اس عمارت کی دیواروں پر مٹی بھی ہوئی تھی۔ عمارت کے ارد گرد چھوٹا سا باغ تھا جس کے درخت اور پودے مر چکے تھے اور باغ کے ارد گرد خاردار تاریں بھی لگی ہوئی تھیں، ہم چاروں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ عمارت کے مالک کے پاس چل کر پناہ طلب کی جائے۔

نیلم اس عمارت سے دور رہنے پر بعد تھی، میں بولا۔ اس مشکل ترین وقت میں عمارت کے بغیر اور چارہ نہیں ورنہ ہم جنگلی جانوروں کی خوراک بن جائیں گے۔ آخر کار ہم لوگ باغ کے دروازے تک پہنچے۔ دروازہ نہایت ہی مضبوط آہنی لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی چند سیکنڈ گزر گئے، میں دوبارہ دستک دینے ہی والا تھا کہ دروازہ ایک دھماکہ سے کھلا۔

سامنے ایک لمبا تڑکھا شخص کھڑا تھا۔ جس نے کوٹ پتلون زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کی شرح آکھوں میں نہایت ہی تیز چمک تھی جبکہ چہرے پر ایک عجیب سی اداسی کا راج تھا، کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ اس کی آواز نہایت ہی کھردری اور جذبات سے خالی تھی۔

ہم لوگ مسافر ہیں باغ جناح جا رہے تھے کہ سڑک پر ہماری جیب خراب ہو گئی ہمیں صرف آج کی رات کے لئے پناہ دے دیجئے، نادر نے بڑے ادب سے کہا۔ اس مرتبہ ہم نے شخص کے چہرے پر ایک تیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بولا۔ ٹھیک ہے میں تمہاری مجبوری کو سمجھتے ہوئے تمہیں اس عمارت میں ٹھہرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ آؤ اندر آ جاؤ یہ کہہ کر وہ سامنے سے ہٹ گیا۔

ہم سب اندر داخل ہو گئے۔ اس شخص نے ایک جھکے کے ساتھ دروازہ بند کیا اور ہمارے آگے چل پڑا۔ عمارت اندر سے خاصی وسیع تھی اور صاف ستھری تھی مختلف راستے سے گزرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں پہنچے، لمبا شخص دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ہم سب اس کے پیچھے اندر کا منظر دیکھ کر حیرت

میں ڈوب گئے۔ وہ ایک وسیع و عریض ہال تھا جس میں کھانے کی ایک بہت بڑی میز پر بہت سارے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ ہم سب کھانے پر لوٹ پڑے، پھر نیلم نے اس سے پوچھا۔

”آپ کا نام کیا ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”میرا نام جائیز ہے میں اس عمارت کے مالک نواب کا نوکر ہوں۔“ ٹھیک اسی لمحے دروازہ کھلا اور نہایت عالی شان لباس میں ایک خوب صورت نوجوان اندر آ کر قریب کھڑا ہو گیا۔ نواب صاحب نے ہمارے لئے مہمان ہیں۔ یہ پیارے جنگل میں جیب خراب ہو جانے پر یہاں پہنچے ہیں تو میں نے انہیں پناہ دے دی۔

تم نے بہت اچھا کیا، نواب کی آواز سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا اسی وقت عبد المجید نے سوال کر دیا۔

”نواب صاحب آپ کو اس ویرانے میں رہنے کا خیال کیسے آیا؟“

نواب کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا، اس نے جواب دیا۔ ”در اصل جب میں دنیا کے ہنگاموں سے اکتا جاتا ہوں تو میں یہاں آ کر ایک دو ماہ تک مکمل آرام کرتا ہوں۔ یہ عمارت میں نے برسوں پہلے ایک جاگیردار سے خریدی تھی۔“

پھر جائیز ہمیں لے کر ایک کمرے میں پہنچا۔ جس میں پانچ بیڈ آرام دہ بستروں اور دیگر ضروری سامان سے آراستہ تھا۔ ہم بستروں پر دراز ہو کر آرام کرنے لگے۔

نواب اور جائیز کے جانے کے بعد ہم مختلف حصوں کی سیر کرنے لگے، ایک کمرے میں داخل ہوئے، ہم چونک اٹھے کمرے کی دیواروں پر مختلف انسانوں کی مسخ شدہ لاشوں کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ کسی کا سر قاعب تھا، کسی کا ہاتھ کٹا ہوا تھا جبکہ کسی کے جسم پر کسی دھم دکھائی دے رہے تھے۔

”یاریہ ہم کہاں آ پھنسے۔“ نیلم نے سوچ کر کہا۔

”گھبراؤ نہیں، ہم کسی بھی قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا جانتے ہیں۔“ نادر نے کہا۔ حالانکہ وہ بھی اندر سے کانپ کر رہ گیا۔

اسی طرح ایک اور کمرے میں الماریوں میں خطرناک چمچے، چاقو، پنجر اور برچیاں رکھی ہوئی تھیں، ایک اور کمرے میں دیکھنے پر چھت پر لٹکتے ہوئے پھانسی کے چند پھندے بھی نظر آئے اور سیڑیوں کا ایک بڑا ڈھیر فرش پر اتھا۔

میرا دماغ بڑی جیزی سے اس خطرناک صورتحال کو سمجھنے میں مصروف تھا۔ آخر عمارت کی سیر سے فارغ ہو کر ہم باہر باغ میں نکل آئے، باغ کے ایک کونے میں گئے درختوں کے نیچے ایک پرانا کنواں نظر آیا یہ کنواں اندر سے تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم واپس اپنے کمرے میں آ گئے اور آپس میں بات کرنے لگے۔

شام کے وقت نواب اور جائیز کھانے کی میز پر آن موجود ہوئے کھانے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے نواب سے تمام احوال کہہ دیا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ”دوستوں یہ عمارت میں نے جس حال میں خریدی تھی۔ اسی حالت میں ہے، اسی لئے اگر چند ناخوشگوار چیزیں نظر آئی ہیں تو میں اس کے لئے آپ سب سے معذرت خواہ ہوں۔“

آج شام ہی سے سرد ہوا چل رہی تھی۔ رات کے بارہ بجتے ہی خوفناک آندھی شروع ہو گئی جس سے جنگل میں ہر طرف گرد و غبار کا طوفان برپا ہو گیا اور میلوں تک بھی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اور میرے دوست خوش گپیوں میں مصروف تھے، آخر کار ایک بجتے ہی ہم سب سو گئے، ابھی ایک گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ کمرہ ایک زوردار چیخ سے گونج اٹھا، یہ چیخ میرے منہ سے نکلی تھی۔ جو میرے چہرے سے ہوائیاں اڑا رہی تھی اور کیوں نہ اڑاتی کیوں کہ ہمارا دوست مجید بستر پر موجود نہیں تھا۔

عباس، اب ہم کیا کریں ہم اس خوفناک عمارت میں بہت برے پھنس گئے ہیں۔“ نادر نے مجھ سے کہا۔



اور ہم نے خفیہ طور پر عمارت کا کونا کونا چھان مارا مگر مجید کا کوئی سراغ نہ ملا اس سنگین صورت حال نے ہمیں متحیر کر دیا۔

صبح ناشتی کی سیز پر ہم نے نواب اور جانی کو بہت خوشگوار موڈ میں پایا تو انہیں سخت حیرانی ہوئی نواب نے مجید کی کشیدگی پر جائیز سے استفسار کیا۔

اس نے مکمل لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے تھلاں شروع کرنے کی تجویز پیش کی، عمارت کے اندر اور باہر دو گھنٹے کی تلاش کے باوجود مجید کا کوئی نام و نشان نہیں ملا، نواب کسی کمرے میں چلا گیا اور جائیز اپنے کمرے میں جا بکھسا۔

ہم خاموشی سے باغ میں بیٹھے اور اندھیرے کنویں میں پھیل نارج نکالی اور اس کی روشنی میں ہمیں کنوئیں میں خوفناک منظر دکھائی دیا کہ خوف سے ہمارے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا، دماغ نے سوچنا سمجھنا بند کر دیا اور بہشت نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چند منٹ تک ہم گم سم کھڑے رہے۔

کنوئیں میں بڑی مجید کی سس شدہ لاش نے حواس گم کر دیئے، جائیز سے پوچھتے پر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا، آخر کار مجید کی لاش کو جنگل میں ایک جگہ دفن کر دیا گیا۔

ہم سب دوست متحیر ہو گئے، ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی جو اس عمارت میں چلے آئے سارا دن پریشانی میں بسر کیا، شام کو نواب نے ساری بات سن کر اسٹوں کا اظہار کیا اور بولا صبح اس معاملے پر غور کریں گے ہم سب رات ہوتے ہی سو گئے۔

آدھی رات کے وقت اچانک میں نے خواب میں دیکھا کہ نیلم ایک کمرے میں رسیوں کے پھندے میں جکڑا تڑپ رہا تھا اور اس کے قریب کھڑا جائیز ایک تیز دھار چھری سے زخم لگا رہا تھا جس سے نکلنے والا خون نواب اپنا منہ کھول کر پی رہا تھا۔ پھر نیلم نے ایک چیخ ماری اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی میرا پورا جسم پسینے سے تر ہوتا اور

سائیں کسی لوہار کی دھوکنی کی طرح تیز رفتاری سے چل رہی تھیں۔

میں نے نادر کو اٹھا کر خواب سنایا اور ہم دونوں چپکے سے اپنے کمرے سے نکلے اور عمارت کے صدر دروازے تک پہنچے۔ چار کفن پوش مردوں نے ہمارا راستہ روک لیا ان مردوں کو دیکھ کر ہم سخت گھبرائے، ایک مردہ قہقہہ لگا کر بولا، ہمارے مسکن سے آج تک کوئی انسان زندہ واپس نہیں گیا ہے، کمرے میں چلے جاؤ ورنہ کچا چپا جائیں گے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار مکہ ایک مردے کی ناک پر رسید کیا تو وہ سر پکڑ کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر نادر نے جب سے شکاری چاقو نکالا اور ایک مردے کے سینے پر پہنچا مارا مردے نے ایک ہولناک چیخ ماری اور دونوں غائب ہو گئے۔

ہم دونوں دوڑتے ہوئے آگے بڑھے، سامنے نواب اور جائیز کے ہمراہ چار کفن پوش مردے کھڑے تھے، خونخوار نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

نواب خوفی ڈر نکولا دکھائی دے رہا تھا جبکہ جائیز کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ دونوں کے منہ نیلم کے خون سے تنھڑے ہوئے تھے۔

مردوں نے ہمیں پکڑ لیا اور ہمیں ایک کمرے میں بند کر کے چلے گئے مردوں کے جانے کے بعد میں نے کھڑکی کھولی تو ایک کفن پوش مردہ مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

میں نے ایک پتھر مردے کے سر پر دے مارا مردہ چند سیکنڈ کے لئے غافل ہوا میں اور نادر کھڑکی سے باہر اور تھپتھپا روں والے کمرے میں جا کر دہلی کی تلواریں اٹھالیں، اسی دوران کفن پوش مردوں کی ایک ٹولی جس کی تعداد چار تھی کمرے میں داخل ہوئے اب ہمارے درمیان ایک خوفناک جنگ کا آغاز ہو گیا۔

مردے ہم پر ایک خطرناک انداز سے وار کر رہے تھے اور ہم نے جان بچانے کے لئے سر دھڑکی بازی لگادی اور آخر کار تمام مردوں کے سر اڑا دیئے اچانک جائیز دروازے سے اندر داخل ہوا اور اڑتا ہوا نادر

پر حملہ آور ہوا نادر فرش پر گر پڑا۔

جائیز نے اسے دبوچ لیا اور اپنے نوکیلے دانت لہر لہا اس کی شرک کے قریب لے جانے لگا میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تلوار کا وار جائیز کی گردن پر کر دیا۔

ایک خوفناک چیخ کے ساتھ ہی جائیز کی گردن اڑ کر دروازے کی طرف چلی گئی۔ ٹھیک اسی لمحے عمارت خوفناک چیخوں سے گونج اٹھی، ہم دونوں بھاگتے ہوئے عمارت کے صدر دروازے کی طرف دوڑے، مگر ہمیں دور سے کفن پوش مردے اور ڈر نکولا دکھائی دیئے جو دروازے کے سامنے موجود تھے پھر ہم عمارت کی طویل سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر پہنچے لیکن یہاں بھی ایک غیر متوقع صورت حال نے ہمارا استقبال کیا کیونکہ چھت پر دو کفن پوش مردے کھڑے تھے وہ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔

آخر کار موقع ناک کر میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک مردے کو زوردار لٹ رسید کیا وہ عمارت کی چھت سے نیچے جا گرا، دوسرے مردے کو نادر نے تلوار مار کر اس کی گردن اڑا دی۔

پھر ہم دونوں عمارت کے پائپ سے نیچے اترنے لگے چھت پر مردے اور ڈر نکولا آگئے اور انہوں نے بلند آواز میں شور مچانا شروع کر دیا۔ دوڑو پکڑو، بھاگنے نہ پائیں۔

ہم نیچے اتر کر بھاگتے ہوئے کچھ جنگل میں گھس گئے، کئی کفن پوش مردے اور ڈر نکولا ہمارے تعاقب میں رہے۔ آخر کار ایک جگہ کھنسی جھاز یوں میں گھس کر ہم نے خود کو پھپھایا، پھر تمام مردے اور ڈر نکولا ہماری تلاش میں آگے سے گزر گئے۔ بڑی مشکل سے جان بچاتے ہوئے ہم دونوں اس جنگل کے درمیان میں پہنچے، یہ دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی کہ ایک بڑی سی جھوپڑی موجود تھی۔

ہم اس جھوپڑی کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے، جھوپڑی میں ایک لائین روشن تھی، ہم نے ایک سفید ریش بزرگ کو ایک چٹائی پر بیٹھے اللہ کی عبادت

میں مصروف دیکھا۔ ہم آگے بڑھ کر بزرگ کے قدموں میں گر گئے، ”بابا خدا کے لئے ہمیں بچا لو“ بزرگ نے چونک کر دیکھا اور بولے۔ ”اب تم بالکل محفوظ ہو، رحمان بابا کے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا بال بھی بچا نہیں کر سکتا“ یہ سن کر ہماری جان میں جان آئی ہم نے تمام قصہ تفصیل سے رحمان بابا کے کوش گزار کیا۔

رحمان بابا بولے تم خدا کا شکر ادا کرو تم میری پناہ میں آگئے ورنہ جنگل میں موجود اس خوفی عمارت نے آج تک ہزاروں انسانوں کا خون پیا ہے۔ اس عمارت میں نواب نامی ایک ڈر نکولا کفن پوش مردوں اور دیگر شیطانی طاقتوں کا سردار ہے۔ چونکہ وہ شیطان کا خاص چہلا ہے۔ اسی لئے اس کے اندر شیطانی طاقتیں بھی موجود ہیں۔

چند سیکنڈ بعد جھوپڑی کے باہر خوفناک تہمتوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

پھر کمری نے کشت لہجے میں کہا۔ ”بابا ہمارے حکار ہمیں واپس کر دو تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ رحمان بابا ہمیں لے کر جھوپڑی کے باہر نکلے،

جھوپڑی کے چاروں طرف کفن پوش مردوں، ڈر نکولا اور بھوت، چڑیلوں کی ایک فوج کھڑی تھی ان کے عزائم نہایت ہی خطرناک اور جارحانہ لگ رہے تھے رحمان بابا تیز نظروں سے ان کو گھورا اور بولے۔ اچھا ہوا جو تم خود ہی موت کے منہ میں چلے، خلق خدا تم سے بہت شک ہے تمہارا وجود اس کائنات کے لئے نہایت مہلک ہے۔

بابا میں جانتا ہوں تم اپنے آپ کو ایک کامل بزرگ سمجھتے ہو، مگر نواب نے بھی آج تک کئی عامل بزرگوں کو خون میں نہلا دیا ہے۔ نواب کی یہ بات سن کر رحمان بابا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

نواب نے اپنے ساتھیوں کو حملے کا حکم دیا۔ چاروں طرف سے مردوں نے یلغار کے انداز میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

رحمان بابا نے جلدی سے چند مقدس کلمات پڑھ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو سیدھا کر کے ان کا رخ

## چھلاوا



اس چھلاوے نے سارے گاؤں والوں کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ بڑے بڑے عامل

آئے مگر سب اپنی جیبیں بھر کر چلے گئے۔

پوست ہو جائے گی۔

آج کا انسان چاند کو خیر کرنے کے بعد مرغ اور سورج پر جانے کے لئے پر توں رہا ہے۔ مگر آئیں دنیا پر قابو پانا اس سائنس کے بس کی بات نہیں اس معاملے میں سائنس بالکل ناکام و نامراد نظر آتی ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر دیہاتوں میں آج بھی آئیں جگہ، آئیں جوہر اور جن بھوت کے بسیرے موجود ہیں۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ انسانوں سے زیادہ تعداد ان کی ہے اگر آسان سے سوئی نیچے زمین کی طرف پھینگی جائے تو وہ ضرور کسی نہ کسی جن یا بدروح کے جسم میں

خونفک کہانیاں 41 اپریل 2018ء

شیطان کی طاقتوں کی طرف کر دیا۔ انگلیوں سے بجلیاں نکل نکل کر شیطانی فوج کے سپاہیوں کو جسم کرنے لگیں۔ ویران جنگل شیطانی فوج کے کارندوں کی بھیاں تک چبڑوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ تک مقابلہ جاری رہا پھر تمام فوج جل کر راکھ ہوئی یہ دیکھ کر نواب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے منہ ہی منہ میں ایک منتر پڑھ کر پھونک ماری تو آگ کی ایک روشن دیوار نے رحمان بابا اور ہمیں گھیر لیا پھر نواب نے قہقہہ لگایا اور ایک اور منتر پڑھا تو دس لکھ پوش مردے نمودار ہو کر ہمارے گرد گھیر اڑاں کر کھڑے ہو گئے نواب آگے بڑھ کر بولا۔ رحمان بابا آخر تم بھی میرے جال میں پھنس گئے اب میں تمہیں عبرت ناک موت دوں گا ابھی اس نے نبی کہا تھا کہ رحمان بابا نے کچھ کلمات پڑھ کر پھونک ماری تو آگ غائب ہو گئی اور مردے ڈر کر پیچھے ہٹنے لگے۔

”رحمان بابا اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر ان کے خون سے اپنی پیاس بجھاؤ۔“ نواب نے کہا۔ اب رحمان بابا تیزی سے اپنی بھوپڑی میں گھس گئے اور تھوڑی دیر بعد نکلے تو ان کے ایک ہاتھ میں قالین تھا اور دوسرے ہاتھ میں طلسمی تلواریں، قالین پر ان کے کھڑے ہوتے ہی وہ تیزی سے فضا میں بلند ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر نواب اور اس کے ساتھی بھی ہوا میں اڑنے لگے، قالین کی رفتار تیز ہونے کے باوجود بھی درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر کار نواب قالین کے قریب پہنچا اور رحمان بابا پر چھٹا تو رحمان بابا نے تلوار کا وار کر دیا تو اس کا ہاتھ کٹ کر نیچے جا گرا نواب ایک بھیاں تک چیخ مار کر دور ہو گیا اور پھر دوبارہ حملہ آور ہوا۔

اس بار اس کا دوسرا ہاتھ بھی کٹ کر نیچے جا گرا۔ اب اس کے ہاتھوں سے خون بہنے لگا جبکہ مردوں نے قالین کو گھیرے میں لے لیا۔ رحمان بابا کی تلوار برق رفتاری سے چلنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ رحمان بابا کچھ پڑھنے بھی جا رہے تھے۔ آخر کار تمام کفن پوش مردے مارے گئے۔

☆ ☆

خونفک کہانیاں 40 اپریل 2018ء





خوف دہراس کے افق پر ٹھکھکیاں کرتی جسم و جان کو لرزادی والی دل گرفتہ و دل شکستہ روداد جو کہ پڑھنے والوں کو اچھے میں ڈال دے گی۔

ہو..... یہ تمہاری بد نصیبی اور احساس محرومی ہے؟“  
”مگنا ہے کہ تم جنگلی اور وحشی ہو اس لئے انسانی  
گوشت رغبت سے کھاتی ہو.....؟ میرا تعلق مہذب دنیا  
سے ہے اور ایسا ممکن نہیں کہ..... آدمی کا گوشت آدمی  
کھائے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”ہم نے سنا ہے کہ مہذب دنیا میں آدمی کا  
گوشت آدمی کھاتا بلکہ اس کا خون بھی پیتا ہے..... اس  
لئے وہاں خون خرابہ، قتل و غارت گری آئے دن ہوتی  
رہتی ہے.....؟ کیا یہ بات غلط ہے.....؟“

”اس کی وجہ دولت، عورت اور ہر قسم کی ہوس  
گیری ہوتی ہے..... وہ اس کے حصول میں اندھا  
ہو جاتا ہے..... قتل و غارت گری تو ہوتی ہے لیکن اس کا  
گوشت نہیں کھایا جاتا ہے۔“

”کاش.....! ہم تمہارے شہر میں ہوتے تو مزا  
آ جاتا..... وارے نیارے ہو جاتے۔ ہم روز انہ  
آدمیوں کا گوشت کھاتے..... واہ کتنا مزہ آئے گا۔“

چاندنی نے اندازہ کر لیا کہ یہ عورت پاگل اور خطی  
حواس ہے، اس لئے نہ صرف یہی کہی بلکہ ایسی باتیں  
کر رہی ہے کہ سامنے والا دہشت زدہ ہو جائے۔ اس  
نے سوچا کہ نہ صرف اس کی خوشامد بلکہ اس کی منت  
ساجت اس کی تعریف کر کے فریب سے کام لیا جائے  
اس تدبیر کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔

”اچھا..... اپنی تعریف سن کر اس عورت کا چہرہ

”کیا کھا.....؟“ چاندنی اچھل پڑی اور اس کا  
دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔

”کیا تم کوئی پاگل عورت ہو.....؟ دیکھ نہیں رہی  
ہو کہ میں انسان ہوں؟ کوئی جانور نہیں جسے بھون  
کر کھایا جائے.....؟“

”نہیں..... نہیں..... میں پاگل نہیں  
ہوں.....؟ کیا پاگل عورت مجھ جیسی ہوتی ہیں.....؟“  
اس نے استہزاء سے لہجہ میں جواب دیا۔

”دنیا میں انسان کے گوشت سے زیادہ  
لذیذ، ذائقہ دار اور مزے دار گوشت کسی جانور اور حیوان  
کا نہیں ہوتا ہے..... کیا تم نے اپنی زندگی میں کسی آدمی  
کا گوشت نہیں کھایا؟“

”انسان کا گوشت پاگل نہیں بلکہ آدم خور کھاتے  
ہیں.....؟ انسان نہیں کھاتا ہے..... وہ حیوان، پرندوں  
، چھلیوں کا گوشت کھاتا ہے..... یہی اسے مرغوب بھی  
ہوتا ہے۔“ چاندنی نے کہا۔

”لیکن ہم لوگ کھاتے ہیں؟ نہ صرف بڑے  
ذوق و شوق اور رغبت سے بلکہ اس کا خون اور ذائقہ منہ  
کو ایسا لگا ہوا ہے کہ کسی اور کا گوشت مزہ نہیں دیتا ہے؟  
آخر تم نے کبھی کسی انسان کا گوشت کھایا ہو تو بھولے سے  
بھی کسی اور کا گوشت کھانا پسند نہیں کرو گی؟“

”چونکہ کبھی شاید انسان کا گوشت کھانا نصیب  
نہیں ہوا اس لئے تم اس کے ذائقے اور لذت سے محروم



کل اٹھا وہ اتنی حسین نہ تھی کہ اس کی تعریف کی جائے لیکن وہ مرنے نہ کیا کرتی۔ لیکن تم بھی بہت حسین ہو دل نہیں کر رہا ہے کہ تمہیں بھون کر کھایا جائے؟“

”جب تمہارا دل نہیں کر رہا ہے تو پھر یوں کرو کہ مجھے جانے دو۔“ چاندنی نے بڑے ہٹھے لہجے میں کہا۔

”تمہیں کوئی اور لڑکی، عورت مل جائے گی۔ میں ایک مسافر عورت ہوں۔۔۔۔۔۔ مجھ پر رحم کرو۔“

”برسوں کے بعد ایک حسین لڑکی تو نظر آئی ہے۔“ وہ بولی۔

”اور پھر میرے دو ایک ساتھیوں نے تمہیں دیکھ لیا ہے وہ آ رہی ہیں میں ان کا انتظار کر رہی ہوں۔ بس ان کے آنے کی دیر ہے۔ پھر تمہیں ذبح کروایا جائے گا۔“

اس عورت کے آخری جملے کوں کر اس کے بدن پر نہ صرف سن سنا ہٹ دوڑ گئی بلکہ اس کا سینہ دھڑک اٹھا بلکہ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور سارا جسم پسینے میں بھینکنے لگا۔

”کیا۔۔۔۔۔۔ کہا۔۔۔۔۔۔؟“ چاندنی کے گلے میں آواز چھنے لگی۔

”کیا تم اکیلی نہیں ہو۔۔۔۔۔۔ تمہارے اور بھی ساتھی ہیں؟ کیا وہ سب کے سب آدم خور ہیں؟ کیا یہ آدم خوروں کی بستی ہے۔۔۔۔۔۔؟“

”ہم آدم خور نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔؟“ وہ بتانے لگی۔

”یہ کوئی تیس برس پہلے کی بات ہے کہ یہاں ایک جوڑا آیا تھا اور اس نے ہم لوگوں پر حملہ کر دیا ہم سب نے مل کر انہیں قتل کر دیا تھا نفرت اور شے سے نہ صرف ان کا خون پی لی گئے بلکہ ان کا گوشت بھون کر کھائے کبھی ہم نے حیوان کے علاوہ انسان کا گوشت نہیں کھایا۔ پرندوں، مویشیوں اور مچھلی پر گزارا ہوتا تھا سانپ، بچھو، گرہمچ اور اڑدھسے بھی کھاتے رہے تھے۔ جب آدمیوں کا گوشت کھایا تو ایسی لذت، ذائقہ اور مزاحمت کو لگا کہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ہم آدمی کا گوشت کھانے لگے۔ حکار کی تلاش میں ہم لوگ نکل جاتے تھے

لیکن یہاں کوئی آدمی قدم نہ رکھتا تھا۔ جب کوئی مرد، عورت اور لڑکی مل جاتی تو اسے لے آتے۔۔۔۔۔۔ برس دو ایک برس میں شکار ملتا تھا تم دو برس کے بعد ہاتھ لگی ہو۔ تمہیں دیکھ کر خوشی سے جو میرا حال ہوا اور ہو رہا ہے میں اسے زبان سے کہہ نہیں سکتی۔“

تم لوگوں کو ایک انسان کو ذبح کرتے ہوئے ترس نہیں آتا ہے۔۔۔۔۔۔ جب کہ میں عورت ہوں۔۔۔۔۔۔؟“ چاندنی نے کہا۔

”مرد ہو۔۔۔۔۔۔ عورت ہو۔۔۔۔۔۔ لڑکی یا لڑکا ہو۔۔۔۔۔۔؟“

جس طرح گھوڑا گھاس کھائے بغیر نہیں رہتا ہے اس طرح ہم بغیر انسانی گوشت کھائے کیسے رہ سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔؟“ وہ عورت نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”جب بھی کوئی شکار لگ جاتا ہے تو ہم جشن مناتے ہیں اسے ذبح کرنے سے پہلے۔۔۔۔۔۔؟“

”کیسا جشن۔۔۔۔۔۔؟“ اس کی زبان سے غیر ارادی طور پر نکلا۔ چاندنی کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی چہرہ جو زرد رہ گیا تھا وہ سفید پڑنے لگا نہ صرف اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز بلکہ سینے کی دھک دھک بھی بڑھنے لگی۔ اس کی رگوں میں بوجھ ہونے لگا وہ برف کا تودہ بنتی جا رہی تھی جیسے۔

”اس بستی میں صرف ہم خود ہی ہیں۔“ وہ کہنے لگی۔

جب کوئی عورت یا لڑکی ملتی ہے تو ہم ایک عرق پلاتے ہیں تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ پھر ہم اس کے جسم کے تشیب و فرائز، تناسب اور رنگ انگ میں چاقو اور خنجر دس سوراخ، چھید اور زخم کر دیتے ہیں تو ان میں سے خون اگلنے لگتا ہے اور ہم منہ لگا کر اس طرح پیٹے ہیں جیسے وہ کوئی نہ ہو۔ پھر اس کے جسم میں لہو کی پوند بھی نہیں رہتی اور پھر وہ موت کی آغوش میں جانے لگتی ہے کچھ دیر بعد وہ بے جان ہو جاتی ہے پھر اسے ذبح کر دیا جاتا ہے پھر اس کے جسم کے سارے اعضاء الگ کر لئے جاتے ہیں۔ پھر الاؤ روشن کر کے بھوننا جاتا ہے لڑکی اور عورت کا جسم زیادہ بھوننے کی

قوت نہیں آتی ہے وہ دھیمی آگ پر جلد ہی بھون جاتی ہے پھر ہم سب ایک بڑی تھال میں رکھ لیتے ہیں اس کا سر بھونتے ہیں تو بالوں اور آنکھوں سمیت۔۔۔۔۔۔ اس کے کان، ناک، گال اور ہونٹ میں ایک عجیب سا سوندھا سوندھا عین اور لذت ہوتی ہے پھر ہم اسے فوراً جٹ کر جاتے ہیں مردوں میں یہ بات نہیں ہوتی، انہیں زیادہ دیر تک بھوننا پڑتا ہے جلدت اور ذائقہ تو جوان لڑکی اور جوان سال عورت میں ہوتی ہے وہ ایک مرد میں نہیں ہوتی ہے۔“

یہ عورت جو قدرے تفصیل اور وضاحت سے بتا رہی تھی اس کی بات سن کر چاندنی کے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔ اس کے منہ کو کچھ آ رہا تھا۔ اگر وہ ایک عورت ہوتی تو بھرنے سے نکل کر کسی نہ کسی طرح اس پر قابو پالیتی۔ لیکن نوا فراد تھے سات عورتیں اور دو مرد۔ وہ تنہا ان سے کیسے مقابلہ کر سکتی تھی اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔

پھر یک لذت چاندنی کو خیال آیا کہ سب سے بڑا ہتھیار رذہا ہوتی ہے۔

اس عورت سے باتوں کے درمیان اس بات کا خیال آیا تھا، کوٹھری سے جب اسے باہر لے جایا جائے گا کہ اور آدم خور جب اس کو کھلوٹا بنائیں گے تب وہ اپنا ہتھیار استعمال کرے گی۔

اس نے سوچا کہ جب کوئی مرد اس کی طرف بڑھے گا تو اس کے پاس جو ہتھیار ہوگا وہ یہ کہ اپنا لباس نکال کر بے لباس کی حالت میں آجائے گی وہ چونکہ نہ صرف بے حد حسین اور بے پناہ پرکشش بھی۔۔۔۔۔۔ اس حالت میں مرد اسے دیکھ کر مہر ہو جائیں گے اور یہ عورتیں جل جائیں گی اس عورت کو دیکھ کر چاندنی کو اندازہ ہوا کہ ساری عورتیں یقیناً اس عورت کی طرح بد صورت، بد نما، موٹی بھدی اور بے کشش ہوں گی ان کی رنگت بھی کوئے کی طرح سیاہ ہو رہی تھی۔

جس جگہ اسے لے جایا جائے گا کہ جشن منائیں گے وہ یقیناً اس مکان سے باہر نکلی جگہ ہوگی۔ وہ بے

لباس ہونے کے بعد ہلکی پھلکی ہو جائے گی۔ اسے دوڑنے میں کوئی دشواری اور رکاوٹ نہیں ہوگی بلکہ اس کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی یوں بھی وہ تیزی سے بھاگنے میں بڑی مہارت رکھتی ہے کیونکہ اسکول سے لے کر یونیورسٹی میں وہ ہمیشہ چار سو میٹر کی ریس میں اول آتی رہی ہے یہ وحشی آدم خور دوڑنے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے چونکہ وہ ساڑھی میں ملبوس ہے اس لئے تیز رفتاری سے دوڑ نہ سکے گی پھر اس کے خوف ہراس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔

چند لمحوں کے بعد چاندنی نے اس سے کہا۔ ”ہمارے شہر میں گوشت کی ایسی ایسی چیزیں بھون کر پتی جاتی ہیں کہ اس کا ذائقہ، مزہ، اور لذت انسانی گوشت سے بھی بڑھ کر بھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ تم میرے ساتھ یہاں سے بھاگ کر چلو۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں روزانہ یہ گوشت کھلاؤں گی۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری چیزیں ایسی لذیذ ذہ ہوتی ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ کہیں بھی بھاگ کر نہیں جا سکتی اور نہ جانا چاہتی ہوں اس لئے کہ میں نے اس بستی میں جنم لیا ہے۔۔۔۔۔۔ اور پھر میرے ساتھی مجھے جانے نہیں دیں گے۔۔۔۔۔۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی یہاں رہ جاؤں اور تم لوگوں میں گھل مل جاؤں۔۔۔۔۔۔؟“ چاندنی نے جیسے ترپ چال چلی۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔؟“ وہ بولی۔

”ہم کسی اجنبی کو چاہے وہ مرد ہو یا عورت اپنے ساتھ کسی قیمت پر بسنا پسند نہیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔۔؟“

”وہ کس لئے۔۔۔۔۔۔؟“

”اس لئے کہ ہم جو آدمی کا گوشت کھاتے ہیں اس میں کسی کو صدمہ دار نہیں چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کیوں کہ یہ گوشت ہمارے لئے بھی بہت کم پڑ جاتا ہے۔“

چاندنی کی کچھ میں نہیں آیا کہ اس عورت کو کیسے

شخصے میں اتارے؟ یہ بہت تیز اور ہوشیار لگ رہی تھی، وہ چاہتی تھی کہ اس کے سامنے آنے سے پہلے اسے فریب دے کر اعتماد میں لے لے۔ کسی نہ کسی طرح جگرے سے باہر آ جائے۔ باہر آنے کے بعد وہ کسی تدبیر سے اس پر قابو پانے کی کوشش کرے گی اس کے لئے یہ آسان نہیں تھا کیوں کہ اس عورت کا جسم مردوں کی گھٹا ہوا اور مضبوط تھا اسے زیر کرنا آسان نہیں تھا وہ مرد مار جسم کی عورت تھی، یہ عورت ایک ہاتھ ماروے تو وہ بہت دیراٹھنے اور سنبھلنے کے قابل نہیں رہے گی وہ ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔۔۔۔۔ دوسرا دوسرا عورتیں گھس آئیں اسے دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی وہ سب بچرے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے گھورنے اور اپنی رال چکانے لگے۔

”ارے تو نے یہ شکار کہاں سے پکڑا ہے۔۔۔۔۔ تجھے کہاں ملا۔۔۔۔۔؟“ ایک مرد نے اس عورت کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے قریب کر لیا۔

”کتنی دیر ہوئی۔۔۔۔۔؟ تو خوش خبری سنانے آئی کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟“

اتنا کہہ کر وہ اس عورت کے چہرے پر جھک گیا۔۔۔۔۔ دونوں تھوڑی دیر تک جد جاتی ہوتے رہے۔

”زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔۔۔۔۔؟ تھوڑی دیر پہلے ہی تو ہاتھ لگی ہے۔۔۔۔۔ یہ مسافر عورت ہے۔۔۔۔۔ راستہ بھول کر ادھر آ گئی۔۔۔۔۔؟“ اس عورت نے اس مرد کے گلے میں جو اپنی مریں اور عریاں بانٹیں جاں کی ہوئی تھیں وہ اس کی آنکھوں میں بھانکنے لگی۔

”دیے تو نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جو اسے لا کر بچرے میں قید کر دیا ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

”جب ہم اسے بھون لیں گے تو تیرا انعام یہ ہوگا کہ اس کا جو حصہ عضو اور خطوط اور تناسب جتنا چاہے کھا سکے گی؟“ دیے یہ لڑکی جتنی حسین ہے اس کا گوشت بھی انتہائی لذیذ مذاق رکھتا دارا و مرے دار ہوگا۔۔۔۔۔ برسوں کے بعد زبردست شکار ملا ہے۔۔۔۔۔ اب تو ہمیں ہر طرح کا

جشن منانا ہوگا اسے دیکھ کر بھوک تیز ہونے لگی ہے۔“

اس دوران چاندنی نے ان ساتھی عورتوں کو دیکھا جن کا لباس نامناسب اور مختصر سا تھا۔ گوہ جواں سال تھیں اور ان کے تشیب و فزاز بیجان خیر تھے لیکن وہ سب کالی، بھلٹی، بہت ہی بد صورت اور بھیا تک لگ رہی تھیں وہ سب کی سب دروازہ قند تھیں وہ اسے بری طرح گھور رہی تھیں ان پر چاندنی کو چڑیلوں کا دھوکہ ہو رہا تھا۔

چاندنی کو یہ عورتیں چڑیلیں اور مرد بد روح نہیں لگ رہے تھے یہ وحشی قبائلی تھے ان کے منہ کو انسان کا گوشت لگ گیا تھا اس لئے یہ درندہ صفت اور خون آشام بن گئے تھے۔ آدم خور ہو گئے تھے یہ بد صورت اور بھیا تک اور چڑیل نما عورتیں اس کے حسن و شباب کو حسد و جلن اور رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ ایک نوجوان دو تیز ہے اپنی جان اور آبرو بچانے کے لئے بے لباس ہو کر کیا بھاگ سکے گی؟ اگر صرف عورتیں ہوتیں تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن یہ جو مرد تھے ان کے سامنے وہ کیسے بے لباس ہو کر فرار ہو سکتی ہے؟ لیکن اپنی زندگی بچانے کے لئے اسے اس بے چارے کی حالت میں آنا پڑے گا۔۔۔۔۔ ورنہ یہ دو دونوں مرد اس کے ساتھ جشن منائیں گے اور اس کی عزت کی دھجیاں اڑا دیں گے۔۔۔۔۔ پھر اس ذبح کر دیں گے۔۔۔۔۔؟

کون سی ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ اپنی عزت اور جان بچائے۔۔۔۔۔؟ وہ لباس میں تیز رفتاری سے دوڑنے سے رہی۔ اسے مرد اور عورتیں بھی تعاقب کر کے دیوچ لیں گے؟ قابو میں کر کے بے بس کر دیں گے؟

خوف و دہشت سے اس کا جسم لرزنے لگا۔ وہ عورتیں بچرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس آئیں اور اسے نرغہ میں لے لیا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ شاید اسے بے لباس کر کے گھر سے باہر لے جائیں گی۔ لیکن اسے بے لباس تو نہیں کیا البتہ ایک نے اس کی بانٹیں دبائیں۔۔۔۔۔ دوسری نے گلے سے نیچے ہاتھ پھیرتے

ہوئے کر بیان میں ہاتھ ڈال دیا۔۔۔۔۔

ان عورتوں نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ تاثر دیا تھا کہ انہوں نے چاندنی کے جسم کے گوشت کا حصہ اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔۔۔۔۔ اس پر ان کا حق ہے۔

بچرے کے باہر جو وہ دونوں مرد کھڑے ہوئے تھے ان میں سے ایک نے کہا۔

”اس کا سر ہم دونوں کا ہوگا۔۔۔۔۔ آنکھیں اور ناک اور کھوپڑی اور اس کے جسم میں جو کچھ بھی ہوگی اور وہ اس کے پاؤں بھی صرف ہمارے ہوں گے۔“

وہ عورت جس نے گھر میں لا کر بچرے میں قید کر دیا تھا وہ اپنے ساتھیوں سے بولی۔

”اب اس شکار کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر میدان میں لے چلو۔۔۔۔۔ اسے دیکھ کر اور اس کے بدن کی سوندھی سوندھی نوشہ کی مہک نے بھوک تیز کر دی ہے۔۔۔۔۔ کتنے مہرے کے بعد بلکہ برسوں کے بعد ایسا گلابی شکار ملا ہے۔“

”ہاں جلدی کرو۔۔۔۔۔“ ان مردوں میں سے ایک نے کہا۔

پھر وہ عورتیں اسے جبر و زبردستی اور سفاکی سے کھینچتی ہوئی مکان سے باہر لے آئیں۔

خوف و دہشت کی کیفیت میں بھی چاندنی نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

ایک سمت کوئی تیس چالیس قدم پر اسے ایک کھائی نظر آئی جو ایک پھاڑی کے دام میں تھی۔ اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ کھائی کتنی گہری ہے۔۔۔۔۔ مقابل جو سمت تھی اسے وہاں ایک گھٹا جنگل نظر آیا۔

اس کے دائیں بھائیں کھیت اور پگ ڈنڈیاں تھیں ایک ناہوار کچا راستہ جو ایک کھلے میدان میں جا رہا تھا اس میدان کے ارد گرد جھاڑیاں تھیں لمبی لمبی اور خاردار۔۔۔۔۔ جن کے عقب میں چھپ جانے والا نظر نہیں آتا تھا۔۔۔۔۔ ان جھاڑیوں کے درمیان جو راستہ

گزر رہا تھا اس کی حد نظر نہیں آ رہی تھی۔

چاندنی کو جس میدان میں کھڑا کیا گیا تھا اس سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر لاؤ تھا۔۔۔۔۔ اسے ذبح کرنے کے بعد یہ لاؤ روشن کر دیا جائے گا۔ اس لاؤ کے پاس لکڑیاں اور گھاس پھوس بھی تھی جو لاؤ کو دھکانے کے لئے رکھی ہوئی تھی وہ لاؤ شاید یہ وحشی سانپ، بچھو اور موسیٰ شاید بھون کر کھاتے تھے۔۔۔۔۔ وہاں بہت ساری راکھ بھی موجود تھی۔

چاندنی کی میدان کے وسط میں کھڑا کر دیا گیا۔۔۔۔۔ دونوں مرد عورتیں دائرہ بنا کر کھڑی ہو گئیں تاکہ تماشا دیکھ سکیں چاندنی نے خود پر اور اپنے حواس پر قابو پایا تھا۔۔۔۔۔ اب وہ اس قدر خوف زدہ نہیں تھی اور نہ ہی ڈرتی تھی۔۔۔۔۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ یہ بھینٹ یا مرد اپنے گھناؤنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

ایک مرد نے بھیڑے نکل کر اپنی لمبی اور گھنی اور خوف ناک مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

”اے عورت۔۔۔۔۔ تو اپنے پکڑے اتار دے تاکہ میں تجھ سے کھیل سکوں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں نہیں اتاروں گی۔۔۔۔۔ میں عورت ہوں۔“ چاندنی نے جواب دیا۔

”عورت۔۔۔۔۔؟“ وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔

”یہ سب عورتیں ہیں۔۔۔۔۔ صرف اشارے پر پکڑے اتار دیتی ہیں۔“

پھر اس نے ان عورتوں کی طرف دیکھا اور ان سے حکمانہ لہجے میں کہا۔

”تم سب اپنے پکڑے اتار دو۔۔۔۔۔ تاکہ یہ بھی اپنے پکڑے اتار دے۔۔۔۔۔؟“

ان سب عورتوں نے ایک ایک کر کے اپنے پکڑے اتار کر ایک طرف پھینک دیئے۔۔۔۔۔ وہ سب حیوان کی حالت میں ہو گئی تھیں، ان کے جسم پر، تن پر ایک دگی تک نہیں رہی تھی۔



”دیکھو..... ان سب نے اپنے اپنے کمرے اتار دیے ہیں..... اب بھی اتار دو.....“ مرد فرمایا۔  
 ”میں کسی قیمت پر اپنے کپڑے نہیں اتاروں گی.....“ چاندنی نے غصے سے کہا۔  
 اس مرد نے ان عورتوں سے کہا۔  
 ”تم سب مل کر اس کے کپڑے اتار دو.....“  
 پھاڑ دو..... یہ بڑے خڑے دکھا دی ہے.....؟“  
 عورتیں جب چاندنی کی طرف بڑھنے لگیں اس عورت نے چیخ کر جس نے اسے لاکر بنجرے میں قید کیا تھا بڑبائی کیجھ میں کہا۔  
 ”نہیں..... نہیں..... اس کا لباس نہ اتارو اور نہ ہی پھاڑو.....“  
 ”وہ کس لئے تم منع کر رہی ہو.....؟“ اس مرد نے کہا۔  
 ”تمنا شد دیکھنے میں لطف نہیں آئے گا.....؟“  
 ”اس لئے کہ اس کا لباس بہت اچھا، خوب صورت اور شان دار ہے..... ہمارے پاس ویسے ہی کپڑے نہیں ہیں..... اور پھر اس لڑکی کے گوشت پر نہ صرف میرا حق ہے بلکہ اس کے کپڑوں پر بھی۔“ عورت نے جواب دیا۔  
 ”میں نے اگر اس کے تن پر سے کپڑے اتارنے کی کوشش کی تو خڑے دکھائے گی اور پھر اس کے کپڑے پھٹ سکتے ہیں۔“ مرد نے کہا۔  
 سادھی مرد نے اس مرد سے کہا۔  
 ”میں اس لڑکی کو بوجھ کر قابو میں کرتا ہوں..... تم آ کر اسے لباس سے محروم کر دو۔“  
 وہ مرد اسے کسی درندے کی طرح گھورتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اس سے تین چار قدم دور تھا کہ وہ ٹھوکر کہا کر منہ کے بل گر پڑا۔ پھر چاندنی نے بل بھر کی تاخیر بھی نہیں کی اس کے منہ پر لات رسید کی اور ان عورتوں کی طرف بڑھی تاکہ ان کے درمیان سے گزر جائے دوسرا مرد چاندنی کو دبوچنے کے لئے بڑھا تو چاندنی نے ایک لات اس کے پیٹ میں پوری قوت سے رسید کی

تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، زمین بوس ہو گیا۔  
 اس کے راستے میں جو عورتیں جاگلی ہو رہی تھیں ایک دم سے خوف زدہ ہو کر تیزی سے ہٹ گئیں۔  
 پھر چاندنی نے ساڑی کو گھٹنوں سے اوپر اٹھا کر چدرہ منہ اٹھا اور بھاگی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ سر اسکی کے باعث وہ کھائی کی طرف آگئی ہے.....  
 پھر اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا..... وہ مرد اور عورتیں چیختی چلاتی ہوئیں اس کے تعاقب میں آ رہی ہیں..... وہ غصے سے جاگل ہو رہی ہیں۔  
 چندھوں کے بعد اس نے خوف دہرا اس کی کیفیت میں ایک ایسا منظر دیکھا جو اس کے لئے ناقابل یقین تھا۔ وہ تیز زدہ ہو کر رہ گئی۔ سانسوں کے زبردست سے اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں..... سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا، اسے ایسا لگ رہا تھا کہ سینہ شق ہو جائے گا، اس کا دل باہر نکل آئے گا۔  
 وہ دونوں مرد اور عورتیں اندھوں کی طرح فضا میں ہاتھ چلا رہی تھیں۔  
 وہ عورت جس نے اسے بنجرے میں قید کیا تھا وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔  
 ”میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے..... مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے.....؟“  
 ”میں بھی اندھی ہو گئی ہوں.....؟“ دوسری عورت نے کہا۔  
 ”مجھے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے.....؟“ تیسری عورت نے چیخ کر کہا۔  
 ”میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے..... کچھ بھائی نہیں دے رہا ہے۔“ چوتھی عورت نے کہا۔  
 ”میری بیٹائی کو کیا ہو گیا ہے.....؟ تم سب کہاں ہو.....؟“ ایک مرد نے کہا۔  
 ”کچھ خبر نہیں.....؟ میں بھی اندھا ہو گیا ہوں.....“  
 لگتا ہے کہ یہ عورت کوئی جادوگرنی ہے جس نے جادو سے ہم سب کو اندھا کر دیا ہے.....؟“ دوسرے مرد نے کہا۔

”اسے جلدی پکڑ لو..... جانے نہ دو.....“  
 ”وہ دکھائی ہی نہیں دے رہی ہے تو اسے کیسے پکڑیں.....؟“ پہلے مرد نے کہا۔  
 یہ امر نہایت حیرت انگیز ناقابل یقین اور سنسنی خیز تھا کہ ٹھوڈی ہی دیر میں وہ دونوں مرد اور عورتیں دیکھتے ہی دیکھتے ہی پاگل ہو گئے تھے۔ پھر وہ سب ایک ایک کر کے کھائی میں گرے گئے فضاء جوان کی دل خراش چیخوں سے گونج رہی تھی وہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتی گئیں پھر ایک بے کراں سانسٹا جھانک گیا۔  
 چاندنی جو اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہوئی تھی اسے ایسا لگا کہ جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔  
 جب اس کا سینہ اور سانسیں اعتدال پر آئیں تو کھائی کی طرف بڑھی اور پھر اس نے کھائی میں جھانک کر دیکھا۔  
 یہ کھائی کوئی سوٹ گہری تھی نیچے ان آدم خور مرد اور عورتوں کی لاشیں خون میں لت پت اور بکھری پڑی تھیں ان سب کا حشر شر ہو گیا تھا ان سب کے سر پھٹ گئے تھے جسموں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں ان کے ہاتھ پیرو بھی سلامت نہ رہے تھے کھائی میں جو خونخوار درندے تھے وہ سب ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔  
 یہ آدم خور مرد اور عورتیں جو اس کا تماشا دیکھنے والے تھے وہ خود تماشا بن گئے تھے۔  
 ان درندوں نے اس کا گوشت بھون کر کھانے کے لئے اسے ذبح کرنے والے تھے۔ لیکن کھائی میں ان کی لاشیں بکھری پڑی ہوئی تھیں درندے مزے لے لے کر ان کا کچا گوشت کھا رہے تھے۔  
 وہ ایک کھنے درخت کی چھاؤں میں اس کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔  
 وہ سوچنے لگی کہ اب کہاں جائے.....؟ یہ بستی جو بڑی پر اسرار اور خوف ناک دادی کی طرح ہے اس سے باہر جتنا جلد از جلد ہو سکے نکل جائے..... وہ بے عزت اور بے آبرو ہونے سے بال بال بچی تھی وہ

دونوں مرد اس کی بے حرمتی کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اسے فنا کر دیا جاتا اور پھر اسے بھون کر کھا جاتے اور وہ ان سب کا لقمہ بن جاتی.....؟  
 ایک بات جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور محمد بن غنی تھی کہ وہ آدم خور صفت مرد اور عورتیں اندھے یک لخت کیسے بن گئے تھے اگر وہ اندھے نہیں ہو جاتے تو وہ ان کے ہاتھوں سے کسی قیمت پر بچ نہیں پاتی..... اس نے اپنی زندگی میں شاید کسی کے ساتھ بھلائی کی ہوگی کہ جو آج اس مصیبت کی گھڑی میں کام آگئی اور آتی جا رہی ہے..... کیا کسی نادیدہ ہستی نے اسے وہ اس کی عزت و آبرو اور زندگی بچائی ہے۔  
 پھر وہ ابھی اور اس نے اپنا سفر جاری رکھنے اور اس آسپاسی بستی سے نکل جانے کا فیصلہ کیا..... اب وہ یہاں رک کر کیا کرے گی؟ ہر طرف اسے موت رتھماں نظر آ رہی تھی کسی بھی لمحے موت اسے نکل سکتی تھی۔  
 وہ شمالی جنوب کی طرف چل پڑی کہ شاید اسے کوئی بڑی شاہراہ مل جائے۔ بڑی شاہراہوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت دن رات رہتی تھی شاید کوئی بس اڈہ یا ریلوے اسٹیشن بھی قریب ہو، ایک آس اور موہوم سی امید پر چلنے لگی اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں رہا تھا..... اور پھر اسے بڑے زور کی جھوک لگ رہی تھی۔  
 ایک کھٹنے کی مسافت طے کرنے کے بعد اسے ایک کٹیا نظر آئی تو وہ دبے پاؤں اور بے آواز کٹیا کی طرف بڑھی کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے اندر کوئی بلایا آدم خور ہو، کوئی چیل، بدروح اور سربریدہ لاش..... اس کٹیا کے علاوہ کوئی گھریا غارت نظر نہیں آئی۔  
 اس کی نگاہ کٹیا کی دیوار پر پڑی، اس میں درمیان میں ایک بھری سی تھی، اس نے جھری سے اندر جھانکا اندر ایک کمرہ تھا اور اس کے ایک کونے میں چار پائی تھی، اس پر ایک میلا پچھلا سا بستر بچھا ہوا تھا ایک کونے میں پانی کا گھڑا، چولہا اور کچھ برتن دکھائی دیے، پھر وہ کٹیا کے اندر گھس گئی کہ شاید کھانے کو کھیل جائے۔  
 ایک پتیلی جو گھڑے کے پاس رکھی تھی اس کا

ڈھکن اٹھایا ڈھکن اٹھاتے ہی اس کا خون جیسے خشک ہو گیا۔ وہ برتن خون سے بھر اہوا تھا اور اس میں دو انسانی آنکھیں اور کو تیرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور پھر وہ آنکھیں مسکرانے لگیں تو چاندنی فوراً ہی کٹیا سے نکل کر چہرہ مندا اداہر تیزی سے دوڑنے لگی۔

وہ اس قدر ڈری اور خوف زدہ ہوئی تھی کہ کچھ دیر بعد وہ بڑی شاہراہ پر آئی اس قدر حواس باختہ ہو رہی تھی کہ مخالف سمت سے تیزی سے آنی ہوئی کار کو دیکھ نہ سکی۔ سڑک پار کرنے لگی تو کار سے ٹکرا گئی، کار چلانے والے نے احتیاط نہیں برتی اور بریک نہ لگایا ہوتا تو وہ اس کے پیچے کی زد میں آ کر پکلی جا چکی ہوتی۔ کار کی ٹکڑ سے وہ گر کر بے ہوش ہوئی۔

اور پھر وہ کتنی دیر بے ہوش رہی اسے اندازہ نہ ہو سکا جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بڑی اور آرام دہ مسہری کے بستر پر دراز پایا۔ پہلے وہ یہ سمجھی کہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے دوسرے لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے وہ کسی گھر کے بیڈ روم کے بستر پر دراز ہے۔

اس نے گردن گھما کر دیکھا اس کے سامنے بڑے صوفے پر اس کی ہم عمر تین لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں وہ نہ صرف نوجوان بلکہ حسین اور دلکش خدو خال کی تھیں اسے بیدار دیکھ کر اس کے پاس آ گئیں۔

”اب آپ کیسی ہیں؟“ اس لڑکی نے سوال کیا جو گلابی لباس میں ملبوس تھی اس نے پوچھا۔

”میں..... بالکل ٹھیک ہوں.....؟“ چاندنی نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”آپ لیٹی رہیں.....“ اس لڑکی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے نہیں دیا۔

”ہم بہت پریشان تھیں کیوں کہ آپ دو تین دن سے بے ہوش تھیں لیکن حالت خطرے سے باہر تھی۔“

آپ کی بے ہوشی تشویش کا باعث تھی۔“

”کیا آپ نے خودکشی کی کوشش کی تھی؟ کیا میں اس کی وجہ معلوم کر سکتی ہوں.....؟“

”نہیں.....“ چاندنی نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں واقعی طور پر بہت پریشان تھی اس لئے سڑک پار کرتے ہوئے میں گاڑی دیکھ نہ سکی تھی۔“

گاڑی کے بریک نہ لگنے کو میں شاید بخیر نہ پائی۔“

تیسری نے بڑے پیار سے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”آپ کتنی پیاری ہیں..... ایسا لگ رہا ہے کہ میں چودھویں کے چاند کو اس کمرے میں دیکھ رہی ہوں.....“

”آپ لوگ کون ہیں.....؟ آپ کتنی اچھی اور عظیم ہیں، کوئی اور ہوتا تو مجھے علاج کے لئے نہ لاتا اور نہ ہی میری زندگی بچاتا اور وہ بھاگ جاتا کہ کہیں پولیس کیس نہ بن جائے کیا آپ ختیوں نہیں ہیں.....؟“ چاندنی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہم ختیوں سہیلیاں ہیں..... بچپن کی سہیلیاں اور ایک دوسرے کو کئی بہنوں سے بھی بڑھ کر چاہتی ہیں۔“ گلابی لباس والی بولی۔

”میرا نام شیلا ہے، یہ جو بڑا دن لباس میں ملبوس ہے اس کا نام مونا ہے، یہ تیسری ستارہ ہے.....“

”آپ کا نام کیا ہے.....؟“

”میرا نام چاندنی ہے۔“ چاندنی نے بتایا۔

”آپ کا نام جس نے بھی رکھا بالکل صحیح رکھا ہے۔“ شیلا نے اس کے چہرے پر جھک کر چوم لیا۔

”آپ چودھویں کا چاند ہیں ایسا لگتا ہے کہ بنانے والے نے آپ کو فرمت میں بنایا ہے.....“

”میری اتنی تعریف نہ کریں۔“ چاندنی مسکرائی۔

”میں اس وقت کہاں ہوں.....؟“

”آپ میرے ہاں ہیں.....“ شیلا نے جواب دیا۔

”آپ کو اسپتال یا کسی کلینک لے جاتے تو پولیس سوالات سے ناک میں دم کرویتی اور رشوت

مہی مانگتی..... میری ایک دوست ڈاکٹر سرجن ہے اسے گھر بلا کر دکھایا..... اس نے کہا خطرے کی بات نہیں ہے سر میں اندرونی چوٹ آئی ہے دو ایک دن میں ہوش میں آ جائیں گی۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ آپ ایک بد نصیب گوانتی محبت اور پیادریں کی.....؟“ چاندنی نے اداسی سے کہا۔

”آپ اور بد نصیب.....؟“ شیلا نے حیرت سے پکلیں جھپکائیں۔

پھر چاندنی نے ان ختیوں کو اعتماد میں لے کر اپنی حیرت انگیز اور درد بھری کہانی سنائی۔

☆.....☆.....☆

چاندنی نے اس شہر میں سکونت مستقل طور پر اختیار کر لی تھی۔

اس لئے کہ دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا تین برس قبل اس کے ماں باپ دنیا سے روکھ گئے تھے، نہ بھائی تھا اور نہ ہی بہن، رشتہ دار بہت دور کے تھے، شیلا نے راجو کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ اس نے کسی ماڈل گھر سے شادی کر لی ہے۔ چاندنی کو بہت دکھ ہوا اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس کا محبوب ہر جانی اور خود غرض لکھے گا۔

شیلا، مونا، اور ستارہ اس کی مخلص اور بے حد چاہنے والی سہیلیاں بن گئی تھیں ان کی محبت و دوستی اور رفاقت میں اس نے اپنے دل سے راجو کی محبت نکال دی اسے شہر میں شیلا نے جو کمرہ کرایہ پر دلایا تھا وہ اس کے دور کے رشتہ داروں میں سے تھے اس مکان کے ٹپلے حصے میں دو میاں بیوی رہتے تھے وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے کرایہ پرانے نام ہی تھا کیونکہ چاندنی ان کا ہر طرح سے خیال رکھتی اور ان کی اس طرح سے خدمت کرتی تھی جیسے وہ اس کے سنے ماں باپ ہوں اور وہ ان کی بیٹی ہو کھانا بھی دیتی دیا کرتی تھی اور کپڑے دھوتی بھی مٹی وہ بھی اپنی سگی بیٹی کی طرح چاہتے تھے پہلے وہ ہوسٹل میں کچھ دن رہی تھی پھر اس مکان میں آ گئی تھی

اس نے جوبی کام کا امتحان دیا ہوا تھا اس کا نتیجہ آچکا تھا اس نے امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی۔

شیلا نے اس کی مالی امداد کی تھی نتیجہ آئے تک وہ دو تین ٹیوشن کرتی رہی تھی۔ اب وہ ملازمت کر کے اپنی زندگی اور مستقبل بنانا چاہتی تھی شادی کر کے گھر بسانا چاہتی تھی۔ شادی کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ وہ چاڑے کی چاندنی تھی۔ لڑکے والوں کو لین دین اور چہیز کی بڑی ہوس ہوتی ہے، ماسٹر جی نے اسے برائے نام مکان کرایہ پر دے کر بڑا احسان کیا تھا کسی کسی مہینے وہ کسی نہ کسی بہانے سے کرایہ نہیں لیتے تھے۔ اس کی ذات پر انہوں نے جو احسان کیا تھا وہ آخری سانس تک نہیں بھول سکتی۔ وہ انہیں ماسٹر جی کہتی تھی۔ انہوں نے ایک اسکول میں تیس برس پڑھایا ہوا تھا وہ یہ بات ابھی طرح جانتی تھی کہ اس کی شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک اس کے پاس سونے کے زیورات، کپڑے، پہاڑے، کھانا اور لڑکے کو جوڑے میں دہنے کے لئے رقم نہ ہو۔

چاندنی صبح دس بجے انٹرویو کے لئے گھر سے نکلی۔ وہ ریڈ اسکواڈ کی عمارت کے سامنے رکشے سے اتری اس میں منزل وسیع و عریض پر شکوہ اور عظیم الشان عمارت میں ہر قسم اور ہر طرح کے سینکڑوں دفاتر تھے۔ یہ عمارت جدید ترین تھی اس میں سبک رفتار متعدد لفٹیں تھیں جو ہر وقت مصروف رہتی تھیں۔ اس کا دیدار ایسا تھا کہ چاندنی احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک عام سی لڑکی ہے کیا اسے اس فرم کے دفتر میں ملازمت مل جائے گی جو ملتی بھٹکتی ہے گوکہ اس نے اپنے صوبے میں امتحان میں ٹاپ کیا تھا لیکن اس کے پاس صرف اعلیٰ تعلیم کی سند ہی لیکن تجربہ کوئی نہیں تھا۔ اسے اس کی ایک سہیلی نے بتایا تھا کہ تجربہ بہت ضروری ہوتا ہے اس کے بغیر ملازمت کا ملنا ناممکن ہوتا ہے۔ یا پھر سفارش ہو لیکن وہ بہت اونچی..... عام سفارش کی کام کی نہیں ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتنے لڑکے لڑکیاں اور عورتیں ملازمت کے لئے ماری ماری پھر رہی ہیں وہ

روز ہی اخبار دیکھتی اور ضرورت ہے کا اشتہار پڑھ کر درخواست بھیج دیا کرتی تھی اس نے ایک اخبار میں اس ملٹی فرم میں ضرورت ہے کا اشتہار دیکھ کر درخواست بھیج دی تھی اس کے باوجود اس میں لکھا ہوا تھا کہ کم از کم پانچ برس کا تجربہ ہو، جبکہ اسے پانچ گھنٹے کا بھی تجربہ نہ تھا۔ اسے انٹرویو کے لئے کال کر لیا گیا تو اسے یقین نہیں آیا حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ انٹرویو لیٹر کو اس نے پچاس بار اس خیال سے پڑھا تھا کہ کہیں غلطی سے اس کے نام تو نہیں آ گیا ہے؟ پھر وہ انٹرویو لیٹر لے کر شیلہ کے ہاں پہنچی۔

شیلہ نے اس کا انٹرویو لیٹر دیکھ کر کہا۔ ”چاندنی..... تو بڑی خوش نصیب ہے یہ تو ملٹی پٹیشنل فرم ہے اس کی شاخیں دہلی، سعودی عرب اور یورپ میں تک پھیلی ہوئی ہیں اور اس کا ہیڈ آفس امریکہ میں ہے اگر تجھے اس فرم میں ملازمت مل گئی تو مجھے لے کہ تیری زندگی خوشحال اور مستقبل تابنا کی بن گیا۔“

”لیکن مجھے اس کی کوئی امید نہیں..... میں نے اندھیرے میں میں تیر چلایا تھا، میں اتنا چاہتی ہوں کہ خواب میں بھی اس فرم میں ملازمت ملنے سے رہی۔“

”تو کیوں مایوسی اور ناامید ہو رہی ہے؟“ شیلہ نے کہا۔

”اس لئے کہ میری پڑوین کبہر ہی تھی جو ایک فرم میں جاب کرتی ہے..... کہ بغیر تجربے کے کسی طور میں بھی ملازمت نہیں ملتی..... اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں.....؟“ چاندنی روہاںسی ہو گئی۔

”وہ سچ کبہر ہی تھی، اس نے غلط نہیں کہا۔“

”کیا میں انٹرویو پھاڑ کر پیچیدہ دو.....؟“

”تم اپنا دل چھوٹا کیوں کر رہی ہو.....؟“ شیلہ نے دلاسا دیا۔

”یہ مقدار کی بات ہوتی ہے.....؟ حوصلہ نہ ہارو چاندنی.....؟“

”مکمل کی کتنی ایسی لڑکیاں ہیں جو برسوں سے ملازمت کی تلاش میں خوار ہو رہی ہیں۔ روزانہ کہیں نہ

کہیں انٹرویو دینے جاتی رہتی ہیں۔“

”سن..... ان باتوں میں کیا رکھا ہے.....؟ اچھا یہ بتا کہ تو کس لباس اور وضع قطع میں انٹرویو دینے جا رہی ہے.....؟“

”میرے پاس جو لباس ہے وہی پہن کر جاؤں گی.....؟“ چاندنی نے جواب دیا۔

”کیا تیرا دماغ چل گیا ہے.....؟“ شیلہ سنجیدہ ہو گئی۔

”یہ بات کیوں بول رہی ہے کہ تو آیا کی ملازمت کے لئے نہیں بلکہ ایک اعلیٰ فرم میں ملازمت کے لئے جا رہی ہے..... دفتر کا چہرہ ہی تو تجھے اندھکھنے بھی نہیں دے گا..... کیا تو نہیں دیکھ رہی ہے کہ گھروں میں کام کرنے کے لئے جولاکیاں اور جوان سال معمر اور بڑھی ہوئی عورتیں کام کرنے جاتی ہیں وہ کیسے تنگ و چست لباس میں لبوس ہوتی ہیں۔“

”ارے مجھے دیکھنے کے لئے لڑکے والے تھوڑی آ رہے ہیں جو میں بن ٹھن کر جاؤں.....؟“ چاندنی ہنس پڑی۔

”ارے میں انٹرویو دینے جا رہی ہوں میری جان.....“

”حق کی اماں..... آج کل انٹرویو دینے کے لئے اس طرح جانا پڑتا ہے جس طرح لڑکے والوں کے سامنے ایک لڑکی بولڈ انداز سے جاتی ہے..... اس لئے کہ دنیا بہت آگے چلی گئی ہے اور بہت تیزی سے جا رہی ہے..... جو وقت کے ساتھ چلتا اور اس کے تقاضے پورے کرتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے۔“

”تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں.....؟“ چاندنی نے کہا۔

”بولڈ انداز سے وہ لڑکیاں جاتی ہیں جو مقابلہ حسن میں شرکت کرنے جاتی ہیں۔“

خبر چاندنی نے شیلہ کے مشورے پر عمل نہیں کیا تھا..... جب اس نے شیلہ کا دیا ہوا لباس پہن کر سنگار میز کے آئینے میں خود کو دیکھا تو اسے ایسا لگا تھا

کہ جیسے وہ بنا لباس کے ہے۔ اسے خود سے شرم آنے لگی۔ غسل خانے میں آزادی سے نہانا اور بات بھی اس لباس میں لبوس انٹرویو دینے جانا اس کے لئے محبوب بات تھی۔ اسے اس بات پر بڑا ناچب ہوا تھا کہ شیلہ اس نامناسب لباس میں انٹرویو دینے کیسے چلی گئی تھی؟

اس نے سفید ساڑی اور استیوں والا بلاؤز ہی پہنا وہ ہر طرح کا لباس پہنتی تھی لیکن اسے ساڑی والا لباس زیادہ پسند تھا، بالوں کا چھوٹا سا جوڑا بنایا اس نے نڈ تو میک اپ کیا اور نہ ہی کوئی خوشبو لگا لی وہ بڑی سادگی سے تیار ہو کر دفتر پہنچ گئی تھی۔ شیلہ اسے اس عالم میں دیکھتی تو اپنا ماتھا پیٹ لیتی۔

استقبال پر جوان عورت بیٹھی تھی اس نے حیرت اور ناقدانہ نظروں سے چاندنی کو اوپر سے نیچے تک اس طرح سے دیکھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو..... وہ کہے

بنا نہ رہ گئی تھی۔

”کیا آپ اس معمولی سی جاب کے لئے آئی ہیں.....؟“

”جی ہاں.....“ چاندنی نے اپنا خوش فہم ہلا دیا۔

”جاب تو جاب ہوتی ہے.....؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ معمولی یا بڑی ہو..... اگر یہ جاب مل گئی تو میرے لئے اس لئے خوش نصیبی ہوگی کہ یہ پہلی ہوگی؟“

”سوال یہ ہے کہ آپ کو دفتر میں جاب کرنے کی کیا ضرورت ہے.....؟“ وہ عورت کہنے لگی۔

”آپ جیسی لڑکی کے لئے اس جاب کی کیا ضرورت اور اہمیت رہتی ہے۔ جو تنخواہ ملے گی اس سے شاید ہی آپ گزارہ کر سکیں؟“

”اس لئے کہ میں ایک ضرورت مند عورت ہوں..... جاب کر کے کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لوں گی اس لئے انٹرویو دینے آئی ہوں۔“

”آپ نہ صرف نہایت حسین و جمیل بلکہ غیر معمولی پرکشش ہیں میرا غصہ نہ مشورہ تو یہ ہے کہ جاب کرنے کی بجائے آپ شوہر کی دنیا میں چلی جائیں دفتر

کی نوکری میں کیا رکھا ہے.....؟ آپ کو کسی فلم یا ڈرامہ سیریل میں چانس مل جائے گا تو دولت، عزت اور شہرت آپ کے قدم چوم لے گی۔“

لیکن مجھے فلم اور ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں ہے، میں دولت، عزت اور شہرت کے پیچھے بھاگنا بالکل میں پسند نہیں کرتی ہوں اس لئے میں نے بھی مجولے سے بھی شوہر کے بارے میں سوچا ہے۔“

وہ کس لئے.....؟“ عورت کے چہرے پر حیرت سی چھا گئی۔

”اس لئے کہ شوہر غلاطت سے بھرا دلدل ہے۔ میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ وہی لڑکی ان کا رہ بنتی ہے جو اپنا سب کچھ سوئپ دے اور اوپر سے نیچے تک ہر کی کو خوش کرے.....؟“ چاندنی نے جواب دیا۔

”آپ تو دقیانوسی اور سوئپس پہلے کی عورت کی طرح بات کر رہی ہیں..... اصل بات اور حقیقت یہ ہے کہ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے مجھے آپ کی کسی بات سے انکار اور اختلاف نہیں ہے..... عزت، آبرو اور عصمت کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے، اب ایسا دور ہے کہ ماں باپ یہ جانتے ہوئے بھی اپنی بیٹی، بہن اور بہو کو کبھی اس عمری میں خوشی خوشی بھیج دیتے ہیں تاکہ دولت سے اپنے ارمان اور خواب پورے کر سکیں۔“

”دراصل ہر شخص کی سوچ مختلف ہوتی ہے اور اس کا مزاج بھی الگ ہوتا ہے۔ ویسے میں آپ کی بات پر سنجیدگی سے غور کروں گی آپ کی باتیں بڑی حقیقت پسندانہ ہیں۔“ چاندنی نے کہا۔

اس عورت نے چہرہ ای سے کہا کہ یہ مس انٹرویو دینے آئی ہیں پھر چہرہ اسی چاندنی کو اس کمرے میں لے گیا جس میں لڑکیاں اور عورتیں انٹرویو دینے کے لئے بیٹھی ہوئیں اپنی باری کی منتظر تھیں وہ بھی اس جاب کی امید دار تھیں انہوں نے حیرت، حسد و رشک اور ظلم سے چاندنی کو دیکھا ان امید داروں میں وہ واحد لڑکی تھی جو اس قدر سادگی سے آئی تھی۔ ورنہ ہر لڑکی عورت خوب



## سرعام عاشق کی دھلائی

محبوبہ کی فرمائش پوری نہ کرنا یقیناً خطرے سے خالی نہیں لیکن کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس غلطی کا ایسا بھیاں تک نتیجہ نکل سکتا ہے جو ایک مظلوم چینی نوجوان کو دیکھنا پڑ گیا۔ سوشل میڈیا پر حال ہی میں ویڈیو اپ لوٹ کی گئی ہے جس میں ایک لڑکی کو اپنے ساتھی نوجوان پر ناقابل تصور ظلم کرتے دکھایا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یہ جوڑا ایک مارکیٹ میں پھولوں کی ریڑھی کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ لڑکی نے پھل خریدنے کی فرمائش کی جسے لڑکے نے پوری کرنے سے انکار کر دیا جس پر لڑکی غصے میں آگئی اور جھگڑنے لگی۔ اسی دوران کسی نے موبائل فون سے ویڈیو بنانا شروع کر دی، جس میں لڑکی کو غصے سے پھنکارنے سنا جاسکتا ہے ”تم پھل خرید رہے ہو یا نہیں؟“ جب لڑکی نے آخری بار یہ سوال کیا اور نوجوان نے پھر انکار کیا تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئی اور اپنی دائیں ٹانگ کو ہوا میں گھماتے ہوئے پوری قوت سے نوجوان کو کنگ مار دی۔ غصے سے بھری لڑکی کو اس پر بھی چین نہ آیا اور اس نے گرے ہوئے نوجوان پر لاتوں سے حملہ جاری رکھا جب کہ اس دوران وہ مسلسل چلاتی رہی ”تم پھل خرید رہے ہو یا نہیں؟“ پچھارے نوجوان کی حالت غیر ہوتے دیکھ کر پھل فروش اور دوسرے افراد نے زمین پر گرے ہوئے نوجوان کی جان بچائی۔ اس ویڈیو کو انٹرنیٹ پر ہزاروں بار دیکھا جا چکا ہے اور اکثر انٹرنیٹ صارفین تشدد کا نشانہ بننے والے نوجوان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کر رہے ہیں۔

(حسن علی - کراچی)

نہیں ہے جو ہمارے معیار کی ہو۔ شاید اس لئے کہ ایسا لگا تھا کہ وہ انٹرویو دیتے نہیں بلکہ اپنے جسم کی نمائش کرنے کے نامناسب لباس میں آئی ہیں شاید اس بات نے مجھے غفر کر دیا تھا پھر اس لڑکی کا انتخاب کرنے کا دل چاہتا ہے کوئی تجربہ نہیں تھا میں نے اس لئے ترجیح دی کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔“

”اس لڑکی نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا تو میرا دل رواں خوشی سے جھوم اٹھا اور وہ مجھے ایسا لگا کہ جیسے دو دھیا چاندنی کا جھنڈو دیا آ گیا ہو۔ میرے دل نے کہا کہ یہ لڑکی اہل ہو یا نہ ہو اسے رکھ لینا چاہئے، اگر وہ بچ بچ کی ناکن ہوئی تو وہی حال میرا ہوتا جو اسے دیکھتے ہی ہوا تھا۔“ امرت بیگ نے کہا۔

”جی پوچھیں تو اس ناکن چینی لڑکی نے ہم تینوں ہی کو ڈس لیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم تینوں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ صرف اسے ملازمت پر رکھیں گے چاہے وہ اہل ہو یا نہیں۔“ آکاش نے کہا۔

”لیکن جاتے جاتے وہ جادو کر گئی۔“ ڈی ایس ملک نے کہا۔

”اس کے سوندمی سوندمی خوشبو سے ابھی تک کمرہ مہک رہا ہے اور دل و دماغ معطر ہو رہا ہے۔“

”لیکن ایک بات غور طلب اور فکر کی ہے۔“ امرت بیگ نے کہا۔

”اس نے ہماری بات نہیں مانی اور ہمارے منصوبے پر عمل کرنے کو تیار نہ ہوئی تو وہ مقصد ہی پر کار ہو جائے گا جس کے لئے اسے رکھا جا رہا ہے۔“

”لیکن ہم غلط سے کام نہیں لیں گے۔“ سیدھی اہلی سے بھی نہیں نکلتا ہے تو کیا کیا جاتا ہے۔“ آکاش نے سوالیہ نظروں سے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

”اگر ہم نے غلط بازی کی تو پھر سب کچھ دھارہ جائے گا ہمیں یہ کام غیر محسوس انداز سے دھیرے دھیرے کرنا ہوگا۔ سکون وطمینان سے۔۔۔۔۔ جب وہ یہاں آئی گئی ہے تو جائے گی کہاں۔۔۔۔۔“

سے اتنی دیر کس لئے لیا گیا؟ جب وہ کمرے سے باہر آئی تو اسے ایسا لگا کہ اس کے سرے جیسے منوں بوجھ اتر گیا ہو اور اس کے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو گئے ہوں۔ جب وہ اس کمرے سے نکل کر استقبالیہ کمرے کی طرف جا رہی تھی تب اس نے اس دفتر کے کمروں اور اس ہال کا بھی جائزہ لیا تھا جس میں بہت سارے وہ لڑکیاں عورتیں اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔ چاندنی جیسے ہی اس کمرے سے لگی تو آکاش نے کہا۔

”کتنی سندر لڑکی تھی، یوں تو ہم آئے دن ایک سے ایک حسین لڑکیاں دیکھتے رہتے ہیں لیکن میں نے شاید ہی ایسی حسین لڑکیاں دیکھی ہیں اگر کوئی دیکھی ہے شاید ہی۔۔۔۔۔ وہ اتنی حسین ہے کہ باہر نکلتی ہے تو ہر مرد اسے بار بار لڑکے بھینچتا ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔۔۔“ امرت بیگ نے تائیدی لہجے میں کہا۔

”لیکن میں نے ایسی سن مونی لڑکی شاید ہی دیکھی ہو البتہ میں نے افریقہ، بنگال، ہندوستان اور آسام کے جنگلوں میں بہت ساری حسین لڑکیاں دیکھی ہیں کہ ان کا مقابلہ کوئی بھی حسین عورت نہیں کر سکتی لیکن اس لڑکی کے حسن کے آگے ان کا حسن بھی ماند پڑ جائے۔“

”کیسا عجیب و غریب اور حسین اتفاق ہے کہ ایک حسین ناکن بلکہ ناگوں کی ملکہ انٹرویو دینے کے لئے دفتر میں کھس آئی ہم لوگوں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک حسین ناکن سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔“ ڈی ایس ملک نے کہا۔

”ہمیں ایک ایسی حسین ناکن کی ضرورت تھی، ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہمیں بیٹھے بیٹھے ایک حسین ناکن مل گئی۔“

”میں تو ان تمام امیدوار لڑکیوں عورتوں سے مایوس ہو گیا تھا حالانکہ ان میں کئی برسوں کی تجربہ کار تھیں لیکن ایسا محسوس ہوتا رہا کہ ان میں سے ایک بھی ایسی

بن سنور کے اس طرح آئی ہوئی تھیں جس طرح شیا چاہتی تھی۔ ان کے لباس بھڑکیلے تھے جس نے انہیں بے حجاب کر دیا تھا۔ ان کے لباسوں سے خوشبو پھوٹ رہی تھی اور کمرے کی فضا مہک رہی تھی وہ چہرے ہرے اور منہ قطع سے ادا کاراؤں کی طرح بولڈ دکھائی دیتی تھی۔ اپنے جسم اور نشیب و فراز کی نمائش کر رہی تھی۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے آخر میں چاندنی کا نمبر آیا تھا کیونکہ وہ سب سے آخر میں آئی تھی وہ ناامید اور مایوس سی ہو گئی تھی اسے کامیابی کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔

انٹرویو لینے والے تین عہدیدار تھے شاید اس لئے کہ اس جاب کی ذمیت بہت اہم تھی۔ ان تینوں نے چونکہ چاندنی کو دیکھا جو انتہائی سادگی سے آئی تھی۔ لیکن اس غیر معمولی سادگی میں بھی اس کا بے مثال حسن و جمال جوا لاکھی بنا ہوا تھا۔ اتنی جو امیدوار آئی تھیں ان میں کوئی ایک بھی سادگی اور ایک گھریلو لڑکی کے انداز میں نہیں آئی تھی۔

چاندنی کمرے میں داخل ہونے کے بعد قدرے نرم اور پریشان سی ہو رہی تھی کمرہ انٹرکنٹیننٹ تھا اس کے باوجود وہ اپنی پیشانی عرق آلود اور سارے بدن میں پسینہ چھوٹا محسوس کر رہی تھی اس لئے بھی کہ وہ اپنی زندگی میں پہلا انٹرویو دے رہی تھی اس کمرے کا پروقار اور خواب ناک ماحول اور انٹرویو لینے والوں کی شخصیت نے اسے بہت مروجہ اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا اس نے خود کو سنبھالنے میں بری کوشش اور جدوجہد کی تھی۔

اس نے ان تینوں مردوں نے کوئی بیس منٹ تک سوالات کئے جس کا وہ سنبھال سنبھال کر جواب دیتی رہی رفتہ رفتہ اس کا اعتماد بحال ہوتا گیا اور اس نے اپنی گھبراہٹ اور سرانمکی پر قابو بھی پایا۔ اس نے ان کے ہر سوال کا جواب دیا اس نے دیکھا اور محسوس کیا اور پریشان سی ہوئی رہی تھی کہ جو لڑکی بھی انٹرویو دینے اندر گئی وہ پانچ سات منٹ میں باہر آگئی تھی لیکن اس

”اسے پھاری میں بند کرنے کے لئے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔۔۔۔۔؟“ ایس ڈی ملک نے سرگوشی میں کہا۔

☆.....☆.....☆

چاندنی کو جو پہلی قسمی وہ اس کی توقع کے برعکس بہت اچھی، بہت آسان اور ہر لحاظ سے شان دار قسمی سکون و اطمینان سے کام کرنے کی قسمی اس کی تنخواہ جو قسمی وہ بھی قدرے معقول قسمی جب اسے پہلی تنخواہ ملی تو فرم کے پاس آکاش نے اسے کمرے میں بلا کر دروازے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”تم اسے رکھ لو۔“

چاندنی نے حیرت سے اس لفافے کی طرف دیکھا کہ کہیں اس کی برطرفی کا نوٹس تو نہیں ہے؟ اس کا ماتھا عرق آلود ہو گیا۔

”اس لفافے میں چار ہزار کی رقم ہے یہ تمہیں میری طرف سے بھی ہر ماہ تنخواہ ملا کرے گی۔“

”شکریہ سر۔۔۔۔۔“ وہ اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر ممنونیت سے بولی۔

”کیا میں آپ کی طرف سے ملنے والی تنخواہ کی بابت کچھ دریافت کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔؟“

”میں اس رقم کی بابت تمہیں بتانے والا تھا۔“ اس کے پاس نے کہا۔

”ایک تنخواہ تمہیں فرم کی جانب سے اور دوسری تنخواہ میری طرف سے اسٹاف کو ملتی ہے تاکہ ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا رہے۔“

”اگر کسی نے آپ کی طرف سے ملنے والی تنخواہ کے بارے میں پوچھا تو کیا بتاؤں۔۔۔۔۔؟“

”اول تو کوئی پوچھے گا نہیں کیونکہ کسی کو اس کے متعلق علم ہے کسی نے پوچھا تو بتا سکتی ہو۔۔۔۔۔؟“

چاندنی نے قسمی سے قبل شیلا کو اس کے دفتر فون کروا دیا تھا کہ وہ اس کے دفتر کے باہر ملے پہلی تنخواہ ملنے کی خوشی میں وہ نہ صرف چائے پلائے کی بلکہ فلم بھی دکھائے گی اور پھر ڈرنر پر جائیں گے۔

جب چاندنی اپنے دفتر کی عمارت سے نکلی تو شیلا اسے سڑکیوں پر مل گئی پھر دونوں چائے پینے قریبی ریسٹورانٹ میں جا بیٹیں، چاندنی نے چائے اور سمو سے کا آرڈر دیا پھر اس نے شیلا کو اس سے ملنے والی تنخواہ کے بارے میں بتایا۔

پاس سے ملنے والی تنخواہ کے بارے میں سن کر شیلا بڑے زور سے چوکی۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر فکر مندگی چھا گئی۔

”تو نے یہ بڑی عجیب بات بتائی۔۔۔۔۔؟“ شیلا کے لہجے میں تشویش قسمی۔

”یہ واقعی بڑی عجیب و غریب سی بات ہے۔۔۔۔۔“ چاندنی نے سر ہلایا۔

”کیا تیرے دفتر میں بھی ایسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ پاس الگ تنخواہ دیتا ہے۔۔۔۔۔؟ میں نے کبھی کسی سے نہیں سنا اس تنخواہ کے متعلق؟ میرا دل لفافہ لینے کو نہیں چاہتا تھا۔۔۔۔۔؟“

”مجھے تو دال میں کچھ کا لانا نظر آتا ہے۔۔۔۔۔؟“ شیلا نے شکوک لہجے میں کہا۔

”میرے دفتر میں ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی اور دفتر میں بھی ایسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟ میں تجھ سے کچھ پوچھوں گی تو کیا مجھے سچ سچ بتائے گی۔۔۔۔۔ مجھ سے کوئی بات چھپائے گی تو نہیں۔۔۔۔۔؟“

”میں نے تجھ سے کبھی کوئی بات چھپائی ہے۔۔۔۔۔؟“ چاندنی بولی۔

”میں سچ سچ بتاؤں گی۔۔۔۔۔ تو نہ صرف میری عزیز سہیلی بھلے اور حسن بھی ہے۔ تو کیا پوچھنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔؟“

اس وقت ویٹر چائے اور گرم گرم سمو سے لے آیا تھا جب وہ رکھ کر چلا گیا تو شیلا نے پوچھا۔

”کوئی تین چار مرتبہ جاتی ہوں۔۔۔۔۔ پہلے ڈاک لے جاتی ہوں۔۔۔۔۔ پھر چائے بنا کر لے جاتی ہوں۔۔۔۔۔ ان کی سیکرٹری فائل یا خطوط دیتی ہے کہ دستخط کروا کے لاؤ تو چلی جاتی ہوں میں نے تجھے بتایا ہوا ہے کہ میں

پاس کی سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھتی ہوں۔“ چاندنی نے جواب دیا۔

”کیا قسمی ایسا ہوا کہ انہوں نے تجھے کسی کام کے بہانے روک لیا ہو۔۔۔۔۔؟ غیر محسوس انداز سے تیرے حسن کی تعریف کی ہو، قربت سے فاصلے مٹانے کی کوشش کی ہو۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ کبھی ایسا نہیں ہوا۔۔۔۔۔؟“ چاندنی بولی۔

”پاس نے کبھی کام کے علاوہ کوئی بات نہیں کی۔۔۔۔۔؟“

”جب تو چائے بنا کر لے جاتی ہے تو پاس نے کہا کہ تو بھی ان کے ساتھ چائے پی لے؟ کیا تو نے کبھی ان کے ساتھ چائے پی۔۔۔۔۔؟“

”حالانکہ میں اکیلی ہی چائے لے کر ان کے کمرے میں جاتی ہوں۔۔۔۔۔ پاس نے کبھی بھی چائے پینے کے لئے نہیں کہا۔۔۔۔۔؟ لیکن جب سیکرٹری موجود ہوتی تو وہ ساتھ چائے پینے کے لئے کہتے۔“

”پاس کی سیکرٹری کیسی ہے؟ کیا وہ حسین اور جوان سال ہے یا پھر چالیس اور پچاس برس کی ہے؟ خراشت قسم کی ہے؟“

”وہ نہ صرف بے حد حسین ہے بلکہ پرکشش بھی ہے کہ جن سے اور غیر شادی شدہ اور اساتذہ بھی ہے اور عمدہ جامہ زیب بھی ہے اس کی عمر چوبیس پچیس برس کی ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے کہ پاس نے اس کے ساتھ دوستی اور تعلقات قائم کئے ہوئے ہوں عموماً دفاتر میں جو لڑکیاں عمر میں اپنے پاس کی پرائیویٹ سیکرٹری ہوتی ہیں ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھی جاتی ہے۔۔۔۔۔ اس لئے کہ پاس، ایم ڈی اور ڈائریکٹر اور مینیجر وغیرہ جو اپنے لئے سیکرٹری رکھتے ہیں وہ حسین اور پرکشش اور نو جوان ہوتی ہیں وہ تیرے مقابلے میں حسین نہیں ہوگی پاس اپنا جال بچھا رہا ہوگا۔۔۔۔۔“

”اچھا یہ بتا کہ تیرے پاس نے کبھی تنہائی اور سیکرٹری کی غیر موجودگی میں تجھے یہ دفتر چھوڑ دیا اور کسی

فائینا اسٹار ہوٹل میں ڈر کے لئے کہا ہے۔۔۔۔۔؟“

”پاس کے سیکرٹری سے تعلقات نہیں ہیں اگر ہوتا تو اس کا علم ہو جاتا اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں رہتی دیکھ پاس بہت شریف آدمی ہے اور اسٹاف اس کی بہت تعریف کرتا ہے سیکرٹری بھی کوئی تین برس سے کام کر رہی ہے وہ مزاح اور عادات اطوار کی سی بہت اچھی ہے اور یہی اس کے اچھے کردار کے معترف ہیں۔“ چاندنی نے کہا۔

”پاس نے کبھی بھولے سے بھی دعوت نہیں دی اور نہ ہی منگلی اور مردوں کی ایسی گرسنہ نظروں سے دیکھا جو مرد سراہ لڑکیوں کو توڑ کو دیکھتے ہی اس کے علاوہ دوسرے عہدہ داروں نے بھی نہیں۔۔۔۔۔ ان کی کم زوری لڑکیاں ہوتیں تو شاید وہ میری طرف پیش قدمی ضرور کرتے۔“

”تو میری ایک بات اپنی گرہ میں باندھ لے کہ وہ اپنی شراعت کی آڑ میں تجھے استہزاء میں لے رہا ہے اور اسے غلت نہیں ہے کہ شکار کہاں فتح کر جائے گا تیرا حسن بڑا خطرناک اور مکمل کر دینے والا ہے تو کسی ناگمن سے کم نہیں ہے وہ ایک دن موقع پا کر تجھے ناگ کی طرح ڈس سکتا ہے تو قسمی اس بات سے واقف ہوگی ایک مرد کی فطرت ناگ کی طرح ہوتی ہے۔“

”میں دفتر جاتی ہوں تو ہر لمحہ بڑی محتاط، چوکنا اور ہوشیار رہتی ہوں کیونکہ اسٹاف کے مرد مجھے سے دوستی کرنے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔“

”اچھا سن میری جان۔۔۔۔۔“ شیلا نے چائے سب کرتے ہوئے کہا۔

”سنچے کہ دن سہ پہر کے وقت میری سال گرہ ہے تو ضرور آنا بہت اچھا گفت لانا۔“

”میرے خیال میں تمہارے لئے بہترین گفت میرا بس ہوگا۔“ چاندنی نے شوخی سے کہا۔

☆.....☆.....☆

چاندنی اس کے لئے کوئی ایسا تحفہ خریدنا چاہتی تھی جو نہ صرف بہت خوب صورت بلکہ یادگار بھی ہو۔ اس

میں ایسی کوئی انفرادیت اور خصوصیت اور نادرین ہو کہ اس کی بے مثالی پر شیلا عیش عیش کراٹھے پھر وہ اس کی پسند اور انتخاب سے متاثر ہو کر داد دینے کے بہانے چوم لے تحفہ بھی بے پایاں محبت کا جوتہ ہوتا ہے۔

جمعرات کا دن تھا، شیلا کی سالگرہ میں ابھی دو دن باقی تھے آج چونکہ اس کے پاس وقت تھا اور فرصت میں تھی چونکہ کوئی کام نہ تھا اس لئے وہ گھر جانے کی بجائے رکشہ لے کر نوادرات کی طرف چل دی۔ وہ نوادرات کی اس دکان پر شیلا کے ساتھ کئی بار آ چکی تھی اس دکان کی مالک ایک ادھیڑ عمر کی خوب صورت اور صحت مند عورت تھی وہ نہ صرف چاق و چوبند اور نرم و خوش طبع اور نہ کبھی کسی اس کا نام کیا تھا وہ جانتی نہیں تھی لیکن اسے ہر کوئی آنٹی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اور وہ اس نام سے مشہور بھی تھی۔

چاندنی اس دکان میں داخل ہوئی تو اس وقت دکان میں کوئی نہ تھا آنٹی ایک میز پر بیٹھی موٹے رجسٹر میں کچھ اندراج کر رہی تھی اس نے چاندنی کو دیکھا تو دل کس اور ششامسکراہٹ سے استقبال کیا۔

چاندنی نے اسے آداب کر کے رکی جملوں کے بتارے کے بعد شیلا کے لئے تحفہ تلاش کرنے لگی۔ آنٹی نوادرات کے معاملے میں بڑی باذوق واقع ہوئی تھی وہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ بلکہ نفاست پسند تھی وہ نوادرات کی خریداری کے لئے اندرون اور بیرون ملک بھی جاتی رہتی تھی اس کی دکان میں جو نوادرات تھیں شہر کی کسی بھی نوادرات کی دکان میں نہیں تھی۔ اس وقت وہ دکان میں اکیلی تھی اس کی سیز گرل کسی وجہ سے نہیں آئی تھی وہ دکان کے وسط میں کھڑی نگاہیں دوڑا کر سوچ رہی تھی کہ شیلا کے لئے کیا تحفہ خریدنا چاہئے۔ دکان کے ایک گوشے میں دنیا کے ہر ملک کی گڑیاں موجود تھیں۔

یہ گڑیاں نہ صرف ایک سے خوب صورت بلکہ بڑی پیاری پیاری تھیں جانے کیوں اس کے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ شیلا کو کوئی گڑیا تحفہ میں دے دے.....؟ گو یہ عمر گزرتے گزرتے کھیلنے کی نہیں تھی لیکن یہ گڑیاں ایسی تھیں کہ نہ صرف نوادرات میں بلکہ ڈیکوریشن

بیس کے طور پر جانے سے کمرے کی رونق بڑھ سکتی تھی۔ تقریباً پچاس کے لگ بھگ گڑیاں تھیں ان میں عروسی لباس میں بھی تھیں یہ گڑیاں دنیا کے مختلف ممالک کی تھیں ان کی وضعت قطعاً اور چہرے ہرے سے ظاہر ہوتا تھا محاسن کی نگاہ ایک مشرقی لہجہ پر جم کر رہ گئی یہ گڑیاں تھیں ہر قسم کی اور ہر ساز کی تھیں یہ گڑیاں جس نے بھی بنائی تھی اس سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی پیکر تراش گیا ہو کوئی بڑا اور عظیم فن کار لگتا تھا انتھک محنت اور توجہ سے بنایا ہو گا اس مشرقی لہجہ میں اتنی کشش اور جاذبیت تھی کہ وہ بے اختیار ٹھٹھک کے رک گئی۔

اس کے سارے جسم پر ایک ان جانے خوف کی لہر سنسنی بن کر پھیل گئی لمحے کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کوئی حسین ناکن ہے جو اس کی نظروں کے سامنے کھڑی اسے تنگ کر رہی ہو؟ یہ گڑیاں نہیں ہے؟ اس کی نظروں کو دھوکا ہوا ہے؟ وہ دوسرے لمحے ہنس بڑی دکان میں جتنے بھی نوادرات تھے ان سب میں یہ لہجہ گڑیاں سب سے خوب صورت اور کی مہارانی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں ایک عجیب سا اسرار، خصوصیت اور انفرادیت تھی اور دکان میں جتنی گڑیاں تھیں اور جتنے بھی ایک سے ایک نوادرات تھے وہ اس گڑیا کے حسن کی تمکنت کے آگے ماند پڑ گئے تھے پھر اسے اس گڑیا نے کشاں کشاں اپنی طرف مہینچ لیا تھا۔

یہ لہجہ گڑیا کوئی بہت بڑی نہ تھی وہ سوافٹ لمبی اور آدھا فٹ چوڑی تھی اس کی بے حد سیاہ اور چمک دار اور بڑی بڑی آنکھیں اور سر میں کھینچی پلکیں کسی قصہ کہانی کی شہزادی کی طرح ہادو بھری تھیں اور ان میں مقناطیسی کشش تھی اس کا چہرہ جس کے چمکے چمکے نقش و نگار سب سوال ناک اور چھوٹا سا دہانہ ایسے محور کن تھے کہ وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھی۔

اس نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے یہ گڑیا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے اس کی خند آنکھوں کی زبان اس سے کچھ کہے دے رہی ہیں پھر اس نے ایسا محسوس کیا کہ یہ پیاری اور سن موہن سی لہجہ گڑیا اس کی

سانسوں میں خراماں خراماں اتر کے اس کے من کی گہرائیوں میں اپنی جگہ بن رہی ہے۔

اس گڑیا میں جانے ایسا کیا سر تھا کہ وہ اس کی اسیر ہو کر دنیا دافیا سے بے نیاز ہو گئی چند لمحوں تک اس پر طلسمانی سی کیفیت طاری رہی۔ وہ اسے خود فراموش کی حالت میں دیکھتی رہی۔

اس کے ذہن میں ایک آوارہ سا خیال کوندا بن کر لگا..... آنٹی ابھی تک رجسٹر پر جھکی ہوئی اندراج کرتی جاری تھی یہ گڑیا تمام گڑیاؤں سے ہٹ کر نمایاں جگہ رکھی ہوئی تھی پھر اس سے رہائش گیا پھر اسے ہاتھ بڑھا کر اس چاندنی گڑیا کو اٹھالیا پھر اسے دیوانہ وار چومنے لگی اس نے اپنے ہونٹ نہ صرف گڑیا کے رخساروں پر رکھ دیئے بلکہ اس کے ہونٹوں پر بھی مثبت کرتی گئی اس ایک لمحے میں اس نے گڑیا کے بہت سارے بوسے لے ڈالے۔

اس نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ اس گڑیا کے لمس ایک انوکھا اور لطیف احساس تھا حالانکہ وہ گوشت پوست کی نہ تھی لیکن اس کے سارے جسم میں حدت سی پیدا ہو گئی تھی۔

پھر اس نے گڑیا کو واپس اسی جگہ رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔

پھر وہ دوسری نوادرات کو دیکھنے لگی کہ شاید کوئی اور نوادرات پسند آجائے لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ گڑیا اس کی ساری توجہ اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی گڑیا کی آنکھیں اسے اس طرح دیکھے جاری تھی جیسے وہ بے جان نہیں بلکہ زندہ ہستی ہو۔ اس کی نظر میں اس کے وجود میں پورست ہوئی جاری تھی اسے لگا یہ گڑیا جیسے اس سے کہہ رہی ہو۔

”مجھے خرید لو..... اپنی آغوش میں لے لو..... میں تمہاری ہوں..... صرف تمہاری..... اور تم میری ہو.....“

چاندنی نے دل میں سوچا کیا اسے اس گڑیا کو خرید لینا چاہئے؟ معلوم نہیں آئی اس کی کیا قیمت بتائے گی؟ اس کی جیب اجازت دے گی؟ اگر وہ اس

گڑیا کو کسی نہ کسی طرح خرید لیتی ہے تو کیا شیلا کو تحفہ میں دے دے؟ نہیں..... وہ شیلا کو یہ گڑیا تحفہ میں نہیں دے گی؟ کوئی اور چیز دے دے گی کیونکہ اسے اپنے کمرے میں ایک ڈیکوریشن چیز کی طرح رکھے گی بچپن میں گڑیوں سے بہت کھلتی تھی بہت سارے لوگ اور شہ دار اسے گڑیا کہتے تھے۔

اس نے پھر سے دکان میں رکھے اور سجے ہوئے نوادرات دیکھے لیکن ان میں ایک نوادری ایسا نہیں تھا جو اس گڑیا پر بھاری ہو اور بھی جو گڑیاں تھیں ان میں کسی میں ایسا حسن اور دل کشی نہیں پائی تھی وہ اس گڑیا کے سامنے ماند پڑ رہی تھیں۔

نہ جانے اس گڑیا پر اسے اس قدر اور بے ساختہ پیار آیا کہ گڑیا کو اٹھا کر بے تحاشہ چوم لیا۔ اس کی یہ حرکت عجیب اور انہونی ہی بھی تھی اگر آنٹی دیکھ لیتی تو وہ نجانے کیا سوچتیں؟ یہ کیا پاگل پن تھا..... حالانکہ اور بھی جو گڑیاں تھیں وہ بھی بہت حسین اور پیاری پیاری سی تھیں اسے صرف اس گڑیا پر اتنا پیار کیوں آیا؟

پھر اس نے اس گڑیا کو ہر قیمت پر خریدنے کا فیصلہ کر لیا پھر وہ میز کے پاس جا کر کرسی مہینچ کر بیٹھ گئی چند لمحوں کے بعد آنٹی نے رجسٹر بند کر کے ایک طرف رکھا اور مسکرا کے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی اور اپنائیت کے لہجے میں پوچھا۔

”کیا تمہیں کوئی چیز پسند آئی.....؟“

”ہاں.....“ چاندنی نے اطمینان سے انداز میں سر ہلادیا۔ پھر اس نے اپنی پسند کی ہوئی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ گڑیا مجھے بے حد پسند آئی ہے.....“

”اچھا.....“ آنٹی نے اس گڑیا کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

”تم نے بڑا اچھا انتخاب کیا ہے.....“

”میں نے اپنی زندگی میں اتنی شان دار اور خوب صورت گڑیاں نہیں دیکھی؟ کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ یہ گڑیا آپ نے کس سے خریدی ہے؟ کہاں سے



خریدی۔“  
”یہ گڑیا میں نے کسی سے نہیں خریدی بلکہ عجیب  
وغریب اور پراسرار حالت میں ملی ہے۔“ آنٹی نے  
جواب دیا۔

”جی.....“ چاندنی کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔  
”اتنی خوب صورت اور پیاری گڑیا کیسے اور کہاں  
سے ملی گئی؟ آپ سچ کہہ رہی ہیں؟“  
”میں سچ کہہ رہی ہوں.....“ آنٹی کہنے لگی۔

”مجھے یہ گڑیا ایک مکان سے ملی ہے..... یہ عجیب  
وغریب اور پراسرار اور ناقابل یقین بات ہے میں جب  
بھی اس گڑیا کو دیکھتی ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا ہے میں  
نوادرات کی خریداری کے لئے اندرون ملک بھی جاتی  
رہتی ہوں مجھے کسی نے بتایا ایک پراسرار خوف ناک  
مگر سرسبز وادی رام گرجو یہاں سے سوئیل کے فاصلے پر  
ہے دس برس پہلے طوفان کے باعث اجڑ گئی بہت سے  
اس طوفان کی نذر ہو گئے پھر وہاں سانپوں، ناکوں اور  
بدروحوں کا بسیرا ہوا تو آبادی ویران اور خالی ہو گئی  
۔ وہاں اس وقت نوادرات کا ایک خزانہ موجود تھا میں  
چونکہ تو ہم پرست نہیں ہوں اس لئے تجسس اور نوادرات  
کے حصول کے لئے چلی گئی وہاں جانے کے لئے  
میں نے ایک موٹر بوٹ کرائے پر حاصل کی اس لئے کہ  
یہ شارٹ کٹ تھا خشکی سے دو سوئیل پر واقع ہے موٹر بوٹ  
چلاتے وقت مجھے پچھتاوا سا ہوا کہ میں کیوں اس  
پراسرار خوف ناک اور آسیب زدہ وادی کی طرف جارہی  
ہوں ان دس برسوں میں ناموں، سانپوں، بدروحوں  
اور رندوں کا اضافہ ہو گیا ہوگا۔ وہاں محل نما حویلی تھی  
اس میں ایک جاگیر دار تھا جس کی دس بیویاں تھیں  
اور اولاد کوئی نہ تھی اس نے جس لڑکی سے بھی شادی کی وہ  
اپنے ساتھ بے پناہ جہیز لائی تھی وہ جو طوفان آیا تھا  
زہریلا تھا اس کی زہریلی ہوانے وہاں کی نہ صرف  
ساری آبادی بلکہ جاگیر دار اور اس کی بیویوں کو بھی  
ہلاک کر دیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اس طوفان نے جو ہلاکت نیزی

کی تھی اس کے بارے میں سن کر شاید موت کے خوف  
سے کوئی نہ گیا ہوگا، میں نے تمام اندیشے خوف اور  
دسو سے دل سے نکال دیئے پھر ہمت اور حوصلہ کر کے  
اس وادی میں پہنچ گئی یہ وادی نہ صرف بڑی پراسرار  
خوف ناک بلکہ آسپیری بھی اور ہر طرف خوشبو، ویرانی  
اور ویران برس رہی تھی آبادی اجڑی پڑی تھی بہت  
سارے مکانات منہدم ہو کر لمبے کے ذخیر بنے ہوئے  
تھے ایک ان جانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔

وہ حویلی جو کہ محل نما تھی اب بھی اس کی پر شکوہ  
حالت اور شان شوکت اور درپردہ برقرار تھا میں دھڑکتے  
دل سے حویلی کے اندر کھس گئی زیریں حصے کے تمام  
کمرے خواب گاہیں وہاں باورچی خانہ اور دیوان ویران  
اور خالی تھے ان کا فریج بچر تباہ حالت میں تھا الماریاں بھی  
خالی تھیں ان کی دراز میں جو شاندار ملبوسات تھے انہیں  
دیکھ کر کھانسی بھی ان میں کوئی اثر نہ پور نہ تھا۔

پھر میں حویلی کی پہلی منزل پر گئی تو میرا سینہ ایک  
ان جانے خوف سے بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے کسی  
نادیدہ ہستی نے مجھے بری طرح دیوچ کر من مانیاں کی  
ہوں..... سانس تھیں کہ بے ترتیب ہو رہی تھیں اس  
لئے کہ بدروحوں کے سائے ہر جگہ رقص کرتے محسوس  
ہو رہے تھے۔

پھر میں ایک خواب گاہ میں داخل ہو کر ٹھٹک کے  
رک گئی اس کمرے میں ایک عراب میں یہ گڑیا نظر آئی  
جو زرق برق عروسی لباس میں تھی وہ ایک بڑی سرخ  
اور دھنی میں لپیٹی ہوئی تھی وہ بڑے دل کش انداز سے  
مسکرا رہی تھی مجھے ایسا لگا کہ یہ جیتتی جاتی گڑیا ہے اتنی  
خوب صورت، پیاری اور اونگھی گڑیا جیسے ابھی اسے  
یہاں سیاحت کے لئے لائی گئی ہو اگر میں تو ہم پرست  
ہوتی تو یہ جیتتی کہ کسی بدروح نے یہ بہرہ رو کر لیا ہو۔ میں  
نے ایسی سندر گڑیا بھی اپنی زندگی میں کیا سنے میں بھی  
نہیں دیکھی۔ میں لپک کر اس کے پاس گئی کہ اپنا وہم  
اور شک شبہ دور کروں قریب پہنچ کر اسے ہاتھ لگایا وہ  
کوئی بدروح ہوتی تو اس کا جسم دھواں دھواں ہوتا اور بس

محسوس نہ ہوتا۔ وہ پلاسٹک کی تھی اور اس کا سارا بدن اس  
کے عروسی لباس اور سرخ اور دھنی میں لمبوس تھا۔

اس کی خوب صورت اور اس کی جادوگری  
آنکھوں نے مجھے مبہوت سا کر دیا۔ میں جانے کتنے  
لمحوں تک اسے خود فراموش اور جوییت دیکھتی رہی اور دنیا  
و مایا سے بے نیاز ہو گئی میں بھی اس کی آنکھوں کی  
گرفت میں تھی وہ زندہ گڑیا لگ رہی تھی اور زندہ ہی لگتی  
بھی تھی جس نے بھی اسے بنایا بڑی عرق ریزی سے  
..... اس کی مہارت اور کمال کی داوند دینا بدھوتی تھی۔

اس کمرے میں اس گڑیا کے علاوہ کوئی اور شے  
نہیں تھی مجھے اس نواد کو دیکھ کر کسی اور نواد کی تلاش کی  
فکر اور جستجو نہیں ہوئی اس لئے میرا اندازہ اور خیال تھا کہ  
اس حویلی میں کیا اس وادی کے کسی مکان میں بھی کوئی  
نواد نہیں ملے گا، کیونکہ یہ وادی آسیب گردی بن چکی ہے  
اب اس گڑیا کو لے کر واپس چلو..... اس کی ایسی منہ  
مانگی قیمت ملے گی کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔

میں نے اس گڑیا کو اس طرح سے اٹھایا جیسے ایک  
اشمول، نایاب اور بے حد قیمتی نواد ہے۔

پھر میں دروازے کی طرف بڑھی، میں نے  
دو قدم بھی ملے نہیں کئے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا  
جو میں نے کسی وجہ سے بند کیا تھا ایسا لگا جیسے کوئی دروازہ  
کھول کر اندر آ رہا ہے۔ میرے سارے جسم پر سنسنی کی  
لہر دوڑ گئی میں ایک دم سے ٹھٹک کے رک گئی یہ کون  
ہو سکتا ہے؟

میرے دل سے کسی کونے میں ایک انجانے خوف  
کی ہر آنکھ جس نے مجھے بری طرح دہلا دیا۔

شاید اس وادی میں کوئی شخص رہ رہا ہوگا؟ اس نے  
شاید مجھے دیکھ لیا ہے؟ اگر اس نے مجھے دیوچ کر قابو میں  
کر لیا اور میں اس کے ہاتھ میں بے بس ہو گئی تو.....  
میرے پاس مزاحمت اور دفاع کے لئے کوئی ہتھیار بھی  
تو نہیں ہے مگر اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوا تو اس کے  
رحم و کرم پر ہو جاؤں گی اس کی ہر بات ماننا پڑے گی وہ  
من مانیاں اور درست درازیاں بھی کرے گا۔

میں یہ سوچ کر لرز رہی تھی کہ دروازہ ایک دھماکے  
سے کھلا چارناکتیں پھنکارتی ہوئی کمرے میں کھس  
آئیں اور وسط میں کھڑی ہو کر مجھے شعلہ باز لگا ہوں سے  
مکھورے لگیں وہ خطرناک زہریلی بھی تھیں انہیں غضب  
ناک دیکھ کر میری جان ہی نکل گئی میرے ہاتھ پر برف  
کی طرح جھونے لگے مجھے ایسا لگا کہ میری موت میری  
نظروں کے سامنے کھڑی ہوئی تاج رہی ہے..... میں  
ساکت و جامدی ہو گئی تھی۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں؟  
میرے فرائد کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں کوئی  
کھڑکی ایسی نہیں تھی کہ اس سے نکل سکوں کیونکہ اس میں  
اتنی مضبوط اور قریب قریب سلاخیں لگی ہوئی تھیں ایک ملی  
کا پچھ بھی نہیں نکل سکتا تھا کمرے سے نکلنے کے سوا کوئی  
راستہ نہیں تھا ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ناکتیں بیک وقت مجھ  
پر ٹوٹ پڑیں گی اور پل بھر میں ڈس لیں گی میرے  
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت صلب ہو چکی تھی ان سے بچ  
کر نکلنے کی کوئی تدبیر اور صورت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

پھر اچانک ایک تدبیر میرے ذہن میں کوندا بن  
کر لگی۔

میں نے سنا ہوا تھا کہ سانپ، ناگن اور ناگ کے  
منہ پر کپڑا ڈال دیا جائے تو وہ اندھے ہو کر بے بس  
ہو جاتے ہیں۔ لہذا میں نے سوچا کہ اپنے کپڑے نکال  
کر ان کے منہ پر ڈال دوں اس وقت بھی میں ساڑی  
میں لمبوس تھی میں ساڑی ہی پہنتی ہوں اس وقت تم بھی  
دیکھ رہی ہو کہ میں ساڑی میں ہی لمبوس ہوں اور یہ لباس  
مجھے ہمیشہ سے ہی پسند رہا ہے وہ چاروں ایک ساتھ  
صف کی صورت میں کھڑی ہوئی تھیں میں نے سوچا کہ  
ان پر ڈال دوں پھر میں فوراً ہی کمرے سے نکل جاؤں  
اور باہر سے دروازہ بند کر کے کنڈلی لگا دوں میں کسی  
قیمت پر گڑیا سے محروم ہونا نہیں چاہتی تھی۔

یہ صورت حال بڑی سنگین اور گھمبیر تھی میری سمجھ  
میں نہیں آیا تھا میں نے سوچا کہ پہلے تو اس کمرے سے  
نکلوں جان بہت پیاری ہوتی ہے بعد میں کسی نہ کسی

## کال گرل



”مسٹر اسٹیفن! آپ کو صرف اس لئے چھوڑ رہی ہوں کہ آپ بھی میری طرح سچائی پسند ہیں اور فلاحی کاموں میں حصہ لیتے ہیں، ورنہ اب تک 56 لوگوں کو اپنا شکار بناتگی ہوں۔“

**جنگل** کے پتوں کی بجائے کئی سڑک پر میری کار گولی کی سی رفتار سے چل رہی تھی میں کسی ضروری کام سے میکسیکو شہر جا رہا تھا جہاں کچھ برنس کے معاملات طے نہ تھے میرا نام مانگیل ہے اور میں شادی شدہ ہوں، میں ایک برنس میں ہوں، میرا کاروبار امریکہ کے مختلف شہروں میں پھیلا ہوا ہے میں والدین کا اکلوتا وارث ہوں اور ان کے گزر جانے کے بعد سارے کاروبار کا بھی اکلوتا وارث ہو گیا اور شادی کر کے ایک طوفانی زندگی جی رہا ہوں میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں مھوٹ سے سخت نفرت ہے اور ایمانداری سے برنس چلانے کا قائل ہوں شراب و شباب سے دور رہتا ہوں

ایسا بھی نہیں کہ کبھی ہوں دل کھول کر خرچ کرتا ہوں اور غریب و نادار لوگوں کی مدد بھی کرتا رہتا ہوں فلاحی کاموں سے مجھے سکون حاصل ہوتا ہے گولی کی رفتار سے چلنے والی میری کار اچانک ایک سسٹن سڑک پر رک گئی۔

”اوہ شیٹ! اب اسے کیا ہو گیا آج رات مجھے میکسیکو شہر میں پہنچنا ہے ورنہ وہ برنس ڈیل کینسل ہو جائے گی اور مجھے لاکھوں ڈالرز کا نقصان ہوگا۔“ کار کا بونٹ کھولا انجن کافی گرم ہو گیا تھا جبکہ پانی کا کین بھی خالی تھا لگتا ہے اسے پانی کی ضرورت ہے میں نے گھڑی پر ناٹم دیکھا شام کے 6 بج رہے تھے آس

خونفاک کہانیاں [65] اپریل 2018ء

میں نے بلڈ شائے اور سینے سے ہٹایا گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلو سینے اور شائے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ جہان سے اندر سے اندر سے گئی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، تاک اور ناگس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں..... ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ دہ بھرکتی تھیں۔

میں چاروں سمتوں کو تادنگاہ دیکھتی ہوئی دریا کی طرف جا رہی تھی مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا میرے قدم منوں بھاری ہو رہے تھے ایک ایک قدم سینوں کی مسافت بننا جا رہا تھا حالانکہ موسم خوش گوار تھا ہوا میں خشکی تھی اس کے باوجود میرا ماتھا عرق آلود تھا اور بدن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

میں نے پلے پلے اور آہستہ سے ہٹا کر گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلو سینے اور شائے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ جہان سے اندر سے اندر سے گئی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، تاک اور ناگس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں..... ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ دہ بھرکتی تھیں۔

میں نے پلے پلے اور آہستہ سے ہٹا کر گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلو سینے اور شائے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ جہان سے اندر سے اندر سے گئی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، تاک اور ناگس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں..... ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ دہ بھرکتی تھیں۔

میں نے پلے پلے اور آہستہ سے ہٹا کر گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلو سینے اور شائے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ جہان سے اندر سے اندر سے گئی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، تاک اور ناگس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں..... ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ دہ بھرکتی تھیں۔

میں نے پلے پلے اور آہستہ سے ہٹا کر گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلو سینے اور شائے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ جہان سے اندر سے اندر سے گئی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، تاک اور ناگس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں..... ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ دہ بھرکتی تھیں۔

خونفاک کہانیاں [64] اپریل 2018ء



پاس جنگل ہی جنگل تھا میں نے خالی کین اٹھایا اور پوٹی ایک طرف کوچل پڑا کافی گھٹنا جنگل تھا جگہ جگہ جنگلی گھاس اور پتھریلی زمین پر مشتمل یہ خطہ میرے لئے نیا تھا میں شہر کا رہنے والا تھا گاڑی بھگنوکر چاکر لیکن ایک مثبت بات یہ تھی کہ میں اپنا کام خود سرانجام دینے کی عادت رکھتا تھا کافی دیر تک مجھے کہیں بھی پانی دکھائی نہیں دیا مجبوری تھی پانی کے سوا انجن اسٹارٹ نہیں ہوگا اور مجھے دیر ہو رہی تھی شام کے سائے بڑھ رہے تھے دو گھنٹے میں پونجی چل رہا لیکن بے سود لگتا ہے میں رستہ بھگ گیا تھا اور اب تو واپسی کا رستہ بھی کھو گیا تھا۔

”اوہ گاڈ! کیا کروں.....؟ اندھیرا پھیلنے سے پہلے مجھے کار تک پہنچنا چاہیے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے پورا جنگل رات کی تاریکی میں ڈوب گیا، میں نے موبائل فون نکالا لیکن یہاں کوئی میٹ ورک نہیں چل رہا تھا اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اسکی تاریخ آن کر کے روشنی کا انتظام ہو گیا، میں رستہ بھول گیا تھا میں نے کھڑی دیکھی رات کے نو بج چکے تھے اب تو جنگلی جہنم پرند اور حشرات کی آوازیں ہر طرف سے صاف سنائی دینے لگی تھیں اب تک میرے سامنے بھالو، ہرن، گیدڑ، جنگلی خرگوش چلتے پھرتے نظر آرہے تھے شاید جنگلی جانوروں کو آدم بھوسوں ہو گئی تھی اس لئے وہ کثرت سے میرے گرد جمع ہو رہے تھے اور اب تو شیر کے دھاڑنے کی آواز بھی دور کہیں سے سنائی دے رہی تھی لیکن مجھے ان کا خوف نہیں تھا مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں بزنس ڈیل نہ کینسل ہو جائے اور میں خالی ہاتھ ہی واپس گھر کا رستہ ناپوں۔ پونجی چلتے چلتے میں اسی مرکزی سڑک پر پہنچ گیا مجھے کافی اطمینان ہوا اور ساتھ ہی موبائل پر کینسل بھی بحال ہونا شروع ہو گئے سب سے پہلے میں نے سیکسیو سٹی میں اپنے بزنس پارٹنر ”مسٹر وائن“ کو کال کی وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔

”دیکھو وائن..... میری کار خراب ہو گئی ہے اور میں رستہ بھول گیا ہوں آپ بس کچھ گھنٹوں کے لئے یہ بزنس میٹنگ موخر کر دیں۔ جونہی مجھے کوئی لفٹ ملی یا

اپنی کار ٹھیک ہوتی میں دیر نہیں کروں گا۔“ اوکے بول کر اس نے فون رکھ دیا میں نے دوسری کال ملائی میرا ایک ملکیٹک دوست تھا۔

”ہیلو اینڈریو یار میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی اور انجن کے لئے پانی بھی نہیں مل رہا، آپ میری کوئی سیلپ کر سکتے ہو؟“ اس نے کہا کہ میں گاڑی کے پاس جا کر دوبارہ کال کر دوں مجھے کوئی طریقہ بتانے والا تھا۔ جس سے میں کار اسٹارٹ کر سکتا تھا لیکن نہ جانے میں کہاں اور کار کہاں تھی میں سنسان سڑک پر اکیلا خوار ہو رہا تھا کافی دیر پیدل چل رہا لیکن لگتا ہے آج اس سڑک پر کسی بھی گاڑی نے نہ آنے کی قسم کھا کر تھی لفٹ کا آسرا بھی ختم ہو رہا تھا، میں نے اپنی بیوی کو کال ملائی۔

”ہیلو سوینی کیا ہو رہا ہے؟ یار میری کار خراب ہو گئی ہے اور پچھلے کئی گھنٹوں سے میں یہاں دیرانے میں خوار ہو رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا کہ وہ اسے سی آن کر کے نی دی پرفٹ بال بیچ دیکھ رہی ہے۔

”یار تم غور نہیں بھی نا..... اب پتا چلا کہ پیسے کتنا کتنا مشکل کام ہے اور آپ عورتیں منٹوں میں شاؤنک میں ایسے اڑاتے ہو جیسے۔“ وہ میرا منہ چڑانے کے لئے اور زور سے ہنس رہی تھی لیکن اس کی ہنسی نے مجھے کافی حوصلہ دیا اور میں بھی ہنسا وہ رہی میری کار میں نے موبائل بند کر دیا اور کار کی خوشی میں چلا اٹھا، میں نے ملکیٹک دوست کو فون کیا اس نے مجھے کچھ ہدایات دیں، میں کار کے انجن پر جھکا ہوا تھا اور اس کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کر رہا تھا کچھ تاہیں ادھر سے ادھر جوڑیں اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو گیا اب دوبارہ گولی کی سی اسپینڈ میں وہ چل رہی تھی عجیب بات ہے سڑک پر اب کچھ گاڑیاں نظر آرہی ہیں جب ضرورت تھی تب..... میں نے ریڈیو آن کیا کیا کیسا شمسو گانا چل رہا تھا چینل چینج کیا اب وہاں کسی ہارمونیو کا ڈراما نا سوینگ چل رہا تھا جو اس وقت میرے حالات پر پرفیکٹ فٹ

تھا سنسان سڑک اور میں اکیلا اور یہ جنگل کیا خوب تھا کافی دیر تک وہ خوف ناک سوینگ چلتا رہا۔ اب میں پورے ہور ہوا تھا چینل چینج کیا ارے یہ کیا کتنا بہن اتفاق تھا وہاں پر بھی وہی گانا چل رہا تھا پھر تیسرا چینل بدلا عجیب بات ہے یہ سارے چینلوں پر آج ایک سوینگ؟ میری حیرت کی انتہا ہو گئی آخر تک آ کر میں ریڈیو بند کر دیا۔

میں شروع سے ہی بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتا تھا میں اپنی بیوی کو بولتا تھا کہ یہ جن بھوت تو صرف گھوٹوں میں ہوتے ہیں اچانک ایک بھیڑیا کار کے سامنے آ گیا میں نے بریک پر پاؤں مارا لیکن تب تک گار سے اس کی ٹکر ہو چکی تھی۔

”اوہ.....“ میں نے گاڑی کو بریک لگائی دروازہ کھولا لیکن مجھے اس کی لاش کہیں بھی دکھائی نہیں دی۔

”کہاں گیا ہے یہ.....؟“ مجھے دیر ہو رہی تھی میں نے دوبارہ کار اسٹارٹ کی، کافی عجیب بھیڑیا تھا شاید بڑی ہو کر بھاگ گیا ہو گا یہ سوچ کر میں خود کو تسلیاں دینے لگا ابھی تھوڑا ہی دور گیا ہوں گا کہ سامنے بچ سڑک پر ایک نوجوان عورت دکھائی دی اس نے لفٹ کا اشارہ کیا اس کے قریب کار روکی شیشہ نیچے کیا ایک بھروسہ میرے قریب آئی۔

”مجھے لفٹ مل سکتی ہے.....؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

”حیرت ہے رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو اور تم کون ہو؟“ وہ ڈر پر لب مسکرائی۔

”میں جھوٹ نہیں بولوں گی، میں ایک کال گرل ہوں کچھ امیر زادوں نے منہ منہ کر کے مجھے یہاں پھینک دیا اور پیسے بھی نہیں دیئے۔“ مجھے بھی جھوٹ پسند نہیں تھا اس کی صاف گوئی کی وجہ سے میں نے اسے لفٹ دی وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی جا کر دوبارہ اشارہ کی طویل خاموشی کے بعد میں نے اسے پوچھا۔

”یہ کام شوقیہ یا مجبوری سے کرتی ہو.....؟“ اس نے پھر صاف کوئی سے کام لیا۔

## سکون کا خوب صورت فرش

انسان کی تخلیقی صلاحیتیں کسی بھی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں، اور اکثر چھوٹی اور بظاہر کی ایک مقصد یا بے مقصد نظر آنے والی چیزوں کو بھی انسان اس تخلیقی انداز سے استعمال میں لاتا ہے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ امریکی سکے سینٹ یا پیننی جو ملک بھر میں سب سے کم قیمت کا حامل ہوتا ہے کوئی اسے پرانے فرش کو سننے میں تبدیل کرنے کے لیے بھی کام میں لے سکتا ہے، ایسا شاید کسی نے نہیں سوچا ہوگا۔ امریکی ریاست اوریگون کے شہر پورٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والی ٹونیا ٹونرز نے اپنے گھر کے پرانے فرش کو اپنی تخلیقی کے ذریعے نئی اور خوبصورت شکل دینے کے لیے 13 ہزار سے زائد سکے استعمال کیے۔ بتایا گیا ہے کہ ٹونیا ٹونرز نے اس کے لیے بینک سے 50 ڈالرز کے پیسے سے گھرے ہوئے تین بیگ لیے، ساتھ ہی انھیں فرش پر چپکانے کے لیے گوند، وڈ فلر، گراؤٹ اور کچھ مہنگی ایپو کسی (خاص قسم کی گوند) کا استعمال کیا۔ انھیں یہ پروجنکٹ مکمل کرنے میں چند ماہ لگے۔ ٹونیا ٹونرز کا کہنا تھا کہ اس کام کے آغاز سے قبل ان کے ذہن میں کوئی خاص ڈیزائن نہیں تھا، جس کے باعث انھوں نے فرش کی، ہیرے کی شکل کے ڈیزائن میں آرائش شروع کر دی اور کچھ مہینوں کی محنت کے بعد خوب صورت فرش تیار کر لیا۔

(راحت علی عباسی - کراچی)



## پاکیزہ محبت



”باباجان! محبت کرنا اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں ہم دونوں کا ملاپ ممکن نہیں پر اس کے باوجود میں اسے چاہتا ہوں کہ میں نے اس کی روح سے محبت کی ہے

منشی حیات اللہ اولاد کی نعمت سے محروم ہے اس کی بیوی ہاجرہ جو کہ اجیر عمری کی جانب بڑھ رہی ہے خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئی۔ ”خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔“ کے مقولے پر یقین رکھے ہر دروازے پر اولاد کی امید لئے دستک دیتی ہے ڈاکٹر ز کا کہنا ہے کہ ان میں کوئی خرابی نہیں بس خدا کی قدرت اور رحمت کا انتظار ہے جبکہ منشی حیات اللہ کی ماں دل پر صبر کی سہل رکھ چکی ہے وہ ہجرہ کو مایوسی سے دیکھتی اور غصہ آہ بھر کر رہ جاتی ہے وہ منشی حیات اللہ سے کئی بار دوسری شادی کا کہہ چکی ہے مگر وہ صاف انکار کر چکا ہے آج بھی ہاجرہ مصلیٰ بچائے خدا کے حضور گڑ گڑاتے

پاکستان کا ایک چھوٹا سا نواحی علاقہ ہے ہجراتی ہریالی اور قدرتی شادابی میں بے مثل ہے اس کے چار جانب کھیتوں اور لہلہائی فصلوں کی بہتات ہے جن کے بیچ میں کچی سرک ہے جو مختلف دیہاتوں کو اس علاقے سے ملاتی ہوئی گزرتی ہے۔ لوگ مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں کچی بستی کے علاوہ ہر جگہ کچے مکان اور رنگوں سے بھر پور کوشیاں اپنی بہار دکھلا رہی ہیں انہی مکانات کے درمیان منشی حیات اللہ کا گھر ہے جو تین کمروں، باورچی خانے اور باتھ روم پر مشتمل ہے اس گھر میں حیات اللہ کے علاوہ اس کی بیوی ہاجرہ اور پورے مائیں رشتہ دار رہتی ہے۔

دور بھاگتے ہوئے اسی عادت کی وجہ سے آج بچے گئے اور ہاں میں ایک روح ہوں جو آپ کی کار میں بھی غائب ہو سکتی ہوں۔“ کال کٹ گئی اور مجھے تھوڑی دیر پہلے اٹھنے والے سارے سوالوں کے جواب مل گئے۔

کار کا اسی آئے آن تھا لیکن پھر بھی میرے پسینے چھوٹ رہے تھے یہ آج کی رات اتنی طویل کیوں ہوئی تھی میں زندگی میں اتنا نہیں تھکا ہوں گا جتنا آج کی رات، میری کیفیت بدل چکی تھی، میں خود کو کتنا پر فیکٹ اور اسٹر ایک سمجھتا تھا لیکن ایک آہٹا کے مشاہدے نے میری زندگی بدل ڈالی۔ میں نے ایک دوست کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی وقت پر سارے ریڈیو چینلوں پر ایک ہی گانا چلتا ہو؟ وہ پہلے تو خوب ہنسا اور آخر میں یہ کہہ کر فون رکھ دیا کہ۔

”واٹ آ جوک۔“ بریس نے مذاق تو نہیں کیا تھا؟ بھیریا کون تھا؟ لڑکی کون تھی؟ ان سارے سوالوں کے جواب سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

جب آکھ کھلی تو خود کو اسپتال کے بستر پر پایا وہاں میری بیوی کھڑی تھی مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی اور مجھ سے چٹ گئی۔

”میں یہاں کیسے.....؟“ اس نے میرے بال سنوارتے ہوئے جواب دیا کل رات آپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا شکر ہے آپ تو بچ گئے مگر“ میں حیرت سے۔

”مگر کیا.....؟“ وہ افسردہ لہجے میں۔  
”مگر جس گاڑی کی آپ کی کار سے ٹکر ہوئی تھی اس میں سوار ایک لڑکی اور اس کا پالتو بھیریا مارا گیا۔“ آپ اسپتال میں ہو مجھے یہ اطلاع آپ کے میکسیکو کے بزنس پارٹنر نے دی..... آپ ریشن کے بعد آپ قومہ میں چلے گئے تھے اور آج تھک چوٹیں گئے بعد آپ کو ہوش آیا ہے، لیکن شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔“

آج برسوں بعد بھی مجھے وہ رات نہیں بھولی اور شاید ہمیشہ یاد رہے لیکن کافی تحقیق کے بعد بھی مجھے کچھ سوالوں کے جوابات نہیں مل سکے۔

☆☆

”پہلے شوقیہ پھر مجبوری بن گئی۔ غلط کاری کی وجہ سے سب نے اکیلا چھوڑ دیا، میں نے والدین کا دل دکھایا تھا وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن مجھے شرافت راس نہیں آئی اور سب کے سمجھانے کے باوجود ایک امیر زادے کو اپنا سب کچھ سوپ دیا اور وہ دن اور آج کا دن روز نئے امیر زادے.....“

میں غصے سے چلایا۔ ”تب ہی تو میں شراب اور لڑکیوں سے دور بھاگتا ہوں..... اپنے شوق کو مجبوری کا نام دے کر لوگوں کی ہمدردی طلب کرتی ہو۔“ دوبارہ طویل خاموشی کے بعد میں نے اس سے نام پوچھا؟ کوئی جواب نہیں ملا میں نے دوبارہ پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ لیکن پھر بھی جواب نہیں ملا تب میں نے غصے سے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو خوف و دہشت کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کیونکہ پیچھے کوئی نہیں تھا سبیت خالی تھی۔ ”یہ نہیں ہو سکتا وہ آخر کہاں چلی گئی؟ گاڑی کے دروازے بھی لاک تھے تو پھر؟“ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

”اوہ مائی گاڈ.....! کہیں وہ ڈائن تو نہیں تھی؟“ پہلے ریڈیو کے ہر چینل پر ایک ہی آئینی سوئگ کا چلنا پھر بھیرے کے کار سے ٹکرانا اور پھر اس کال گرل نما ڈائن کا یوں غائب ہونا..... یہ سب کیا ہے.....؟“ اب میں نے جانا کہ جن بھوت اپنا وجود رکھتے ہیں اور اکیلے انسان کو ستاتے بھی ہیں میں نے کار کی اسپید اور بھی تیز کر دی تھی میں کافی دیر تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہا کہ چانک موبائل کی تیل پر چوٹ کا۔

”ہیلو کون.....؟“  
آواز آئی۔ ”مسٹر اسٹینن! آپ کو صرف اس لئے چھوڑ رہی ہوں کہ آپ بھی میری طرح سچائی پسند ہیں اور غلطی کاموں میں حصہ لیتے ہیں..... ورنہ اب تک 56 لوگوں کو اپنا شکار بنا چکی ہوں۔ میں کوئی کال گرل نہیں ہوں، البتہ اپنا شکار ڈھونڈنے کے لئے کال گرل کا گیٹ اپ ضرور کرتی ہوں، میں صرف بدکار لوگوں کو اپنا شکار بناتی ہوں، تم شراب اور لڑکیوں سے

ہوئے دعا کر رہی تھی دعا مکمل کر کے اس نے جلدی سے مصلیٰ تہہ کر کے کمرے میں رکھا اور یکن میں چلی گئی وہ تیزی سے کام نہاتے ہوئے باہر بھی جھانک لیتی جہاں شام کے سائے اترنے لگے تھے اس کی ساس اس کی سبے چینی کو کچھ رہی تھی ہاجرہ نے جلدی جلدی روٹیاں پکا کر ہاٹ پاٹ میں رکھیں سارے برتن سیٹ کر باہر نکل آئی اس کے ہاتھ میں ایک پوٹی تھی جسے اس نے اپنی بڑی سی چادر کے نیچے کر رکھا تھا ہاجرہ صحن میں چار پانی پریشی ساس کی طرف چلی آئی۔

”اماں..... میں ذرا پیر سچا سرکار کے دربار پر جا رہی ہوں فشی کے آنے سے پہلے گھر لوٹ آؤں گی یہ نذرانہ دینے جا رہی ہوں اور کبھی روٹیاں بھی آج جھرات ہے ناں.....“ وہ آرام سے بولتی ہوئی ساس کو بوی امید سے سنبھلنے لگی رشیدال خاتون کے چہرے کے تاثرات کو خست ہو چکے تھے نہایت ضبط کے باوجود وہ جیسے پھٹ ہی تو پڑی تھی۔

”بس کر ہاجرہ..... بس کر..... کب تک تو میرے بیٹے کی کمائی کو یونہی اڑاتی رہے گی۔ کیا دیا ہے پیر سچا سرکار نے تھے ان دس سالوں میں.....“ ہاجرہ حق دق سی اپنی ساس کو بولتے ہوئے سن رہی تھی وہ سمجھ گئی تھی کہ آج ساس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔

”اماں ایسے نہیں بول.....“ وہ بے بسی آواز میں بولی۔

”تو کیسے بولوں..... ہاں..... ارے بی بی تو وہ بجز مین ہے جہاں سے کوئی کوئٹل نہیں پھوٹنے والی..... خالی خولی بجز.....“ وہ رشیدال بی بی کے الفاظ پر تڑپ کے رہ گئی اس کے چہرے پر کرب سا پھیل گیا تھا۔ رشیدال بی بی کو بھی اپنے سخت رویے کا احساس ہو چکا تھا..... اس نے ہاجرہ کو دیکھا اور گہری سانس بھری۔

”اچھا تو جا.....“ آہستہ سے کہہ کے وہ چار پانی پریش گئی تھی ہاجرہ مرے مرے قدم اٹھاتی پیر سچا سرکار کے مزار کی طرف بڑھنے لگی..... آج اس کا دل بھجھ سا گیا تھا اگر وہ ابھی تک اولاد سے محروم ہے تو اس میں اس

کا کیا دوش..... یہ سب تو قدرت کے کھیل ہیں اور بھلا اس کی مرضی کے خلاف کوئی کیا کچھ کر سکتا ہے؟ وہ اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی دربار کے احاطے میں داخل ہو چکی تھی اس نے ہاتھ میں پکڑی پوٹی دربار کے نگران کے سامنے رکھ دی جس نے ناتجربہ کر اسے واپسی تھمادی۔ وہ دھیرے سے قدم اٹھاتی دربار پر موجود راک درویش مست حالی کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”بابا یہ کھانا لے لو.....“ فقیر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں..... اور ہاجرہ کے بڑھے ہوئے ہاتھوں سے پوٹی تمام لی..... اس نے واپسی کے لئے قدم اٹھائے تو اس درویش نے اسے پکارا۔

”سنو بیٹی.....“ وہ درویش کی پکار پر تھم گئی اور پلٹ کر ان کو سنبھلنے لگی۔

”آزمائش کا وقت ختم ہوا..... جاؤ خدا تمہاری مراد پوری کرے..... جاؤ پیر سچا سرکار کے قدموں میں بیٹھ کر رو رو کر دعا مانگو..... آج فیض کا دریا جوش پر ہے..... تم بھی اپنا حصہ لے لو..... ضرور ملے گا..... جو بھی مانگو ملے گا..... ضرور ملے گا..... حق اللہ ہو.....“ وہ درویش خوشخبری سنا کر پھر اپنے حال میں مست ہو گیا۔

درویش کی بات نے ہاجرہ کے تن مردہ میں جیسے نئی روح پھونک دی تھی پیر سچا سرکار کے مزار پر سانکوں کی قطار بندی تھی جسب اپنی اپنی مرضی لئے حاضر ہوئے تھے وہ بھی صاحب مزار کے قدموں میں بیٹھ کے اپنا دعا پیش کرنے لگی..... اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ٹڑیاں جاری تھیں خود کو سنبھالتی وہ بے بس ہوئی جا رہی تھی، ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور قبر پر پڑے سرخ گلاب کو اڑا کر اس کی ہتھیلیوں پر رکھ گیا..... اس نے چونک کر اپنی ہتھیلیوں کے درمیان نئے پھول کو دیکھا تو اک سرشاری سی رگ وے میں دو گئی وہ اپنے قدموں درویش کی جانب بھاگی گھرا گئے ہی لمحے ٹھنک کر ٹھہر گئی..... درویش اپنی جگہ پر موجود نہیں تھے اس نے سارا دربار چھان مارا مگر وہ نہیں پرکھی نہ تھے..... وہ حیرت زدہ گھر کی جانب چل دی راستے میں درویش

کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ تب ہی ایک سرگوشی بلند ہوئی..... خوب صورت بیٹی کی آمد مبارک ہو..... آگے اس کے نصیب..... آگے اس کے نصیب..... دو دفعہ اس جھلے کی تکرار کے بعد وہ آواز معدوم ہو گئی..... وہ جھکے سے پلٹی مگر دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا..... آواز..... آواز..... آواز کس کی تھی.....؟ وہ الجھی یہ تو میں نے سنی ہے..... تب ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا..... درویش بابا..... اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

چند ہفتوں بعد ہاجرہ کے دل کی کلی کھل اٹھی جب ڈاکٹر نے اس کے مکمل معائنے کے بعد اسے ماں بننے کی نوید سنائی..... فشی حیات اللہ تو خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا جبکہ رشیدال خاتون اور ہاجرہ نے خدا کے حضور شکرانے کے نفل ادا کئے تھے پھر جلدی ہی وہ وقت بھی آ گیا جس کا انہیں 25 برسوں سے انتظار تھا..... ہاجرہ نے قریبی اسپتال میں ایک بچی کو جنم دیا تھا..... بچی کی تپائی چاند کا ٹکڑا تھی..... جس نے بھی دیکھا خدا کی منائی پر انگشت بدندان رہ گیا..... ایک شخص سی حور تھی جو آسمان سے زمین پر اتر آئی..... ماں باپ و فقیروں کو خیرات لاتے ہوئے خوشی سے سرشار ”پیر سچا سرکار“ کی عظمت کے گن گائے جا رہے تھے منت کی چادر اور نیاز کی دیکیں مزار پر پہنچادی گئی تھی فشی حیات اللہ نے اپنی بیٹی کا نام ”گل پری“ رکھا۔

گل پری نے قدم قدم چلتا سیکھا تو ماں باپ صدقے داری جانے لگے، اپنی تو قلمی زبان میں جب داوی کو پکارتی تو وہ جھٹ سے اس کی کشادہ پیشانی پر بوسہ دے ڈالتی..... بات بعد میں ہونٹوں سے نکلتی کہ جھٹ سے پوری ہو جاتی..... باپ کی انگلی تھا سے جب وہ باہر نکلتی تو راہ چلتے لوگ کچھ دیر بھر کر اس کو پیار کرتے..... جب سگراتی تو گالوں میں پڑنے والے ہنور اسے اور بھی دلکش بنا دیتے..... لڑکپن سے نکل کر شباب کی حدود میں قدم رکھا تو رعنائیوں میں وہ کھلتے ہوئے گلاب کی مانند مہک اٹھی، ہر سن و سپید رنگت جیسے

کسی نے دودھ میں گلابی رنگ گھول دیا ہو، ہنکس ستواں ناک، ہنٹے ہوئے ابرو مکمان، سرخ باقوتی ہونٹ، سفید موتیوں جیسے دانت ہنسی تھی تو اک روشتی سی پھوٹی محسوس ہوتی سیاہ غلابی چمکتی آنکھیں سرخی مائل سیاہ لامع دراز زلفیں اور قیامت خیز چمکتی چال جدھر سے گزرتی من چلے دل تمام کر رہ جاتے..... جو بھی پہنٹی ج جاتا..... میلے پکڑوں میں بھی آنکھن میں چاندنی بکھیرتی نظر آتی..... بات کرتی تو منہ سے پھول جھڑتے..... حسن و لطافت کے ساتھ ساتھ حسن اخلاق و کردار بھی لا جواب..... آواز میں سوز اور مردوں موجود..... محفل میلاد میں بعد شوق شرکت کرتی اور اپنی خوب صورت آواز میں ایک سحر ساطاری کر دیتی۔

☆ ☆ ☆

ہاجرہ کو جواں سالہ خوب صورت بیٹی کا حسن پریشان کر رکھا تھا..... اس نے محسوس کیا تھا کہ ”گل پری“ کو ایک انجانی سی خوشبو اپنے حصار میں لئے رکھتی ہے حالانکہ وہ خوشبو استعمال نہیں کرتی تھی درویش بابا کی آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونجتی رہتی تھی..... وہ جلد سے جلد اس کا اچھا سا لڑکا دیکھ کر اسے رخصت کر دینا چاہتی تھی ساس کا انتقال ہو چکا تھا جبکہ فشی حیات اللہ زمینوں کے پتھر میں الجھا رہا تھا وہ جب بھی اس سے گل پری کی شادی کی بات کرتی تو وہ ہنس پڑتا ارے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، مت فکر کریں بالواس کی..... اللہ خیر کرے گا..... اللہ فرض فشی حیات اللہ کے آنکھن کا یہ پھول ہر فکر سے آزاد پروان چڑھ رہا تھا۔

”اماں..... چلو نا مزار پر حاضری دینے چلیں..... آج میرا بہت دل چاہ رہا ہے.....“ گل پری کے اصرار بھر لپٹے میں ہاجرہ نے فوراً اسے دیکھا تھا۔

”دامخ خراب ہے تمہارا..... اس وقت زوال کا وقت ہے..... اس جھمکتی رو پھر میں جاؤ گی..... خود بھی جلوگی اور مجھے بھی جلاؤ گی ناں بھی مجھ بوڑھی میں ہمت نہیں رہی اب خاموش بیٹھی رہو.....“ ہاجرہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”پراماں..... ہمارے چلنے تک زوال کا وقت ختم ہو جائے گا..... اور دیکھو تو آج اتنی گرمی بھی نہیں ہے۔“ گل پری نے ہاجرہ کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پھر سے اصرار کیا تھا۔

”اماں..... میری پیاری اماں..... ہمیں کون سا سوہیل دور جانا ہے..... بس آدھا گھنٹہ ہی تو لگے گا..... چل ناں..... اس نے لاڈ سے اپنی بانٹیں ماں کے گلے میں ڈال لیں اور چٹا چٹ گل چوم لئے..... ہاجرہ بیٹی کی ادھر سرکرا دی۔

”اچھا ٹھیک ہے لیکن وہاں سے جلدی آنا ہوگا..... سمجھی..... مزار پر جا کے تو تم بھول ہی جاتی ہو واپسی کی راہ..... تمہارے بابا بھی بس زمینوں کے ہو کر رہ گئے ہیں..... گھر بار کی کوئی فکر نہیں..... ہاجرہ نے حای بھری۔ تو وہ فائنٹ اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی چادر اڑھٹے..... ہاجرہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر اس کی پشت پر ہلاتی لمبی چوٹی کو دیکھا تھا۔

”بھلی ہے پوری.....“ دھیرے سے بڑبڑائی تھی۔

گل پری اور ہاجرہ نے دربار کے احاطے میں جونہی قدم رکھا ہوا کے سر دھجھکوں نے ان کا خیر مقدم کیا تھا..... ہاجرہ حیران رہ گئی تھی کیونکہ گھر سے دربار تک کے فاصلے پر انہیں ایسی ہوا کا جھوٹا بھی چھو کے نہ گزرا تھا بلکہ گرمی کی شدت اور جس پہلے سے بھی بڑھتا ہوا محسوس ہوا تھا ہاجرہ نے گل پری کو دیکھا تھا جس کے خوب صورت چہرے پر ایک سکون سا پھیلا ہوا تھا سیاہ چادر میں اس کا خوب صورت چہرہ چاند کی مانند دک رہا تھا اس نے گھبرا کر اپنی بیٹی کے چہرے سے نگاہ ہٹائی تھی۔

”ماشاء اللہ چشم بدودر“ کہہ کر مزار کے برآمدے میں آن رکی تھی..... اپنی چادر کے پلو سے بندھے چند نوٹ کھول کر لوہے کے سنے بکس میں ڈالے تھے جبکہ گل پری دربار کے ایک ایک گوشے کو عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اگر بیوی کی

خوشبو فضا میں رچ کر ماحول کو سوغداری کے لہادے میں لپیٹے ہوئی تھی۔ ہر شے پر سکوت سا طاری تھا..... گل پری نے صاحب مزار کی قبر پر عقیدت سے بوسہ دیا تھا۔ چڑیوں اور کوؤں کی چکا چورے قبرستان میں گونج رہی تھی گل پری نے اپنی چادر کو درست کیا اور اپنی سیاہ غلافی آنکھوں کو بند کر لیا..... اس کے یا توئی سرخ لب ملے تھے اور اس کی پرسوز اور سحر انگیز آواز پورے مزار میں گونجنے لگی۔

حاضری کے لئے آنے والا نوجوان چوکھٹ پر ساکت و صامت کھڑا سیاہ چادر کے ہالے میں لپٹے حسن جسم کو سر ہاتھا..... جس کے نازک یوں سے نعت کے ٹٹھے بول ادا ہو رہے تھے وہ ارد گرد سے بے نیاز آنکھیں بند کئے پورے سر و روی میں ڈوبی ہوئی تھی ہاجرہ نے ابھی خوب نو جوان کو چوکھٹ میں ایسا وہ دیکھا تو ٹھٹھکی گئی..... اس نے گل پری کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

”گل پری..... اٹھو..... چلیں.....“ اس کے چہرے کے تاثرات بکڑے ہوئے تھے۔

”اوہو..... اماں..... سارا مزہ خراب کر دیا۔“ ماں نے تنبیہی انداز میں گھورتے ہوئے مزار کی چوکھٹ کی طرف دیکھا تھا۔ گل پری نے بھی ناگہی والے انداز میں ماں کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ بھی ٹپٹاسی گئی اور جلدی سے اٹھ بیٹھی..... سیاہ چادر کو خود سے اچھی طرح لپیٹ لیا۔

”اماں چلو.....“ ہاجرہ اور گل پری نو جوان کے قریب سے گزری تو بیل کی بلل ان دونوں کی نظریں ملی تھیں کتنی چمک تھی نو جوان کی بلوری آنکھوں میں گل پری نے گھبرا کر نظر جھکا لی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

مزار کے احاطے میں لگے بڑے سے برگد کے درخت کے نیچے وہ سایا انتظار بنے بیٹھا تھا ہر آنے جانے والے کو دیکھ کر چونک جاتا کہ شاید وہ آئی ہو..... مگر اس دن کے بعد وہ دوبارہ مزار پر حاضری دینے نہیں آئی تھی..... آج اسے انتظار کرتے پا نہجواں دن تھا..... یہ دن رات اس نے کس طرح گزارے تھے یہ صرف

وہی جانتا تھا..... ہر آہٹ پر چونک جاتا..... ہر چہرے میں اس کو تلاش کرتا..... ویدی کی پیا سی اکھیاں سراب ہی نہ ہو پارہی تھی دل تھا کہ ہمک ہمک کر اس کی آرزو کرتا..... بے چینی سی تھی جو اس کے رگ و پے میں بھر چکی تھی۔ اپنی جھلک دکھلانے والی سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی تھی..... اس کی سریلی گداز آواز اس کے کانوں میں گونجتی تو وہ خود پر اکتفا رکھنے لگتا۔

”کہاں چلی گئی ہو..... آ جاؤ..... آؤ دیکھو اپنے دیوانے کو ذرا.....“ وہ بے قرار سا ہو کر مزار کی طرف آنے والے کپے رستے پر آن کھڑا ہوا..... شام کے سائے جوں جوں گہرے ہو رہے تھے اس کی بلوریں آنکھوں میں چلتے دھپ بھی بجھنے لگے تھے۔ وہ سر ہجھکائے یایوں سا دوبارہ برگد کے درخت کے سنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا..... تب ہی اس کی نظر سامنے سے آتے چند افراد پر پڑی تھی وہ نہایت تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آن رکے۔

مدھم مدھم سرگوشیوں میں جانے اس سے کیا کہہ رہے تھے کہ وہ یہیں سا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

”چلو..... جانے کا وقت آ گیا ہے.....“ یہ کہہ کر اس نے پر طول نگاہوں سے مزار کو دیکھا اور آنے والے افراد کے ساتھ ہولیا۔

”آؤ آؤ صفدان..... مجھے تمہارا ہی انتظار تھا.....“ بارش بارعب بزرگ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا تھا۔

”السلام علیکم..... بابا جان.....“ صفدان نے نہایت ادب سے جھک کر ان کے ہاتھ کی پشت پر عقیدت سے بوسہ دیا تھا۔

علیک السلام..... برخودار..... انہوں نے مسکراتے ہوئے صفدان کے سر پر دست شفقت بھیرا تھا۔ مودب نظریں جھکائے صفدان اس وقت وہاں پر موجود دیگر افراد کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا وہ سب ایک قطار میں احتراماً ہاتھ باندھے کھڑے تھے صفدان کے والد نے سب کو بیٹھے کا اشارہ کیا اور اسے

اپنے قریب بیٹھالیا..... سب اپنی نشستیں سنبھال چکے تو صفدان نے اپنے والد محترم سے سوال کیا۔

”بابا جان..... آپ نے کس مقصد کے تحت یوں اچانک طلب فرمایا ہے مجھے..... کوئی خاص وجہ.....“

”ہاں..... بیٹا..... بہت اہم وجہ ہے..... خاقون قبیلے نے پھر سے شرانگیزی شروع کر دی ہے وہ قبیلے کے اصولوں کو توڑ رہے ہیں اپنے مذہب اسلام سے باغی ہو رہے ہیں..... وہ شیطانی قوتوں کے زیر اثر آ چکے ہیں۔“

”بہت مرتبہ کوشش کی گئی کہ وہ راہ راست پر آجائیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں مگر ان کی ہٹ دھرمی میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے بہت سے لوگ ان کے ساتھ مل چکے ہیں کسی کی بھی عزت و آبرو محفوظ نہیں رہی..... وہ طاقت کے نشے میں چور چور دستوں پر ظلم کر رہے ہیں..... ابھی گزشتہ دنوں انہوں نے معمولی سی بات پر بھڑک کر ہمارے چند خاص آدمیوں کو قتل کر ڈالا ہے جس کی وجہ سے تمام قبیلوں میں غم و فتنہ کی لہر دوڑ چکی ہے..... وہ سب بدلہ لینے پر تہمت ہیں..... یہ افراد جو تم یہاں دیکھ رہے ہو یہ سب مختلف قبیلوں کے معزز آدمی اور سردار ہیں یہ سب یہی مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں ایسی سخت سزا دی جائے کہ وہ دوبارہ سرکشی کی جرأت نہ کر سکیں خون بہا لینے کو کوئی بھی تیار نہیں ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو صفدان گویا ہوا۔

”بابا جان..... کیا وہ مذہب اسلام سے بھی دوری اختیار کر رہے ہیں۔“

”ہاں بیٹا..... نہ صرف خود بلکہ دوسروں کو بھی تو ہم پرستی اور بت پرستی کی ترغیب دلا رہے ہیں شیطانی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسانی بحیثیت چڑھا رہے ہیں۔“

”اوہ میرے خدا.....“ صفدان گھبرا کر کھڑا ہو گیا اس کے ہر انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

”بابا جان..... پھر تو ان کے خلاف فی الفور کارروائی کی جائے ورنہ.....“ اس نے بات ادھوری



چھوڑ دی۔

”ہاں بیٹا..... ہم سب نے تمہیں اسی مقصد کے لئے بلایا ہے..... یہ لڑائی تم لڑو گے..... مجھے یقین ہے تم ہمارے اعتماد پر پورا اترو گے“..... صفدان کے والد نے وہاں پر موجود معزز افراد کو تائیدی لگا ہوں سے دیکھا تھا۔

”ہاں..... بالکل صفدان ایک ذہین اور ہوشیار سپہ سالار ہے ہمیں اس پر پورا اعتماد ہے۔“

”آپ ہمارے سردار ہیں ہمیں آپ کے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں۔ خدا نے چاہا تو صفدان ضرور کامیاب ہوگا۔“ طیہور قبیلے کے بزرگ نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

صفدان نے سب کی رائے سنی تو ایک عزم سے بولا۔

”تو ٹھیک ہے جناب آمنون..... میں آج ہی سے ان دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاؤں گا..... قبیلے کے اصولوں کی بغاوت تک تو ٹھیک تھا مگر انہوں نے اسلام سے منہ پھیرا ہے..... تو کوں کو گمراہ کیا..... یہ جرم قابلِ معافی نہیں..... مرتد کی سزا صرف موت ہے..... صرف موت.....“ صفدان کی آنکھیں لہو رنگ ہوئی تھیں۔ صفدان کے والد فرطِ غصہ نے آگے بڑھ کر اپنی میان سے تلوار نکالی اور اس کے ہاتھ میں دے دی۔

”یہ ہماری خاندانی تلوار ہے صفدان..... خدا تمہارا حامی و مددگار ہو۔“

☆.....☆.....☆

خاقون قبیلے سے گھمسان کا رن پڑا تھا..... ہر طرف تلواروں کی جھنکار سن رہی تھی..... صفدان تیزی سے خاقون قبیلے کی صفوں میں گھسا اور انہیں گارجرموں کی طرح کاٹ کر پھینک رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی ہمت و دلیری سے لڑ رہے تھے..... مخالف قبیلے کے بہت سے افراد مارے جا چکے تھے کچھ زخمی ہو کر میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے خاقون قبیلے کا

شیطانِ سردار ”خاقون“ بھی دستِ بدست لڑائی میں شریک تھا صفدان نے اس کو دیکھا تو اس کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا اس نے آگے بڑھ کر خاقون کو مقابلے کی دعوت دی..... دونوں گھوڑوں سے اتر کر زمین پر آگئے دونوں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر تلوار سے وار کر رہے تھے اس سے پہلے کہ صفدان کا داؤ اس پر چلتا خاقون نے تیزی سے تلوار سے وار کیا تھا جو اس کی ران پر گہرا اثر لگا گیا..... صفدان کے ہونٹوں سے ”آ“ نکلی تھی اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا..... تکلیف کی شدت بڑھ چکی تھی خاقون نے جب صفدان کو بے بس پایا تو آگے بڑھ کر اس کا سر تلوار سے الگ کرنا چاہا کہ اسے میں اس کے ساتھی آگے آگئے خاقون گھبرا کر میدان چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

صفدان بے ہوش ہو چکا تھا..... اس کے ساتھی اسے اٹھا کر طبیب کے پاس لے آئے تھے رات کو اس کے والد فرطِ غصہ اس کی عیادت کے لئے آئے تو بہت متشکر اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ صفدان ان کی کیفیت کو خوب سمجھ رہا تھا وہ ان کا اٹھوتا بیٹا اور چائین تھا اس سے چھوٹی دو بیٹیاں سن اور کلبلیہ تھیں والدہ حیات نہیں تھیں۔ فرطِ غصہ نے انہیں نہایت شفقت اور محبت سے پروان چڑھایا تھا ان کی تربیت و تعلیم میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی۔ اس کے بابا خود بہت بڑے عالمِ دین تھے لوگوں نے ان کے علم اور کردار کو دیکھتے ہوئے ان کو ناسردار بتایا تھا۔

”باباجان..... آپ پریشان مت ہوئے..... میدان جنگ میں تو یہ ہوتا ہی ہے ناں.....“ اس نے ان کو برداشت کرتے ہوئے تھابت زدہ لہجے میں فرطِ غصہ نے دیر سے سر ہلادیا۔

”جانتا ہوں بیٹا..... خاقون بہت سرکش جا رہا ہے۔“ وہ فکر مند سی گویا ہوئے۔

”جی باباجان..... انشاء اللہ میں اس سرکش خاتمہ کر کے ہی رہوں گا یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ مجھے یقین ہے تم اسے ختم کر سکتے ہو مگر.....

وقت تم زخمی ہو اور تمہاری جان کو طانوح کی طرف سے شدید خطرہ لاحق ہے۔“

”بابا..... میں خطروں سے نہیں گھبراتا۔“

”صفدان میں چاہتا ہوں، کہ تم صحت یاب ہونے تک کہیں روپوش ہو جاؤ طانوح کی پہنچ سے دور..... جہاں اس کے ہر کارے تم تک نہ پہنچ سکیں۔“

”باباجان..... آج مجھے بزدلی کا سبق دے رہے ہیں۔“ تیرہ بجے میں یولا گھر دوسرے ہی پل کراہا تھا۔

”یہ بزدلی کا سبق نہیں ہے صفدان بیٹا..... یہ مصالحت ہے بس چند دن کی بات ہے..... جب تم صحت یاب ہو جاؤ تو لوٹ آنا..... طانوح کو تم ہی شکست دے سکتے ہو بشرطیکہ..... تم زندہ ہو۔“ فرطِ غصہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”مگر میں جاؤں گا کہاں.....؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اپنے والد کو دیکھنے لگا اس کی بات سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے پھر حوان کے لیوں سے نکلا تھا اسے سن کر صفدان ششدر سا ہو کر انہیں نکلنے لگا۔

”بہتر چار کار.....“

بہت سی یادیں اس کے دل میں کھلبلی مچا گئی تھیں جبکہ فرطِ غصہ کے لیوں پر معنی خیز کراہت درآئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر کے وقت گل پری اپنی سبیلی کے گھر سے واپس آ رہی تھی تو اسے اپنی گلی میں بچوں کا جھوم دکھائی دیا جو جانے کس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے کوئی ہوگا مداری والا تماشا دکھائے گا اور چلتا بنے گا چلا آج میں بھی دیکھ لیتی ہوں۔ وہ خود سے باتیں کرتی بچوں کے جھوم کے پاس پہنچی تو ایک بچہ ہاتھ میں پتھر لئے نظر آیا۔

”ارے یہ کیا کر رہے ہو.....؟“ وہ مزید آگے بڑھی تو ایک زخمی بلا دکھائی دیا..... سفید رنگ کا پھوٹا سا بلا..... جس کی ٹانگ پر بہت گہرا زخم تھا زخم سے رستا ہوا خون اسے بے چین کر رہا تھا وہ جلدی سے آگے بڑھی تھی۔

”بابا جی رک جاؤ یہ تمہیں کاٹ لے گا۔“ جھوم میں

سے ایک بچے نے پکارا تھا۔ گل پری نے پلٹ کر بچوں کو گھورا۔

”یہ زخمی ہے..... اسے مدد کی ضرورت ہے..... یہ مجھے کچھ نہیں کہے گا..... چلو بھاگو.....“

بھاگو یہاں..... سے چلو..... وہ انہیں ڈانٹتے ہوئے نیم جاں بے کوا احتیاط سے اپنی آغوش میں لے لیا۔

”اوہو..... تم تو بہت زخمی ہو.....“ بچے ادھر ادھر کھسک گئے تھے گل پری بے کواٹھا کر گھر لے آئی۔

اس نے زخمی بے کوا زمین پر لٹا کر احتیاط سے زخم کو صاف کر کے مرہم پٹی کی..... اور پھر دودھ سے بھرا ہوا پیالہ لاکر اس کے سامنے رکھ دیا بے کوا دودھ ختم کیا تو وہ اسے محن میں دیوار کے ساتھ بٹے ہوئے چھوٹے سے ڈربے میں لاکر لٹائی..... ڈربہ کافی کھلا

اور ہوا دار تھا اسے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی وہ مطمئن سی ہو کر چلی گئی یہ ڈربہ اس نے ننھے ننھے چوڑوں کے لئے بنوایا تھا چوڑے تو آوارہ بلی کی خوراک بن گئے تھے مگر اب یہ ڈربا زخمی بے کوا کے کام آ رہا تھا شام کو منشی حیات گھر لوٹا تو ڈربے میں زخمی بے کوا ستراحت پاکر

سنگرا یا پتھنا پتھن گل پری کا کارنامہ ہوگا وہ ایسی ہی مٹی نرم خواور محبت کرنے والی..... منشی حیات اللہ کو اپنی بیٹی کی یہ

حادث بہت بھائی تھی۔

حجر کی نماز ادا کرنے کے بعد درود شریف کا وظیفہ مکمل کیا تو گل پری پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تھا۔

معطلی اٹھا کر دوبارہ بستر پر آن لٹتی تو کچھ ہی دیر میں نیند میں ڈوب گئی دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تو سورج پوری

آب و تاب سے جگمگا رہا تھا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

”ارے اتنا وقت ہو گیا..... اوہو..... اماں بے چاری کوا کیلئے ہی سارا کام کرنا پڑا ہوگا..... اور بابا.....

ارے بابا نے تو آج شہر جانا تھا..... اوہ خدا یا..... وہ جلدی جلدی دوپٹہ اوڑھتی سلیر پاؤں میں اڑتی باہر بھاگ گئی تھی..... سارا محن صاف سہرا تھا..... لیکن میں

جھانکا تو وہ بھی چمک رہا تھا..... اماں..... اماں..... گل پری باجرہ کو پکارتی اس کے کمرے کی طرف بڑھی تھی اسی

خونفاک کہانیاں

74

اپریل 2018ء

انشاء میں ہاجرہ کمرے سے آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکل آئی۔

”کیا بات ہے گل پری..... صبح ہو گئی کیا..... ارے یہ تو دن چڑھ آیا ہے..... جاؤ جلدی سے ناشید لے آؤ..... میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں..... آج تو تم نے گھر کو خوب چکار کھا ہے۔“ ہاجرہ تو صبی نگاہوں سے ارد گرد دیکھتی ہے حیران چھوڑ کر دوش روم میں چلی گئی۔

”یہ اماں کو کیا ہوا ہے..... میں نے..... یہ میں نے کب کیا بھلا..... میں تو خود سوری تھی۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی مگر کچھ یاد آنے پر وہ ڈربے کی طرف چلی آئی جہاں زخمی بلا موجود تھا وہ آرام سے لیٹا ہوا تھا آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر گل پری کو دیکھا اور ”میاؤں میاؤں“ کی آواز نکال کر گویا اسے صبح بخیر کیا تھا۔ گل پری نے مسکرا کر اس کے سر کو تھپکا تھا تب ہی اس کی نظر اس ٹائٹ پر کی گئی پٹی پر پڑی تھی پاس ہی دودھ والا پیالہ بھرا پڑا تھا۔ پہلے تو حیران ہوئی پھر سر جھٹک دیا کیا پتہ بابا نے جاتے ہوئے اس کی پٹی تبدیل کر کے ہوا اور دودھ بھی ڈال دیا ہو۔

رات کو جب منشی حیات اللہ شہر سے لوٹا تو گل پری نے بے چینی سے اس سے سوال کیا تھا۔

”بابا..... آپ آج صبح ہی شہر چلے گئے.....“

”ہاں..... بیٹی تمہیں بتایا تو تھا پچھری جانا ہے زمینوں کے کام کے سلسلے میں۔“ منشی حیات اللہ نے روٹی کا ٹوالہ توڑ کر منہ میں رکھا۔

”اچھا..... بابا یہ بے کٹی پٹی آپ نے تبدیل کی تھی کیا.....؟“

”میں نے..... نہیں تو..... میرے سامنے تو تم نے ہی تو بدلی تھی اور دودھ بھی ڈالا تھا۔“

”میں نے.....“ وہ چونک کر منشی حیات اللہ کو دیکھنے لگی جو کھانا کھانے میں مصروف تھا۔

”ہاں تم نے..... مجھے بیدار کرنے کے بعد تم ہی نے تو کیا تھا..... کیا بات ہے گل پری۔“ آپ کے بار منشی حیات اللہ بھی چونکا تھا اس کے چہرے پر انھن کے

آٹا مارا بھرے تھے۔

”کچھ نہیں بابا..... میں بھی ناں..... بھٹک رہی ہوتی جا رہی ہوں بھول گئی تھی۔“ وہ ماتے پر ہاتھ مارتے ہوئی ہوئی تو منشی حیات اللہ ہنس دیا۔

”بادام کھایا کر..... دماغ کو طاقت پہنچتی ہے۔“ گل پری کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی لیکن اسے بہت سے سوال پریشان کر گئے تھے۔

اب تو اکثر ہی ایسا ہونے لگا تھا کہ جب بھی وہ کئی کام کرنا چاہتی کوئی ناویدہ ہستی اس سے پہلے وہ کام سرانجام دے دیتی۔ ابھی کل شام ہی کی تو بات تھی جب بابا نے اسے چائے طلب کی تھی لیکن جیسے ہی وہ کچن میں گئی چائے پہلے ہی سے تیار ملی..... گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے..... وہ حیرت سے کتنی ہی دیر تک بیٹھی کودیکھتی رہی تھی..... اس نے نوٹ کیا تھا جب وہ گھر پر تنہا ہوتی ہے کوئی اس کے آس پاس رہتا ہے..... ایک انجانی سی خوشبو اس کا حصار کھے رکھتی ہے کوئی ہے جو اس کو اپنی نگاہوں کے حصار میں قید رکھتا ہے پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیا تھا مگر آج جب وہ غسل کر کے آنے کے سامنے کھڑی اپنے دراز بالوں کو سلجھا رہی تھی تو اس کے کانوں کے قریب ایک سرگوشی ہوئی تھی۔

”بہت خوب صورت ہو گل پری..... بہت پیاری.....“

”ج.....“ وہ گھبرا کر چیخے بیٹھی تھی لیکن کمرے میں کیسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا کمرے کی کھلی کھڑکی سے چند قدم دور وہ زخمی بلا اسے بہت غصہ سے دیکھ رہا تھا اس کی سبز آنکھوں میں ہلا کی چمک تھی اور پراسراریت بھی..... جانے گل پری کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس نے ان آنکھوں کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے..... وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کھڑکی کے پاس آئی تو وہ میاؤں میاؤں کرتا بے چین ہونے لگا۔ گل پری نے بہت توجہ سے اس کو دیکھا تھا..... یہ آنکھیں وہ پر سوچ انداز میں نظریں ادھر ادھر گھمانے لگی۔

”ارے ہاں..... یہ آنکھیں..... یہ تو.....“

سرکار..... وہ نوجوان.....“ وہ دھک سے رہ گئی تھی۔

”تو کیا.....؟ نہیں.....“ دوسرے ہی پل اس نے اپنے خیال کی خود ہی نفی کر دی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ممکن نہیں..... یہ جانور..... اور وہ انسان۔ صفوان کا عشق شوق مجازی تھا اور وہ بھی غیر فطری..... کیونکہ وہ ایک جن زادہ وہ ایک آدم زادی..... وہ جانتا تھا کہ ان دونوں کا ملاپ ممکن نہیں ہے وہ چاہتا تو ایک جن ہونے کا فائدہ اٹھا کر اسے زیر کر سکتا تھا مگر یہ اس کے عشق کو گوارا نہ تھا کہ وہ اس کو اذیت پہنچائے یا اس کی ذات کی وجہ سے اسے نقصان پہنچے وہ اپنے قبیلے اور اپنے بابا کے سکھائے اصولوں سے منحرف ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس کے بابا نے اسے ہمیشہ انسانوں کی عزت کرنے کا حکم دیا تھا انہوں نے اسے درس دیا تھا کہ وہ ہمیشہ آدم زادوں کی ہستی سے دور رہیں اگر بالفرض ان کی ہستی سے گزر بھی ہو تو انہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے نہ ہی ان کے مال و جان کے ورپے اور نہ ہی ان کے بیو، بیٹیں کو اپنے زیر تسلط لا کر غلط کاریاں کریں۔ مسلمان کا خاص طور پر احترام کرے اور ایک مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچائے۔ اس کے بابا فرطہوش تھے سے ان اصولوں پر کاربند رہے اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے رہے۔ خاتون قبیلے نے ان اصولوں سے انحراف کیا اور اسلام سے ہی پھر گئے جن کی سرکوبی کے لئے صفوان کا انتخاب کیا گیا تھا اس کے والد فرطہوش اپنے قبیلے کے سردار اور شہنشاہ جنات کے خاص تھے شہنشاہ و جنات ان کے علم اور حکمت کی بہت قدر کرتے تھے خاتون قبیلے کو ختم کرنے کا فیصلہ شہنشاہ جنات سے مشورے کے بعد ہی کیا گیا تھا۔ اپنے قبیلے کی تمام زندگی صفوان کر رہا تھا علم و ذہانت، خوبصورت اور خوب سیرتی میں اپنی مثال آپ خاندان یا سام فرطہوش فرزند صفوان بن فرطہوش ایک آدم زادی پر دل ہار چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کو گھر میں آئے ایک ماہ ہونے کو تھا..... اس کا ذمہ بھی پہلے سے کافی منہ دل ہو چکا تھا پری نے محسوس کیا تھا جوں جوں اس کا ذمہ بھرا جا رہا ہے وہ کافی بے چین اور اداس رہنے لگا تھا بھلا سادہ سکرانی ہوئے اس کے پاس نیچے زمین پر بیٹھ کر اور دھیرے دھیرے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”تم بہت اداس ہونا..... تمہارا یہاں سے جانے کو بھی نہیں چاہ رہا تو مت جاؤ رک جاؤ۔“ وہ پیار سے بولتی ہوئی گویا اس کے دل کا حال ظاہر کر رہی تھی بے کی آنکھوں میں نامعلوم سی اداسی رہی ہوئی تھی۔

”گل پری بیٹا.....“ ہاجرہ کی پکار پر اس نے سرگھما کر ماں کو دیکھا تھا۔

”جی اماں.....“ کہہ کر وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں ڈرا پڑوں میں جا رہی ہوں..... دروازہ اچھی طرح بند کر لو اندر سے..... مجھے کچھ دیر لگے گی آنے میں۔“ ہاجرہ چار دروازے تو بے کمر رہی تھی۔ ہاجرہ دروازے کی طرف بڑھی تو وہ اٹھ بیٹھی۔

”اچھا تم یہی رکو..... میں ابھی آتی ہوں۔ تمہارے لئے دودھ بھی پینے آؤں گی۔“ وہ بے کو مخاطب کرتے ہوئے چل دی۔

دروازہ بند کر کے باورچی خانے میں سے دودھ سے بھرا گلاس اٹھایا اور ڈربے کی طرف چلی آئی..... وہ دھک سے رہ گئی۔

”ارے..... یہ کہاں چلا گیا.....“ ڈربہ خالی تھا بلا وہاں موجود نہیں تھا اس نے سارا گھر دیکھا۔

”لق دی قی سخن میں بیچے تخت پر بیٹھ گئی..... ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو یہاں موجود تھا۔ وہ تخت رنجیدہ اور اداس سی ہونے لگی خالی خالی نظروں سے اس نے ڈربے کی جانب دیکھا تھا تب ہی ایک تیز اور دلچسپ سی خوشبو اس کے نشتوں سے نگرانی بھی جو نبی اس نے پلٹ کر دیکھا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... ایک حیران کن منظر اس کے سامنے تھا وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی

ہوئی..... ایک خبر دو جوان اپنی خوب صورت مسکراہٹ سمیت اس کے پیچھے کھڑا تھا..... سفید روشن لباس میں ملبوس..... سرخ و سپید رنگت خوبصورت سی ٹیکسی ناک، بگلابی ہونٹ، مہنری بال جو نہایت نفاست سے تراشے ہوئے تھے سبز ٹیکسوں آنکھیں جن پر یہ دراز پلکیں لرز رہی تھی دراز سراپا اور چہرے پر جتنی ہلکی سی مسکراہٹ اس کی شخصیت کو مزید پروقار بنا رہی تھی۔

”تم یہاں.....؟“ گل پری کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”جی..... میں..... یہاں..... آپ کا زخمی بلا..... وہ دھیمے مگر شوخ لہجے میں بولتا گل پری کو دیکھتا رہا تھا۔“

”ز..... زخمی..... بلا.....“ وہ حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

”جی.....“ وہ بدستور شوخی سے بولا تھا۔ اس کی سبز آنکھوں میں شرارت تھی۔

”مذاق کر رہے ہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا..... وہ تو چھوٹا سا جانور..... اور آپ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

”میں مذاق نہیں کر رہا گل پری..... میں ہی وہ زخمی بلا ہوں جسے آپ اٹھا کر گھر لے آئی تھی۔ اور میں وہی نو جوان ہوں جو یہ سچا سرکار کی چوکتھ پر اپنا دل ہار آیا تھا۔“

”میں آپ کی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں..... آپ کو یقین نہیں..... یہ دیکھئے.....“ اس نے اپنی شلوار اور پری تو وہ چھٹی چھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی اس کی ٹانگ پر زخم کا دیباہی نشان تھا جو زخمی ہلکے کی ٹانگ پر تھا۔

”اس سے پہلے کہ میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں..... میں آپ کے سامنے کچھ کہنا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو تو کہہ ڈالوں.....؟“ اس نے اجازت طلب لگا ہوں سے پری کو دیکھا تھا جو ہونٹوں کی طرح کبھی اسے دیکھ رہی تھی تو کبھی غالی دڑبے کو۔

”بولیں.....“ وہ کھوٹی کھوٹی سی بولی تھی اس کی

آواز اس کا مدغم لہجہ ایسا تھا جو گل پری کو مسما کر کر رہا تھا۔

”میرا نام صفدان بن فطیموش ہے میرا تعلق جنات کے قبیلے سے ہے مجھے سروسایات اور مزاروں پر حاضری دینے کا بہت شوق تھا یہی شوق مجھے تمہارے خوب صورت علاقے میں بھیج لایا اور یہ سچا سرکار کے مزار پر حاضر ہونے کا شرف بخشا ہو سکتا تھا کہ میں حاضری دے کر خاموشی سے واپس لوٹ جاتا مگر مزار کے اندر سے گونجنے والی آواز نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں انسانی روپ میں آ کر اس

خوب صورت پری کا چہرہ دیکھوں میں بس یہی میری خطا تھی جو میں نے آپ کا حسن مجسم سراپا دیکھا۔ تب سے لے کر اب تک میں نے خود کو آپ کی محبت میں جکڑا پایا ہے میں دن رات میرے سچا سرکار کے مزار پر رہنے لگا کہ شاید آپ دوبارہ آؤ مگر انتظار انتہائی رہا ایک روز میں یونہی اداس بیٹھا ہوا تھا کہ میرے ساتھیوں نے مجھے

بابا کا پیغام دیا کہ میں فوراً واپس آ جاؤں..... میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا مگر والد کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا آپ کی حسرت لئے واپس قبیلے لوٹ گیا وہاں چند شیطانی قوتوں نے شرانگیزی پھیلا رکھی تھی جن کی سرکوبی کے لئے مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی میں نے زبردست قسم کی لڑائی کی جس کے نتیجے میں، میں زخمی ہو گیا اور وہ فرار ہو گئے مجھے چند دن دور چلے جانے کا کہا تو پھر

یہاں آ گیا پہلے لوگوں کی نظروں سے بچ کر مزار پر دن گزارے مگر جب آپ نہ آئی تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پہلے کا روپ دھار کر آپ کے ہمراہ اوجھڑ گیا آگے جو کچھ پیش آیا آپ اس سے بخوبی واقف ہیں آپ کے سارے کام میری چھوٹی بہن کیلئے کرتی ہے وہ آپ کو بہت پسند کرنے لگی ہے اور اس کا سر بھرا ہوا بھائی تو آپ کا دیوانہ ہے۔“ آخر میں وہ شوخی سے سر جھکا کر بولا تھا۔

”کچھ دیر پہلے مجھے بابا کی جانب سے پیغام ملا ہے کہ اب واپس آ جاؤں تاکہ شیطانی قوتوں کے

”خوفناک کہانیاں [78] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء

”خوفناک کہانیاں [79] اپریل 2018ء



ہاجرہ جلدی جلدی پانی سے بھرا گلاس لے آئی  
تھوڑا سا پانی چہرے پر چھڑکا اور دھیرے سے اس  
کو بلایا۔

”پری..... پری.....“ گل پری نے آہستگی سے  
آنکھیں کھول دیں۔  
”کیا ہوا میری بچی..... کچھ تو بول۔“ وہ اسے  
اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی۔

اس کے ذہن میں سارے واقعات روشن ہو گئے  
اور صفدان کے ساتھ کیا محبت کا اقرار بھی..... اس نے  
خود پر قابو پاتے ہوئے فنی میں سر ہلایا۔

”کچھ نہیں پتہ نہیں..... بس یونہی چکر سا  
آ گیا تھا۔“ وہ ہاجرہ کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولی۔  
”تمہارے بابا آجائیں تو پھر ڈاکٹر کے پاس  
جانا..... دوا لے لیتا۔“

”خدا جانے کون سا چکر..... وہ نگر بندی سے  
بولی۔  
”ہاں اماں چلی جاؤں گی۔“ وہ آنکھیں موندتے  
ہوئے بولی۔

”تب ہی ہاجرہ کی نگاہ ڈربے کی طرف اٹھی۔“  
”یہ بلا کہاں ہے۔؟“  
”اماں..... مجھے نہیں پتہ..... چلا گیا ہوگا۔“ وہ  
آنکھیں بند کئے ہوئے بولی فنی مہاد اماں اس کی  
آنکھوں سے کچھ اندازہ نہ لگا لیں۔

”چلو خبر ہے..... اک نہ ایک دن تو اس نے چلے  
جانا تھا۔“ ہاجرہ مطمئن سے انداز میں اس کے بالوں  
میں ہاتھ پھیرنے لگی جبکہ گل پری کے سر میں درو سے  
اٹھتا تھا..... اس کی چٹکیں غم ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

صفدان کو واپس قبیلے میں لوٹے چار دن ہوئے  
کوآئے تھے کوئی بھی لمحہ ایسا نہ گزرا تھا جس میں اسے گل  
پری کو یاد نہ کیا ہو..... اب بھی ضروری کام نٹانے کے  
بعد وہ یونہی پہل قدمی کرتے ہوئے پرسکون گوشے کی  
طرف چلا آیا..... وہ گل پری کے تصور میں پوری

مستغرق تھا جب اس کا بازو کسی نے زور سے ہلایا تھا وہ  
چونک کر پڑا۔

”ارے بابا جان آپ.....“ وہ حیران ہوا۔  
”کیوں..... میں نہیں آ سکتا۔“ فرط ہوش کے  
ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی صفدان گہرا گیا۔  
”نہیں بابا جان..... آ سکتے ہیں لیکن بہتر ہوتا کہ  
آپ مجھے بلو لیتے۔“ وہ سر جھکا کر بولا۔

فرط ہوشی نے بیٹے کو نینور دیکھا تھا کس قدر پر مژدہ  
اور پریشان دکھائی دے رہا تھا وہ کافی دنوں سے دیکھ  
رہے تھے کہ وہ کافی الجھا ہوا رہنے لگا ہے پہلے تو وہ بھی  
سمجھے کہ طانوح قبیلے کے سرکشوں کی وجہ سے پریشان ہے  
مگر چند دن بعد ان کے سامنے سارا معاملہ آ گیا تھا کہ  
وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی مسکراہٹ سے کیوں محروم ہیں  
فرط ہوش نے ایک گہرا سانس سینے خارج کیا تھا اور گرد  
کے سرسبز و شاداب مناظر پر نگاہ کر کے انہوں نے  
صفدان کو دیکھا تھا جو بدستور سر جھکائے جانے کہاں گم  
تھا۔

”کوئی پریشانی ہے تو کہہ کیوں نہیں دیتے  
صفدان بیٹا۔“ فرط ہوش کی آواز اس کی سماعت سے  
نکرائی تو وہ ایک دم جیسے ہوش میں آیا تھا۔  
”ن..... نہیں..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں  
بابا.....“

”کچھ تو ہے بیٹا جی جو چھپا رہا ہو.....“ ان کے  
لبے میں معنی خیزی در آئی تھی۔

”میں تمہارا بابا ہوں..... تمہاری رگ رگ سے  
واقف..... اور یہ بات بھی تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم  
مجھ سے کچھ چھپا نہیں سکتے تمہاری آنکھیں کیا ہے میں اس  
سے اچھی طرح واقف ہوں..... فنی حیات اللہ کی بیٹی  
گل پری۔“ آخر میں انہوں نے جو کہا تھا اسے صفدان  
ساکت رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

گل پری کے معمولات زندگی میں حیران کن  
تبدیلی دیکھی تھی جسے فنی حیات اللہ نے محسوس کیا تھا

اس کی شوخیاں اور شرارتیں ختم ہو گئیں تھیں اس کی  
کھدکی و مسامتت میں اضافہ ہو رہا تھا نماز تو وہ پہلے بھی  
پڑھتا کرتی تھی لیکن اب راتوں کو بھی اٹھ کر خدا کی بارگاہ  
میں سر جھکانے لگی تھی اس کے اور اور دعا کف بڑھ چکے  
تھے اس کے ہونٹوں پر ہر لمحہ ”درو پاک“ کا درد جاری  
رہتا۔ کبھی کبھی تو یوں بھی محسوس ہوتا جیسے اس کا پورا  
وجود ہی ذکر میں مشغول ہو۔ ایک روشنی کا سا ہالہ تھا  
جس میں اس کے وجود کے گرد گہرا ڈالے رکھتا تھا ایک انجانی  
کسی خوشبو جی جو پورے آنکھن میں بکھری رہتی اکثر ہاجرہ  
کامی جاہتا کہ وہ گل پری سے اس بارے میں کچھ  
پوچھے مگر ایک ان دیکھا خوف اسے اپنے سحر میں  
پکڑ لیتا کہ باوجود کوشش کے کچھ کہہ نہ پاتی خوب صورتی  
تو پہلے خدا نے اسے عطا کی تھی مگر اب اس کی شخصیت  
میں عجب وقار سا بھی امنڈ آیا تھا جو بھی دیکھتا خود بخود  
اس کا احترام بھالا تھا..... جو بھی تھا گل پری پر  
ظہاوندی برس رہی تھیں جبکہ وہ خود اس بات سے بے  
خبر اس کے حضور دل و سر سرور میں مشغول وہ خود سے  
بے نیاز تھی وہ بے خبر تھی کہ آنے والا وقت اس کی  
ہولی میں کیا دے رہا ہے۔

☆.....☆.....☆

”صفدان..... کیا تم ایک آدم زادی سے محبت  
کر کے قبیلے کے اصولوں کے منافی نہیں جا رہے؟ تم  
خدا کی عداوت کے مرتکب نہیں ہو رہے۔“ فرط ہوش بارعب  
امرازا اختیار کئے صفدان کو ڈانٹ رہا تھا۔

”بابا جان! محبت کرنا اپنے اختیار میں کب  
ہوتا ہے.....؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں ہم دونوں کا  
علاقیہ ممکن نہیں پر اس کے باوجود میں اسے چاہتا ہوں کہ  
میں نے اس کی روح سے محبت کی ہے جسم سے نہیں.....  
اس کی نیک سیرتی سے عشق کیا ہے خوب صورت سے  
نہیں..... آج بے فکر رہے میرا دامن ہوں جیسی کنڈگی  
سے آلودہ نہیں ہے گل پری کی محبت نے مجھے خدا کے  
قریب کیا ہے غافل نہیں..... رہی قبیلے سے خداری کی  
ات..... تو میں ایسا کرنا تو درکنار سوچ بھی نہیں سکتا.....

میں فرط ہوش کا بیٹا ہوں..... شیطان کا چیلہ ہرگز نہ بنوں  
گا۔“ وہ اٹل لہجے میں بولا تھا۔  
”صفدان..... انتم کھاؤ کہ ایک آدم زادی کی  
محبت تمہیں تمہارے فرائض سے غافل نہیں کرے  
گی۔“

”بابا جان میرا وعدہ ہے آپ سے..... ایک آدم  
زادی کی محبت مجھے اپنے فرائض سے کبھی دور نہیں کر سکتی  
میں بے شک اس سے محبت کی ہے مگر سب سے پہلے  
میرے لئے میرا فرض اہم ہے اس کا ثبوت بہت جلد  
آپ کے سامنے آ جائے گا طانوح کی موت کے  
ذریعے۔“

”میں بہت خوش ہوں صفدان بہت زیادہ.....  
مجھے گل پری سے شکایت نہیں اور نہ ہی تمہاری محبت  
پر کوئی اعتراض..... بس حدود اللہ کا خیال رکھنا.....  
انہیں بھی تو زنا مت و در نہ نیست دنا بود کر دیئے جاؤ گے  
جیسے کہ تم سے پہلے لوگ حدود اللہ توڑنے کی وجہ سے  
عبرت کا نشان بنا دیئے گئے۔“ فرط ہوش اپنے بیٹے سے  
والہانہ محبت اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

”بابا جان..... انشاء اللہ آپ کو کبھی شکایت کا  
موقع نہ دوں گا۔“ صفدان نے ایک عزم دھولے میں  
کیا تھا۔ جبکہ فرط ہوش نے آگے بڑھ کر صفدان کی صلیج  
پیشانی پر بوسہ ثبت کیا تھا۔

”جیتے رہو خدا تمہارا نگہ دار میرے بیٹے۔“

☆.....☆.....☆

آدھی رات کا وقت تھا..... ہر شے کوتاہی نے  
اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا پر سکوت فضا میں مختلف جنگلی  
جانوروں کی آوازیں گونج کر ماحول کو مزید پر اسرار  
بنارہی تھیں چاند کی آخری تار بچیں تھیں جس کی وجہ  
سے اس تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دے رہا تھا  
صفدان طانوح کی تلاش میں کٹھن اور سانپوں پرانے  
تاریک جنگل میں گھوم رہا تھا اس کو پتہ چلا تھا کہ  
طانوح اور اس کے ساتھیوں نے فرار ہونے کے  
بعد اس جنگل میں موجود ایک سانپ کو رہ مندر میں پناہ

## گہرا راز



اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ شہر یہ ادا کرنا چاہ رہی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نورین نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"ذیبتہ آخرا کسی بھی کیا بات ہے آپ مجھے اس حویلی میں جانے کی اجازت کیوں نہیں دیتے ہیں جو دادا جان نے میرے نام کر دی تھی؟ ایسا کیا راز پوشیدہ ہے وہاں جو کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے؟ مجھے اب یہ خاموشی برداشت نہیں ہوتی ہے جو آپ حویلی کا نام سننے ہی اختیار کر لیتے ہیں۔"

اسد حقیقت جاننے کے لیے بے ہمت تھا۔

"مجھ سے بحث کیا کرو۔ ایک بار کہہ جو دیا ہے کہ نہیں جانا تو بس نہیں جانا ہے وہاں۔ دوبارہ میرے سامنے حویلی کا ذکر مت کرنا۔" دانش صاحب اتنا کہنے کے بعد اپنے کمرے کی جانب چلے گئے تھے۔

اسد اور فائق دو بھائی تھے۔ ان کی کوئی بہن نہ تھی۔ اسد کی پیدائش کے موقع پر والدہ آسیہ بیگم وفات پا گئی تھیں لیکن دانش صاحب نے دوسری شادی نہیں کی۔ گھر میں ملازموں کی فوج تھی۔ زمیندار دانش صاحب کے دونوں بیٹوں کے لیے چار ملازم ہر وقت موجود ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈرائیور اور مالی بھی محل نما کوٹھی میں بڑی ایمانداری سے کام کر رہے تھے۔ دیہات سے شہر میں آنے کے بعد دانش صاحب کی ایک پریشانی تو دور ہو گئی تھی کہ اب بیٹے بہترین تعلیم حاصل کر لیں گے لیکن فائق نے فقط ایف۔ اے کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ فائق کی مکتبی بچپن میں ہی

مکراہت کھینچ گئی۔

☆.....☆.....☆

مکمل پری محاسن تھی جب وہ ایکدم اٹھ بیٹھی..... اس کے چہرے پر کھٹکھٹ کے آثار تھے جیسے وہ کسی چیز پر غور کر رہی ہو..... کئی دن سے اسے ایک خواب مسلسل پریشان کر رہا تھا اس نے دیکھا تھا کہ ایک بزرگ ان کا چہرہ نہایت نورانی اور شخصیت پر وقار و رعب دار ہے وہ اس سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"مکمل پری بیٹا..... فانی کی طلب مت کرو اپنی اصل کو دیکھو غیر کی محبت دل سے نکال کر اپنے رب کے حضور بندہ رہو جو اپنے خدا کی طرف سے رحمت کی برسات دیکھو کیسے برکتی ہے..... اسے اپنا جو رب کی چاہت ہے وہ تمہیں وہ عطا کر دے گا جو تمہاری چاہت ہے اگر تم روحانی منازل تیزی سے طے کرنا چاہتی ہو تو یہ وظیفہ دور و نزدیک مکمل کر لو انشاء اللہ ساری مشکلیں آسان ہوں گی۔"

وہ بزرگ اسے وظیفہ بتا کر غائب ہو گئے تھے ابھی بھی اس نے یہی خواب دیکھا تھا وظیفہ اسے یاد ہو چکا تھا..... دل ہی دل میں وہ ایک فیصلہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور وضو کرنے کے لئے واش روم کی طرف چل دی۔

☆.....☆.....☆

دوسری طرف طانوح اور اس کے چیلوں سے صفدان کی مدد بھیڑ ہو گئی صفدان اس کے چیلوں کو ختم کر کے طانوح کی طرف آگے بڑھا مگر اس کی طرف پھونک ماری اور وہ وہیں پتھر کا ہو گیا مگر پھونک مارنے سے پہلے صفدان کے ہاتھ میں موجود پنجر اس نے طانوح کی طرف پھینک دیا جو سیدھا اس کے دل کے مقام پر جا لگا اور طانوح وہیں بنایا پانی کے پھل کی طرح تڑپنے لگا صفدان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا مگر مرتے طانوح نے اس کو بھی پتھر کا بنا دیا تھا۔

☆☆

لے رکھی ہے اور اسے ہی اپنے ایلیمی کاموں کے لئے استعمال کرتے ہیں..... اسے پوری امید تھی کہ وہ طانوح اور اس کے چیلوں کو ختم کرے گا اس تک پہنچنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا وہ یہ بھی جانتا تھا اسے قدم قدم پر خطرات کا سامنا بھی کرنا ہو گا اس لئے اس نے اپنے گرد ایک مقدس حصار قائم کر دیا تھا تاکہ وہ شیطانی قوتوں سے محفوظ رہے وہ چوکنے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا پورے مندر میں ایک اعصاب شکن سناٹا پھیلا ہوا تھا وہ تیزی سے مندر کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا مندر میں جگہ جگہ بڑے بڑے جالے لگ رہے تھے مندر کی سرخ اینٹوں کا رنگ سیاہی میں تبدیل ہو چکا تھا برآمدے کے ٹوٹے پھوٹے اور شکستہ ستون مشکل سمجھتے کو سہارا دئے کھڑے تھے۔ کمروں کے فرش پر گرد کی موٹی تہہ جم چکی تھی جس پر مختلف النوع کے شہرات الارض ادھر ادھر بھاگ رہے تھے چمکا ڈیزل اڑتی پھر رہی تھی یہ مندر کسی زمانے میں نہایت خوب صورت رہا ہو گا مگر اب بالکل ویران اور بد حال ہو چکا تھا صفدان نے مزید قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ مندر میں فلک شکاف چٹخیں گونج اٹھیں صفدان نے اپنے لباس میں چھپے ہوئے سنہری خنجر کو نکال لیا اور احتیاط سے قدم اٹھانے لگا یہ ایک خاص قسم کا جادوئی خنجر تھا جسے طانوح کے سینے میں اتارنا تھا اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو یقیناً وہ موت سے دوچار ہو جاتا..... طانوح کی موت کے بعد دوسرے چیلوں پر با آسانی قابو پایا جاسکتا تھا طانوح اپنی طاقت وقت پر نازاں تھا اس کا خیال تھا کہ اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا ایلیمی طاقت اس کی حفاظت کرے گی وہ مندر کے تہہ خانے میں شباب و شراب کی محفل میں پر نشاط لمبے کشید کر رہا تھا جب اسے خبر ہوئی کہ صفدان اس کی موت بن کر اس کے سر پر پہنچا ہے..... وہ دہشت زدہ سا ہو گیا تھا مگر اگلے ہی لمحے اپنی شکلیاں اسے یاد آ گئیں تو اس کے بھدے ہونٹوں پر پراسرار سی

صائمہ سے کر دی گئی تھی جو کہ فائق کے چچا ارسلان کی بیٹی تھی۔ دانش صاحب کا بھی فقط ایک ہی بھائی تھا ارسلان جسے گھر والوں کی طرف سے بہت لاڈ پیار ملا تھا۔ بیس سال کی عمر میں فائق کی شادی کر دی گئی تھی جب صائمہ کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ فائق کو اللہ نے دو بیٹیوں کی نعمت سے نوازا تھا۔ صائمہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے بس ٹیڈ تک ہی تعلیم حاصل کر سکی تھی جبکہ دوسری طرف اسد نے یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنی کلاس فیلو زینہ سے پسند کی شادی کر لی جس میں گھر والوں کی رضا مندی شامل تھی۔

گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی لیکن اسد فارغ ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ اسد نے شہر میں موجود خالی زمین پر فیکٹری تعمیر کرنے کا پروگرام بنالیا تھا۔

☆.....☆.....☆

"ایک بات کہوں؟ وعدہ کریں کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔ اس کے بعد میں کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔" زینہ کی آنکھوں میں آنسو ستاروں کی مانند چمک رہے تھے۔

"جی نہیں کیا چاہیے آپ کو؟ پلیز آنسو مت بہایا کریں محترمہ یہ میرے لیے تکلیف کی وجہ بنتے ہیں۔" اسد زینہ کے قریب آکر بیٹھ گیا تھا۔

"آپ دوسری شادی کر لیں۔ آپ کو تو بچے بہت اچھے لگتے ہیں اور دو سال سے ہم اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ آپ کی خوشی سے بڑھ کر مجھے اور کوئی شے عزیز نہیں ہے۔" زینہ نے اپنا سر اسد کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔ مسلسل بہنے والے آنسو اسد کی شرت تر کر رہے تھے۔

"کیا سانسوں کے بغیر زندگی کا تصور ممکن ہے؟ کیا چاند چاندنی کے بغیر فلک پر جھلکا سکتا ہے؟ کیا دل دھڑکن سے دوری برداشت کر سکتا ہے؟ کیا آنکھیں پڑائی سے محروم ہو کر حسین نظاروں کو خود میں سما سکتی ہیں؟ پھر تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے جدا ہو کر دوسری

شادی کر سکتا ہوں؟ تم توجہ ہو میرے۔ جینے اور مکرانے کی۔" اسد نے بہت محبت سے زینہ کا حسین چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اسد کے بس نے عربینہ کو مزید کچھ اور کہنے سے روک دیا تھا اور عربیہ لبوں پر مسکراہٹ سما کر رہی بات ماننے پر مجبور ہو گئی تھی اگر محبت سچی ہو تو کوئی بات بھی ازدواجی زندگی کی رونقوں کو متاثر نہیں کر سکتی ہے۔ قربت کے لمحات نے عربینہ کے دل سے تمام دوسوں کو مٹا دیا تھا۔

"عربینہ میں فیکٹری کی تعمیر کے سلسلے میں چند روز کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ میری بیلنگ کر دو۔" اسد نے کھڑکی سے آئی ہوئی سورج کی روشنی سے بیدار ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اچانک پروگرام بنایا ہے کیا آپ نے؟" عربینہ نے حیرت سے استفسار کیا۔

"اگر پہلے بتا دیتا تو تم نے میرے جانے سے پہلے تک اداس رہنا تھا۔ خوش رہا کرو یار۔" اسد نے اپنے ضروری کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا جو کہ ٹیبل پر بے ترتیب انداز میں رکھے ہوئے تھے۔

"آپ فریش ہو جائیں میں ابھی بیلنگ کر دیتی ہوں۔" عربینہ بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو گئی تھی لیکن غمزہ بھی تھی کیونکہ اسد کے بغیر وہ خود کو ادھورا محسوس کرتی تھی۔

"بھابھی میں فیکٹری کے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جا رہا ہوں اور واپسی پر اپنی حویلی میں بھی جاؤں گا۔ وہاں دیہات میں سکنتز نہ آنے کی وجہ سے میں عربینہ اور آپ سب سے روز بات نہ کر سکوں گا۔ آپ نے عربینہ کا بہت خیال رکھا ہے۔ میں وہ راز جان کر ہی واپس آؤں گا جس کی وجہ سے ڈیڈ نے دیہات چھوڑ دیا تھا۔ آپ ڈیڈ کو بھی بتا دیجئے گا۔" اسد نے نیچے آتے ساتھ ہی اپنی بھابھی صائمہ سے بات کر لی تھی۔

"لیکن اسد تم وہاں کیوں جا رہے ہو؟ یہ تو خود

کو مشکل میں ڈالنے والی بات ہے؟" صائمہ کے چہرے پر پریشانی کے سائے لہر رہے تھے۔

"بھابھی تجس بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ آپ دعا کیجئے گا۔ میں فائق کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ ڈیڈ آج جاں میں سفر کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔" اسد نے سب سے بڑا دیا تھا۔

فائق سے ملنے کے بعد اسد ڈرائیور کے ہمراہ بہت سے خدشات دل میں سمیٹے سفر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ صحیح سلامت واپس آ بھی سکے گا یا نہیں۔ اسد نے خود کو اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ فیکٹری کی تعمیر کے متعلق کچھ لوگوں سے بات چیت کرنے کے لئے اسد نے آج اس دیہات میں جانے کا ارادہ کر لیا تھا جو دانش صاحب نے برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا۔ کئی عمارتوں کو پیچھے چھوڑ کر ڈرائیور اسد کو دیہات کی حدود میں لے آیا تھا۔ گاڑی کے پیچھے اب بچے بھاگ رہے تھے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا تھا جس کسی گاڑی پر نظر پڑنے کی دیر ہوتی تھی بچے گاڑی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتے تھے۔

تین منزلہ حویلی کے ارد گرد گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسد حویلی کے اندر داخل ہوتا قریب بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے شخص کے قہقہے نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

"ہا ہا ہا..... شکار خود شکاری کے پاس آ جائے جب شکاری شکار تو کرے گا۔ تو خود قتل گاہ کی طرف کھچا چلا آیا ہے۔ جا اندر اور دیکھ موت تجھے خوش آمدید کہنے کے لئے بیقرار ہے۔ اسی حویلی میں تیری اور تیرے باپ کی قبر بنی چاہئے۔ تجھے قسطوں میں موت ملے گی۔ اتنی آسانی سے وہ تجھے نہیں چھوڑے گی۔" وہ عمر رسیدہ شخص ان الفاظ کی ادائیگی کے بعد اب خاموش ہو گیا تھا مگر آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

حویلی میں قدم رکھتے ساتھ ہی اسد کی طبیعت بڑی بوجھل ہو گئی تھی۔ ڈرائیور اسی دیہات کا رہائشی

تھا۔ وہ گھر سے اپنی بیوی کو بلا کر لے آیا تھا۔ دونوں نے مل کر اسد کے رہنے کے لئے کمرہ صاف کر کے چمکا دیا تھا۔ مہمانوں کے لیے شخص بستر کو بھی وہ دونوں میاں بیوی اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

"صاحب جی ناشتہ میرے گھر سے آیا کرے گا۔" ڈرائیور تاج دین نے کھانے کی ٹیبل صاف کرتے ہوئے کہا جو کہ پہلے سے ہی فریج کے ہمراہ حویلی میں موجود تھی۔

"میں بیوی بریک فاسٹ نہیں کرتا ہوں۔ ایک رس ہیں میرے پاس جب ختم ہوں گے تو منگوالوں گا۔ بہت شکریہ آپ نے بہت مدد کی ہے میری بس ایک بات کا شکوہ ہے مجھے اور وہ آپ جانتے ہیں۔" اسد نے کچھ یاد دلاتے ہوئے کہا تھا۔

"شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے صاحب جی اور جہاں تک سائیکے سے آگاہی کی بات ہے تو وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا ہوں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ مجھے بڑے صاحب نوکری سے نکال دیں گے۔ میرے چھوٹے بچے میری زندگی ہیں۔ بڑے صاحب نے کہا ہے اگر میں نے آپ کو راز سے آگاہ کر دیا تو پھر اچھا نہیں ہو گا۔" تاج دین نے اتنا کہنے کے بعد سر جھکا لیا تھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ بہت مجبور ہیں۔ خیر اب میں یہاں آ گیا ہوں تو معلوم کر کے ہی جاؤں گا کہ اصل معاملہ ہے کیا؟ اس سوال کا جواب اب میں نے خود ڈھونڈنا ہے۔" اسد کی نگاہ اب تیسری منزل کی جانب تھی۔

ڈرائیور تاج دین اپنی بیوی سرن کے ہمراہ اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اسد کو ہر جانب سے تنہائی نے گھیر لیا تھا۔ شام کے سائے گھرے ہو گئے تھے۔ حویلی کا صحن مٹی کا تھا جبکہ کمرے کے کچے تھے۔ نیچے پانچ کمرے، ایک پکن اور دو واش روم تھے۔

اتنی بڑی حویلی میں اس طرح اکیلے رہنا بڑی ہمت کی بات تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں روح کا بھیرا تھا جس نے آج تک کسی کو لمبے نہیں دیا



تھا۔ باج بار یہ حویلی دانش صاحب نے اپنے جانے والوں کو رہائش کے لئے دی تھی لیکن ہر بار ایسا خوفناک واقعہ پیش آتا کہ لوگ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔

☆.....☆.....☆

”بھابھی اسد سے پچھلے چار گھنٹوں سے بات نہیں ہو پائی ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ فریہ بڑی بے بسی سے گویا ہوئی تھی۔

”راجھا دروازے کے لئے نہیں گیا ہے میری پیاری ہیرا اس نے واپسی پر حویلی جانا تھا۔ اسد کہہ کر گیا تھا کہ میں سب کو بتا دوں۔ ابھی پچا جان کو بھی بتانا ہے میں نے۔ اس بار حویلی کا راز فاش ہونے والا ہے۔ اب کچھ وقت تک تمہارا خیال رکھنا میرا کام ہے۔“ صائمہ نے ہمت کیجا کرتے ہوئے کہا۔

”بھابھی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میری صبح سے طبیعت خراب ہے اسد کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ فریہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر دانش روم کی طرف تیزی سے بھاگی تھی۔

”ارے کیا ہوا فریہ تے آرہی ہے؟“ گلنا نے کوئی خوشخبری ہے۔

”نہیں بھابھی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس ذرا چکر آ رہے تھے میں کچھ دیر تک خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ فریہ نے ٹاول سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے وضاحت دی تھی۔

”نہیں ہم ابھی ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں۔ اسے میرا حکم سمجھو تم سے بڑی ہوں تھوڑا بہت حکم تو چلا ہی سکتی ہوں۔“ صائمہ نے ذرا نیور کو ہسپتال چلنے کا کہا اور عرینہ کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

عرینہ کے چپک اپ کے بعد وہی ہوا جو صائمہ نے بتایا تھا۔ جب عرینہ کی سماعت میں ماں بننے کی خوشخبری کی آواز آئی تو بے اختیار آنکھیں جھلک پڑی تھیں۔ آج ان خوشی کے آنسوؤں میں اسد کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”کون ہے وہاں؟“ اسد کو ایک لڑکی کا کھس محن میں کھڑا ہوا دکھائی دیا تھا۔ پازیب کی آواز پوری حویلی میں گونج رہی تھی۔ تب ہی اچانک اسد کے پاؤں کسی کی مضبوط گرفت میں آ گئے تھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی کا سڑا ہوا ہاتھ ہے۔ جب اسد نے اپنا سر نیچے جھکایا تو اسکا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ طے ہوئے ہاتھ پر باقاعدہ پھوڑے لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ سے نکلنے والے خون نے مزید وحشت پھیلا دی تھی۔ اسد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی نے چھری کی تیز دھارا لے لے اسکا پاؤں کاٹ دیا ہے۔

☆.....☆.....☆

”چیچی جان اسد بچا کب آئیں گے۔ وہ ہمیں بہت یاد آتے ہیں۔“ صائمہ کی بیٹی نازیہ معصومیت سے گویا ہوئی تھی۔

”میری گڑباد کا ردہ جلد آجائیں۔ میں تو خود بہت پریشان ہوں۔“ عرینہ نے بچھے دل کے ساتھ جواب دیا۔

”چیچی جان اسد چاہو مجھے بے حد پسند ہیں۔ وہ ہی تو ہمارے ساتھ کھیلنے تھے اب گھر میں بوریٹ محسوس ہوتی ہے۔“ نازیہ کے بھائی حسن نے سامنے صحن میں پڑے ہوئے قتل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

”ان شاء اللہ اسد جلد واپس آ جائیں گے۔“ بچوں کو حوصلہ دینے والی عرینہ کا اپنا دل کرجیوں کی مانند ٹوٹ گیا تھا۔ کان اسد کی آواز سننے کے لیے ترس گئے تھے۔

جلن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جیسی اسد کی نظر ایک دوپٹے پر پڑی۔ وہ کپڑا دیکھنے میں صاف لگ رہا تھا۔ کونے سے کچھ حصہ پھاڑ کر اسد نے اپنے پاؤں پر باندھ لیا تھا۔ رد کی شدت میں جیسے ہی کچھ کی آئی اسد پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا تھا۔

صبح اسد جب نیند سے بیدار ہوا تو اسے سب سے پہلے اپنے پاؤں کی جانب دیکھا لیکن وہاں تو کسی بھی چوٹ کا نشان نہیں تھا اور نہ ہی وہ کپڑا دکھائی دے رہا تھا جسے اسد نے خود اپنے ہاتھوں سے زخم کے ارد گرد گرد باندھا تھا۔

☆.....☆.....☆

”فریہ بیٹی اسد کی کوئی خبر ملی ہے یا نہیں؟ شاید سٹپل کا ایٹھوے کال نہیں ملتی ہے۔ آیا کیوں نہیں ہے ابھی تک؟“ دانش صاحب نے تنبیہ کی سے انتظار کیا تھا۔ وہ دراصل بات یہ ہے کہ اسد حویلی گئے ہیں۔ میں تو خود اضطراب کے سبب رات سے جاگ رہی ہوں۔“ فریہ نے بڑے ادب سے جواب دیا تھا اور آنسوؤں کو اپنے سے روک لیا جو بار بار پلکوں کی جھار سے باہر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”بہت ہی لا پرڈا لڑکا ہے۔ ایسی حالت میں تو تمہارے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ میرے لاکھ روکنے کے باوجود اپنی من مانی کر رہا ہے۔“ دانش صاحب نے مختصر بات کی کمی حالانکہ وہ یہ بھی کہنا چاہتے تھے کہ اسد خود ہی اپنی جان کا دشمن بن گیا ہے لیکن عرینہ کی حالت ایسی نہ تھی کہ اس کے سامنے کوئی ایسی بات کی جائے جو اس کی صحت کے لیے مضرت ثابت ہو کیونکہ کافی سالوں بعد وہ ماں کے مقام پر فائز ہونے جا رہی تھی۔ بس یہ ہی وجہ تھی کہ اسد صاحب اپنے غصے پر ضبط کر گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

نیچے صحن میں کافی گرمی محسوس ہو رہی تھی اس لئے اسد آج پہلی بار تیسری منزل کی جانب آیا تھا۔ یہاں ایک چارپائی پہلے سے ہی موجود تھی جسے بچھا کر اسد نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ابھی مشکل سے

## شوہر نے بیوی کو بچا لیا

چین میں ایک بیوی نے اپنے شوہر سے لڑائی کے بعد عمارت کی ساتویں منزل سے چھلانگ لگا دی لیکن شوہر نے ایسا کام کر دیا کہ حیران کن طور پر اس کی خودکشی کی کوشش ناکام بنا کر اس کی جان بچائی۔ میل آن لائن کی رپورٹ کے مطابق یہ واقعہ چین کے صوبے شانزی کے علاقے شی کوان میں پیش آیا جہاں کانگ نامی بیوی نے اپنے شوہر لیو سے جھگڑے کے بعد عمارت کی چھت سے کودنے کی کوشش کی۔ اس کا شوہر اسے بچانے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے چھلانگ لگا دی، لیکن اتفاق سے شوہر کے تیزی سے آگے بڑھائے گئے ہاتھ میں خاتون کی چوٹی (سر کے بال) آ گئے۔ رپورٹ کے مطابق شوہر نے بیوی کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ نیچے لگ رہی تھی اور اب بھی اپنے بال چھڑوا کر نیچے گرنے کی کوشش کر رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ مجھے چھوڑ دو، مجھے گرنے دو۔ یہ ماجرا دیکھ کر نیچے موجود لوگوں نے پولیس کو اطلاع دی اور فوری طور پر 16 ہلکار وہاں پہنچ گئے جو کانگ کو واپس چھت پر لانے میں بہ مشکل کامیاب ہوئے کیونکہ وہ اب تک شدید مزاحمت کر رہی تھی۔ پولیس کا کہنا ہے کہ وہاں نیچے ایک پانی کا بڑا پائپ موجود تھا، جس کے سہارے وہ بچ پائی۔ اگر یہ پائپ نہ ہوتا تو اس کا شوہر محض اس کے بالوں کے سہارے اتنی دیر تک اسے پکڑ کر نہیں رکھ سکتا تھا۔

(العام ملی - راولپنڈی)

باغ منٹ ہی گزرے تھے کہ اسکو ایسا لگا کہ فرش پر ٹوٹی کسی کوٹھنیت رہا ہے۔ اس ڈرو کو ہم کا نام دے کر اس نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر وہ ہی آواز اس کی سماعت سے نکلانی تھی اب کی بار اسکو یقین ہو گیا تھا کہ واقعی حقیقت میں ایسا ہو رہا ہے کچھ ثانیوں بعد وہ سڑی ہوئی لڑکی اس کے سامنے آگئی تھی اور جس کو گھسیٹا جا رہا تھا وہ اس کا چچا ارسلان تھا۔

”چھوڑ دو یہ کیا کر رہی ہو؟ میرے چچا تو کب کے وفات پا گئے ہیں۔“ اس نے آج پہلی بار اس چڑیل سے بات کی تھی۔

”اسے سو بار ماروں گی پھر بھی سکون نہیں ملے گا۔“ اس چڑیل نے اتنا کہنے کے بعد اس کے چچا ارسلان کے چہرے کو اپنے لمبے ناخنوں سے لہو لہان کر دیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور چند لمحوں بعد جیسے ہی آنکھیں کھولیں سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہے۔

عرینہ نے سبیل فون ہاتھ میں تمام کر اس کے نمبر پر کال کی تو اتفاق سے سبیل جا رہی تھی۔

”آج سبیل کی بندش مہربان ہوئی مئی ہے ہم پر۔ اب میں کچھ اور دن یہاں سکون سے رہوں گا۔“ عینسی ہو حسیں لڑکی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

”بہت بری ہوں۔“ عرینہ نے روتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

”ارے یا رتم نے اگر رونا بند نہیں کیا تو پھر میں تمہیں بھی اسی بھوت جنگلے میں لے آؤں گا۔ اس نے عرینہ کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے مذاق کیا تھا۔“

”آپ باپ بننے والے ہیں۔“ عرینہ نے اس کو بہت بڑی خوشخبری سنائی تھی۔

”شکر اللہ میں بہت زیادہ خوش ہوں مائی بیوٹی فل وانک۔ اپنا خاص خیال رکھو۔“ اس نے ابھی اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ سبیل فون اچانک بند ہو گیا

تھا۔ اس نے پھر سے سبیل فون آن کر کے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اب پھر سے سبیل پر اہم شروع ہو گئی تھی۔ اسی دوران اس کو حویلی کے قریب موجود قبرستان سے رونے کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ آواز میں اتنا درد تھا کہ اسے سنتے ساتھ ہی اس کو اپنے سر میں درد کی لہر محسوس ہوئی تھی۔

اس کو حویلی کے مین گیٹ سے باہر نکل کر اب قبرستان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ آواز اب بھی قبرستان میں سے سنائی دے رہی تھی۔ اس کو کچھ قبروں کے بیچ میں سے گزرنے کے بعد اب قبرستان کے وسط میں کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ قبروں کے قریب وہ جلی ہوئی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جسے اس کو حویلی میں دیکھتا تھا۔ ایک قبر پر کینہ نے بی بی اور دوسری قبر پر جاوید نام لکھا ہوا تھا۔ وہ لڑکی جو سر سے پاؤں تک جلی ہوئی تھی اپنا سر گھٹوں پر رکھ کر اب تک رو رہی تھی۔ اس کو احساس ہو گیا تھا کہ یہاں آکر اس نے بہت بڑی غلطی کر لی ہے۔ ابھی اس کو واپس جانے کے لیے تھوڑا آگے بڑھتا ہی تھا کہ اس چڑیل نے اس کی گردن کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ اس نے اس چڑیل کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت کو اپنی گردن سے ہٹانا چاہا لیکن ناکام ہو گیا۔ وہ جلی ہوئی چڑیل اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”تمہارا چچا لاوارثوں کی موت مرا تھا۔ قبر نصیب نہیں ہوئی تھی اسے۔ تمہارے باپ کا ان جام بھی اچھا نہیں ہو گا میں تم سب کو مار ڈالوں گی۔“ وہ جلی ہوئی چڑیل یہ کہتے ہی غائب ہو گئی تھی۔

اس کو پیچھے مڑے بغیر حویلی میں آ گیا اور سوچتا ہی رہ گیا کہ ارسلان چچا نے اس کا کیا لگا ہوا تھا۔ اگلی صبح ڈاکٹر تاج دین گھر کا بنا ہوا ناشتہ لے کر حویلی میں آ گیا تھا۔

”صاحب جی آپ تو بہت کمزور لگ رہے ہیں۔ اب روکھنا میرے گھر سے آیا کرے گا اور آپ کی گردن پر یہ سرخ لکیریں کیسے پڑ گئی ہیں۔ کیا ہوا صاحب جی؟“ تاج دین نے تفتیش کا اظہار کرتے

ہوئے کہا۔

”یہ پانچ ہزار روکھو اور دیکھو انکا رمت کرنا نہیں تو میں باہر سے ہی کھالیا کروں گا اور جہاں تک بات اس نشان کی ہے تو میں بس اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ کینہ نے بی بی اور جاوید یہ دونوں لوگ کون تھے؟ اس نشان کا تعلق اسے سے ہے اس نے تاج دین کے ساتھ پر پیسے رکھتے ہوئے ایسا سوال داما تھا جسے سنتے ساتھ ہی تاج دین حیران و پریشان ہو گیا تھا۔

”صاحب جی یہ دونوں میاں بیوی تو بہت سالوں پہلے ہی وفات پا چکے ہیں۔ کیا آپ قبرستان گئے تھے؟“ تاج دین نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ بری طرح محسوس کیا ہے۔

”ٹھیک ہے تاج دین تم اب جا سکتے ہو۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے تاج دین کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے جانے کی اجازت دیدی تھی۔

☆.....☆.....☆

کیسے بھائی ہوتم چھوٹا بھائی موت کو گلے لگا نے چلا گیا ہے اور تم یہاں سکون سے بیٹھے ہوئے ہو۔“ دانش صاحب فائق سے وضاحت طلب کرنا چاہ رہے تھے۔

”ڈیڈ اسد کہہ کر گیا تھا کہ اسکے پیچھے گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔ اس نے ہمیش ہی غریبوں کی مدد کی ہے۔ ضرور جہنم دہلی کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس کو صحت سلامت واپس آ جائے گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“

فائق کی بات سے دانش صاحب کو حوصلہ ملا تھا لیکن یہ انسوں ستار ہا تھا کہ وہ دیہات میں نہیں جا سکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

جوں ہی رات کا دوسرا پہر شروع ہوا اس کو پھر سے پازیب کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”کون ہوتم؟ میں تمہاری مدد کروں گا۔ یوں بھگنا چھوڑو۔ کسی طریقے سے اپنی کہانی مجھ تک

پہنچاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔“ اس نے یہ سب تیسری منزل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اصل گزبڑ وہیں ہے۔ پازیب کی آواز آنا بند ہوئی تھی لیکن ہوا میں مسلسل سرگوشی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی لڑکی سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

اگلی صبح اس کو حویلی کے باہر ایک اجنبی عورت نظر آئی جس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ اس نے آنے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا وہ دونوں اس سے ہی ملنے آئے ہیں۔ اس کو حویلی کے اندر لے آیا تھا۔

”میں نورین کی دوست ملائکہ ہوں اور یہ میرے شوہر کا مران ہیں۔“ اس عورت نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔

”کون نورین؟“ اس نے الفاظ پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”نورین وہ لڑکی ہے جسے آپ کے چچا ارسلان نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اسی حویلی میں زندہ جلا دیا تھا۔ نورین دیہات کی سب سے حسین لڑکی تھی۔

ارسلان کی بری نظریں نورین نے محسوس کی تھی اور مجھے بھی بتا دیا تھا کہ اس کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم لڑکیاں اپنی ایک کنبلی کی شادی سے واپس آرہی تھیں بھی ارسلان اپنے بد معاش دوستوں کے ہمراہ جیب پر آیا اور نورین کو اپنے ساتھ لے گیا۔

میں نے تمہارے گھر کے گیٹ پر بہت بار دستک دی لیکن تمہارا ابا جانتا تھا کہ میں کیوں آتی ہوں۔ میری کسی نے ایک نہیں سنی۔

میں نے ہر شخص کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جو مدد کر سکتا تھا لیکن اس دن تو جیسے سب کو سانپ سو گھ گیا تھا۔ حویلی کی پچھلی طرف میری پھولوں جیسی خوبصورت دوست کی جلی ہوئی لاش ملی تھی۔ محض ایک سال بعد تمہارا چچا ارسلان جب انہی دوستوں کے ہمراہ پہاڑی مقام تک سیر کرنے گیا تو وہ ہی جیب کھائی



ایک طویل عرصہ تک میں اس انتظار میں رہا کہ ہو سکتا ہے کہ رخسار کو میرا بچوں کا کچھ خیال آجائے اور وہ میرے پاس آجائے مگر ایسا نہیں ہوا۔

یہ کہانی جو میں آپ کو سنارہی ہوں حقیقت پر مبنی ہے یہ واقعہ میرے خالو کے دوست کے ساتھ پیش آیا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ جوان تھے اور تن تہا زندگی کے سفر پر رواں دواں تھے۔ رب کائنات کے بہت سارے راز انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہیں جس میں ماورائی مخلوق بھی شامل ہے بھی کھار انسان کا واسطہ ان ماورائی مخلوق سے پڑ جاتا ہے جسے سن کر اور دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان ناقابل یقین کے بھنور میں غوطہ زن رہتا ہے۔ اس کہانی کی ابتداء ساٹھ سال پہلے ہوئی۔ آئیے کہانی کی روداد خالو کے دوست کی زبانی سنئے

میں کرگئی جس پر سوار ہو کر وہ نورین کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ تینوں کی لاش نہیں ملی بس جیب کے کچھ حصے ملے تھے جس سے اندازہ لگایا گیا تھا کہ تینوں ابدی نیند سو چکے ہیں۔ ہو سکے تو اپنے والد کو سمجھا کہ سب کے سامنے لے آئیں۔ انہوں نے ہی یہ خبر شہر کی تھی کہ نورین نے خودکشی کی ہے حالانکہ یہ نقل تھا لیکن اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا گیا تھا۔

نورین کی والدہ چند دنوں بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں والد بھی زیادہ عرصہ جی نہیں سکے۔ نورین اپنے والدین کی انگوٹھی بیٹی تھی یوں ایک خوشحال گھرانہ موت کی چادر اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ ملائکہ کی بات سننے کے بعد اسد کو بے حد افسوس ہوا۔ آج اسے وہ گہرا راز معلوم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے نورین کی روح اس حویلی میں جھٹک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”تم واپس آ گئے ہو۔ میرے پیارے بیٹے یوں اس عمر میں مجھے تنہا کیوں چھوڑ گئے تھے؟ تمہیں تو معلوم ہے تمہارے بغیر مجھے یہ گھر بہت دیران لگتا ہے۔ دوبارہ ایسا مت کرنا۔“ دانش صاحب اسد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے گویا ہوئے تھے۔

”اگر آپ کی کوئی بیٹی ہوتی تب آپ کو معلوم ہوتا کہ اگر بیٹی کی عزت کا جنازہ نکل جائے تب کتنی اذیت ملتی ہے۔ زندہ انسانوں کا شمار دوں میں ہوتا ہے۔ اگر میری بیٹی کے ساتھ کوئی زیادتی کر کے پھر جلا دے تو کیا آپ ایسے شخص کو معاف کر دیں گے؟ اسد کا موڈ بے حد خراب تھا۔

”میرے بیٹے مجھے معاف کر دو اللہ نہ کرے تم پر کبھی اتنی سخت آزمائش آئے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں کل ہی تمہارے ساتھ دیہات جا کر سب کو جمع کر کے معافی مانگوں گا۔ بتا دوں گا کہ اس رات جو ہوا اس میں نورین بے قصور تھی۔“ دانش صاحب

☆☆



## گھر کا دروازہ راتوں رات دیوار سے بند کر دیا گیا

دیوار بنانا اور وہ بھی کسی ایسی جگہ جہاں سے کوئی روزانہ ہی نہیں بلکہ دن میں کئی بار گزرتا ہو آسان کام نہیں ہوتا مگر جرمنی میں ایک شخص کے گھر کے دروازے کے سامنے راتوں رات دیوار جن دی گئی بتایا گیا ہے کہ جرمنی کے علاقے آئف ٹیچ کے رہائشی ایک شخص نے صبح اپنے گھر کا داخلی دروازہ کھولا، لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران و پریشان رہ گیا کہ اس کے گھر کے مرکزی دروازے کے آگے ایک نئی ٹولی اینٹوں کی دیوار کھڑی تھی۔ پولیس کے حوالے سے بتایا گیا کہ وسطی جرمنی کے ضلع آف ٹیچ کے علاقے میں ہاؤس میں ایک شخص کے گھر کے مرکزی دروازے کے باہر دیوار بنانے والے شخص کی شناخت نہیں ہو سکی۔ رپورٹ کے مطابق ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس دیوار کورات کے اندھیرے میں منٹوں میں تعمیر کیا گیا اور کوئی نہیں جانتا کہ اسے کیوں تعمیر کیا گیا، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیوار کسی ناول سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہو۔ پولیس ترجمان نے جرمنی کی مقامی نیوز ویب سائٹ سینیٹو کو بتایا کہ دیوار کھڑی کرنے کے باعث جائیداد کو تقریباً 500 یوروز کا نقصان پہنچا اور پولیس یہ کام کرنے والے شخص کو تلاش کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ان کا کہنا تھا کہ یہ شخص دیوار برلن کی یاد دلاتی ہے، جسے بہت جلد تعمیر کیا گیا تھا۔ پولیس کا مزید کہنا تھا کہ یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ جرم ہے۔

(چوہدری عبدالجبار: ساہیوال)

معمول تھا کہ میرے لئے صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا لے کر آتا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن میں اندرونی طور پر بڑا ہی شرمندہ تھا کہ روزانہ احتشام میرے لئے تکلیف اٹھاتا ہے اور میرے کہنے پر وہ جواب دیتا۔

”ارے اس میں تکلیف اور تکلف کی کیا بات ہے میرا گھر تو بالکل سامنے ہے اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دیتا.....“

”پھر بھی یار روز روز تکلیف کرنا اچھا نہیں لگتا بہر حال اس کے لئے شکریہ“ اور پھر احتشام نے لان میں کئی میری محنت کو سراہا اور بہت خوش ہوا۔

شب وروز کے معمولات چلتے گئے اور اس درمیان کوئی قابل توجہ بات سامنے نہ آئی مگر ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ کہ میں جب بھی کام کر رہا ہوتا تو یکدم ہی ایک عجیب سی دلکش مسکراہٹ کن بھیجی جیسی خوشبو مجھے محسوس ہوتی جیسے کوئی پرفیوم لگا کر میرے پاس سے گزرا ہو۔ یہ واقعہ میری سمجھ سے باہر تھا کچھ دن تو میں جان بوجھ کر نظر انداز کرتا رہا۔

ایک روز رات 2 بجے جب میں کام کر رہا تھا کیونکہ یہ آرڈر کا کام مجھے دینا تھا ایک میٹس کے دامن، گلے اور بازو پر کڑھائی کرنا تھی جو کہ صبح تک مکمل کر کے دینی تھی جب میں میٹس کے دامن پر مونی ٹائیک رہا تھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اپنا دوپٹا ہوا میں لہرایا ہو۔ دوپٹے کا لمس میں نے روشنی میں واضح طور پر میٹس کے دامن پر پڑتے دیکھا جیسے کسی نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر اپنا دوپٹہ ہوا میں لہرایا ہو اس کے ساتھ ہی وہی مسکراہٹ مجھے میرے چہرے پر چھیل گئی، میں نے یکدم ہی پیچھے مڑ کر دیکھا مگر مجھے کچھ نظر نہ آتا اور میں نے اسے اپنا وہ سمجھ کر جھجک دیا اور پھر دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا مگر دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا اب میں اسے اپنا وہم خیال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کل شاید تنہا کی وجہ سے یہ بات دہم سمجھ کر بھلا دی تھی مگر اب میں ہوش و حواس میں تھا رات میں

بھگتن بغل میں جھاڑو دبا کر چلی آئی اور شرواب شرواب کر کے اس نے خاک اڑائی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جھاڑو سے تمام سوکھے پتے نیکجا کر لئے اور ادھر ادھر پھیلا ہوا بے کار سامان ایک کونے سے لگایا۔ ٹوٹی ہوئی پلاسٹک کی بائلی اور مٹی کے دو خالی ڈبوں کو اچھا کر کے برآمدے کی چھت پر پھینک دیا۔

میں چچا جان کی اس مہربانی پر مشکور ہوا مگر پھر بھی دل مطمئن نہ ہو سکا۔ بہر حال مرنا کیا نہ کرتا مصداق کے صبر شکر کر کے اس جگہ کو اپنا مقصد سمجھ کر رہنا شروع کر دیا۔ میں نے بڑی محنت سے اس دم توڑتی دلدل بنی کیاری کو درست کیا۔ پانی کی موٹر سے مسلسل رستے پانی کی روک تھام کے بعد اب دوبارہ اس داستان حیرت بنی کیاری کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جس کی منڈیر تباہ حال ہو رہی تھی میں نے از سر نو کیاری کو کھود کر اس میں تازہ کھاد ڈالی، نئے بیج ڈال کر نئے پودوں کی آبیاری کا بندوبست کیا۔ سرخ پتھروں کی منڈیر سے کیاری کو خوبصورت ہو گئی اب مجھے ہی دنوں میں یہاں گلاب، موتیا، گل داؤدی اور گل مہر کے پودے لہلہا رہے ہوں گے یہ تصویر ہی میرے لئے خوش گن تھا اس کے بعد میں نے کمرہ کی طرف توجہ دی کمرے دو ہی تھے جو کہ کافی کھلے اور کشادہ تھے لمبھڈ ہاتھ کی بھی سہولت تھی ایک کمرے کو میں نے بیڈ روم بنالیا اور دوسرے کو دیکھ کر کام کے بارے میں سوچنے لگا۔

دراصل زیادہ پڑھا لکھا تو نہ تھا اس لئے خواتین کے کپڑوں پر گونا گوی اور ستارہ کا کام کرتا تھا کام کے لئے مجھے دوسرا کمرہ موزوں تھا اور پھر میں نے روزمرہ کے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف کر لیا روزانہ کا ایک معمول بنالیا جیسی صبح سے شام تک کام کا وقت مقرر کر لیا صبح سے شام تک ایک ہی جگہ بیٹھ کر متواتر کام کرتا پڑا محنت ہوتا ہے اور پھر اگر ایک سے دو یا پھر کئی ہوتے ہیں تو کام کے ساتھ ساتھ کپ شپ بھی ہوتی ہے جس سے وقت کٹنے کا احساس نہیں ہوتا ورنہ ہی کام کی زیادہ محنت محسوس ہوتی ہے احتشام کا یہ روز کا

پر دستخط کروا کے مکان اپنے نام کروالیا اور پھر چند ماہ کے بعد مجھے دیکھے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔

میں بے یار و مددگار مصیبتوں کے پہاڑ تلے آ گیا۔ کیا کرتا کہاں جاتا، آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس پریشانی کے عالم میں، میں اپنے بچپن کے دوست احتشام کے پاس چلا آیا اور اسے ساری کہانی سنا ڈالی اور اپنی مفلوک حالی اس کے سامنے رکھی وہ بڑا دھی ہوا اور پھر میری مدد کے لئے سلی دی۔ میں نے کہا۔

”مجھے کرائے کا مکان چاہئے جس کا کرایہ مناسب ہو تاکہ میں آسانی سے ادا کر سکوں۔“

احتشام اور میں دو تین اسٹیٹ ایجنسیز کے دفتر پہنچے مگر ان کی دانست میں کوئی مکان نہیں تھا۔ پھر احتشام نے مجھ سے کہا۔

”میرے چچا کا ایک مکان ہے جو کہ کافی عرصے سے بند پڑا ہے اب وہ اسے کرائے پر دینا چاہتے ہیں مگر کافی مدت سے بند رہنے کی وجہ سے لوگ اس کو کرائے پر لینے سے ڈرتے ہیں کیونکہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ زیادہ عرصہ مکان بند رہنے کی صورت میں بدرومیں، چیمبلیں وغیرہ گھر میں بیکرا کر لیتی ہیں اس لئے کوئی اس گھر میں رہنے کو تیار نہیں، ہاں اگر تم کہو تو میں چچا جان سے بات کروں۔“

میں ویسے بھی جن بھوتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا اس لئے میں نے کہا ”پلیز تم کسی بھی طرح یہ مکان دلاؤ۔“

اگلے دن احتشام نے مکان کی چابی لا کر مجھے دے دی۔ مکان باہر سے جتنا خستہ حال تھا اندرونی طور پر اتنا ہی بہترین تھا مگر لان اور برآمدہ بیکار بیکار اپنی ناقدری کی شکایت کر رہا تھا۔ لان میں صرف چند ایک سوکھے مرجھائے ہوئے پودے خزاں رسیدہ حالت میں نظر آ رہے تھے۔ روش پر پھر سے سوکھے پتے میرے قدموں تلے چرامر کر عجیب سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ میں اس وقت بہت خاموش سا جھپٹے آگن میں کھڑا ہوا تھا کہ ایک طرف سے ایک تومندی

دو پہلے لہرانے کے علاوہ میں نے پائل کی آواز بھی واضح طور پر سنی تھی پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا ہر مرتبہ مجھے محسوس ہوتا کہ میرے پیچھے کوئی ہے مگر مرکز دیکھنے پر کوئی نظر نہ آتا اب تو میں بھی پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ یہ ماجرا کیا ہے پھر میں نے سوچا کہ احتشام سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔

ایک دن احتشام کو میں نے ساری صورتحال سے آگاہ کیا اور پھر ہم دونوں اس مسئلے کا حل تلاش کرنے لگے۔ ”چھاسلمان کل اس مسئلے کا حل تلاش کریں گے دراصل مجھے ایو جی کی دوائیاں لینے جانا ہے“ اور احتشام کے چل جانے کے بعد میں بھی گھر واپس آ گیا۔ اگلے دن احتشام میرے پاس آیا اور لان کو تو صبحی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے باغیچے کو نئی زندگی دینے میں سارے اخراجات اپنی جیب سے برداشت کئے تھے اور اب لان بہت خوبصورت لگ رہا تھا ہر قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے کافی درخت تو احتشام نے ان کی تعریف کی۔ میں چائے بنا کر باہر ہی لے کر آ گیا چائے پینے کے دوران ہم باتیں کرنے لگے۔

احتشام نے کہا ”ہر مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر تمہیں کوئی نظر نہیں آتا حالانکہ دوپٹے کا عکس تمہیں واضح طور پر نظر آ رہا ہے جیسے کوئی نا دیدہ ہستی دوپٹے کو ہوا میں لہرا رہی ہو اب اگر تمہیں دوبارہ دوپٹے کا عکس نظر آئے تو تم پیچھے مڑ کر مت دیکھنا بلکہ عکس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ کو پیچھے کی سمت کر کے دوپٹے پکڑنے کی کوشش کرنا کیونکہ تمہارے پیچھے مڑ کر دیکھنے سے جو کوئی بھی ہے وہ غائب ہو جاتی ہے۔“ اتنا تو طے تھا کہ دو پہل لہرانے والی ہستی لڑکی ہے میں اس بات کے لئے رضامند ہو گیا کیونکہ میں شروع سے ہی غدار اور بہادر واقع ہوا تھا۔

دن گزرا اور رات کا تسلا ہر طرف ہو گیا۔ میں بظاہر کام میں مصروف رہا لیکن دل و دماغ میں ان دیکھی ہستی میں الجھا رہا جیسے ہی گھڑی نے رات کے

بارہ بجائے تو مجھے وہی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی میں فوراً الرٹ ہو گیا اور جیسے ہی میں نے لہراتے دوپٹے کا عکس دیکھا تو اچانک ہی پیچھے ہاتھ کر کے دوپٹے کی تلاش کیا اور یہ کیا میرے ہاتھ میں دوپٹہ آئے ہی ہلکی سی سترنم وکسٹ نسوانی آواز سنائی دی۔ اسی لمحے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کی خوبصورتی کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا میں نے آج تک اتنی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اتنا تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ وہ انسان ہرگز نہیں ہے مگر کیا کیا جائے اس دل کا جو پکلی ہی نظر میں اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

”مجھے میرا دوپٹہ واپس کر دو۔“ اس کی لرزتی ہوئی آواز میں کی گئی التجا مجھے واپس ہوش میں لے آئی۔ ایسا لگا کہ جیسے کہیں دور چھٹیاں بج اٹھی ہوں یا جیسے کسی نے سر کے تار چھڑ دینے ہوں۔ ”میرا دوپٹہ واپس کر دو۔“ اس نے دوبارہ التجا کی میں نے اس کی التجا کو بیکسر نظر انداز کر دیا اور اس سے برجستہ کہا ”تم مجھ سے شادی کرلو“ وہ ہکا بکا رہ گئی، میں نے دوپٹہ اپنی بغل میں دبا رکھا تھا اس پر وہ کچھ نہ بولی اور عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے غائب ہو گئی۔

وہ مسلسل چھ روز تک میرے پاس آئی ”مجھے میرا دوپٹہ واپس کر دو“ مگر میں نے ہر روز اسے شادی کا کہا۔ بالآخر ساتویں دن وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی ”میں تم سے شادی کے لئے تیار ہوں“ میں نے اسے کہا ”تم کل آنا۔“ میں نے احتشام کو ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ مگر وہ مجھے التماس نہ لگا ”سلیمان تم جانتے ہو کہ وہ انسان نہیں ہے“ مگر میں نے کہا ”ہاں مجھے پتہ ہے کہ وہ انسان نہیں مگر میں پھر بھی اس سے ہی شادی کروں گا اگر تم نے میرا ساتھ دینا ہے تو دو روزہ مجھے نصیحت نہ کرو“ میں یکدم ہی غصے میں آ گیا۔ بہر حال جیسے تیسے کر کے میں نے احتشام کو اپنا ساتھ دینے پر رضامند کر لیا اور اسی رات وہ مولوی کو لے کر آ گیا مولوی صاحب لڑکی کو دیکھ کر چونک سے گئے کہا تو کچھ نہیں مگر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے

ہوئے لگا جڑھا کر رخصت ہو گئے۔

بہر حال وقت گزرتا گیا اور میں یہ بھی بھول گیا کہ میری بیوی کی حقیقت کیا ہے اس راز سے صرف احتشام واقف تھا۔ اس نے میری محبت میں پھر بھی اور کے سامنے اس بات کو اپنی زبان پر نہیں لایا۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنی سرت بھری دنیا میں مگن رہنے لگے میں اسے پیار سے رخسار کہتا تھا رخسار بھی مجھ سے پیار کرتی اور کبھی لہجہ کی شکایت کا موقع نہ دیتی ایک سنگم اور وفا شعار بیوی نظر آتی مگر یہ کہ رخسار روزانہ رات کو مجھ سے اپنا دوپٹہ مانگتی مگر میں اسے ٹال جاتا ایسے ہی وقت گزرتا گیا اور اس دوران میں دو بچوں کا باپ بن گیا مگر رخسار اب بھی اپنا دوپٹہ نہیں بھولی وہ ہر روز رات کے وقت مجھ سے اپنے دوپٹے کا مطالبہ کرتی مگر میں باتوں باتوں میں اس کے مطالبے کو ٹال جاتا اور وہ مسکرا کر اپنی والہانہ محبت و چاہت کا انداز اپنا کر مجھ پر فریضہ ہو جاتی اور اس طرح ہر آنے والی رات میں اس کی چاہت میں گرجوٹی بوھتی رہی۔

میں بھی اس سے بے انتہا چاہنے لگا تھا اور اس کے بغیر جینے کا تصور ہی میرے لئے سوہان روح تھا وقت گزرتا رہا اور میں تین بچوں کا باپ بن گیا میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو پا کر بہت خوش تھا مجھ پر بڑھاپے کا سایہ بڑھتا جا رہا تھا شکل سے بھی زیادہ عمر جھلکنے لگی تھی اور پھر سر کے سفید بال پکار پکار کر زیادہ عمر کی گواہی دینے لگے تھے۔ رخسار پر حالانکہ عمر کا زیادہ اثر نہ ہوا تھا مگر پھر بھی گزرتے ماہ و سال اس پر زیادہ نہیں تو کم اثرات ضرور چھوڑ گئے اب میں اپنی بیوی بچوں میں بہت خوش تھا اب بھی رخسار ہر روز رات کو دوپٹے کا مطالبہ کرتی اور میں اسے ٹال جاتا۔ ایک روز آنکھیں دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ اب آدھی سے زیادہ زندگی گزر گئی ہے اور پھر میرے دل میں رخسار کی خواہش کا خیال آیا کہ وہ روز رات کے وقت دوپٹہ کا مطالبہ کرتی ہے اور میں کتنا کٹھور ہوں کہ اس کی ادنیٰ سی خواہش کا احترام نہیں کرتا۔ اب رخسار دوپٹہ لے کر

کیا کرے گی اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب اس کے مانگنے پر دوپٹہ اسے دے دوں گا۔ ہم اپنی زندگی سے مطمئن تھے اور خوش و غرم زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک رات اچانک رخسار نے انداز دلبرائی سے اپنے دوپٹے کا مطالبہ کیا، وہ مجھ سے اپنا دوپٹہ مانگ رہی تھی اور پھر اسی رات میں نے اسے اپنا پرانا صندوق کھول کر دوپٹہ تمنا دیا یہ سوچ کر کہ اب رخسار بھی عمر کا طویل عرصہ گزرا چکی ہے بھلا وہ میرے اور بچوں کے بغیر کیسے رہ سکے گی۔

مگر یہ کیا دوپٹہ دینے کی دیر تھی کہ رخسار اور بچے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور میں حیران و پریشان کھڑا رہ گیا کہ یہ کیا ہو گیا اور پھر اچانک رخسار کی آواز آئی۔

”سلیمان جتنے عرصہ میں تمہارے ساتھ رہی تمہارے لیے شاید کچھ اہم بات ہو مگر میرے لئے یہ صرف 5-6 لمحے تھے جو میں نے تمہارے ساتھ گزارے اب میں واپس جارہی ہوں“ اور اس کے ساتھ ہی آواز آئی بند ہو گئی۔ میں چپتا چلاتا رہا بچوں کو آدھیں دینے لگا اور رخسار کو پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک میں اس انتظار میں رہا کہ وہ مل سکتا ہے کہ رخسار کو میرا بچوں کا کچھ خیال آ جائے اور وہ میرے پاس آ جائے اور نئے عہد و نیماں کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرے مگر ایسا نہیں ہوا نہ بچوں کی کوئی جھلک اور نہ ہی رخسار کی کوئی جھلک بھی نظر آئی۔

اب میں عمر کے اس موڑ پر آ گیا ہوں کہ سوائے زندگی کے دن پورے کرنے کے کبھی کیا سکتا ہوں اور اس غم کو لئے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کر جاؤں، اب میرا اگر کوئی دنیا میں سہارا ہے تو وہ میرا دوست احتشام ہے جو کہ اپنی دوستی کو نبھا رہا ہے اور آخری دم تک ساتھ دے گا۔

☆☆



# جل پری

سائل و عابثاری

چوتھی قسط

اس کا بے جان ہاتھ سختی سے جکڑ لیا ہوا میں گویا ہزاروں پاگل بدرویں شامل ہو گئی تھیں جو بلا کی اٹھانٹ چائے جاتی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا گویا زلزلہ آ رہا ہو۔

وہ قدرتی تھی جو جگر کو شیشہ دیوار کر گئی تھی، وہ موت تھی، وہ وصل کا ہر خواب چھین کر نوج کر لے گئی تھی۔ باقی اگر کچھ بچا تھا تو دیرانی..... خالی پن..... سو گاری.....

”سنو! تم کیا چاہتے ہو.....؟“ وہ لڑکی اس سے مخاطب ہوئی تھی تو سو جھل بے ساختہ ہنسنے لگا۔

”میں کیا چاہتا ہوں میرے چاہنے سے بھلا کیا ہوتا ہے؟“ وہ لا جواب سی ہو گئی پھر قدرے توقف سے بولی۔

”مم میرا مطلب ہے کہ پری زاد کو..... مطلب اس کی آخری آرام گاہ کہاں ہے.....“ وہ چونکا تھا وہ بری طرح چونکا تھا اسے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ پری کو اس سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہونا ہے۔

ایک بار پھر پری کا چہرہ دھندلا گیا وہ آنسوؤں کی دھند تھی جو سو جھل کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔

”دور..... اس خالم دنیا سے دور کی سحر امیں..... کسی ویرانے میں..... جہاں کوئی نہ ہو.....“ اس نے کہا تھا۔

تا حد نگاہ پھیلے صحرائیں روانے سو جھل کی خواہش پر اسے پہنچا دیا تھا رواجاتی تھی کہ کن لوگوں نے پری کی قبر تیار کی تھی۔ اور جنازہ بھی انہوں نے پڑھایا تھا اب اسے قبر میں خود سو جھل نے اپنی محبت کو اپنی زندگی کو دفنایا تھا کیا کوئی اپنے ہاتھوں سے ایسا کر سکتا ہے؟ لیکن اس

نے کیا تھا کیونکہ وہ بے حد مجبور تھا کیونکہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں اپنے پیاروں کو، جن کے بنا وہ زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کو خود اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی تلے دبا دیتے ہیں کیونکہ وہ مجبور ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا..... اور بات جہاں مجبوری کی آتی ہے تو وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا سوائے بے بسی کے جولا چارگی سے ہاتھ ملتی دکھائی دیتی ہے۔

جوں جوں پری کے وجود کو مٹی اپنے اندر ڈھانچتی جا رہی تھی سو جھل کو لگ رہا تھا کہ خود اس کا اپنا وجود بھی منوں مٹی تلے دبتا جا رہا ہے۔ اس کا دل یا تال میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ اسے سانس حلق میں پھنستی معلوم ہوتی تھی۔ پری کا چہرہ اوجھل ہو گیا..... اس کی بصراتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا تو وہ شدت غم سے خشک ریت پر گر گیا۔ محبت دفن ہو گئی تھی۔ اور محبت کے ساتھ ہی ہر اس بھی مر گئی تھی زندگی مر گئی تھی وہ خالی آنکھوں سے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا اس کے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا کچھ بھی نہیں۔“

”کھانا کھا لو سو جھل۔“ رونا نے کھانا اس کے آگے رکھا۔

”بھوک نہیں ہے۔“ سو جھل نے ریت کے ٹیلوں سے نگاہ ہٹائے بنا جواب دیا تھا وہ ہر وقت ریت



کو خالی نظروں سے دیکھے جاتا تھا۔  
 ”تم نے پوچھا نہیں سوچا! کہ میں کون ہوں  
 اور.....“ روانے بات ادھوری چھوڑ دی۔  
 ”تا دو.....“ سوچا کالجی کسی بھی اثر سے عاری  
 تھا۔

ردا وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”میں اپنے قبیلے  
 کے سردار کی بیٹی تھی میرے باپا میرے بچپن میں ہی  
 لاپتہ ہو گئے تھے۔ ماں نے ہمیشہ مجھے ماں باپ دونوں کا  
 پیار دیا۔ ہم اکثر انسانوں کے بھیس میں انسانی دنیا میں  
 رہتے رہے یہ سردیوں کی بات ہے میں ایک دن لمبی کے  
 روپ میں پھر رہی تھی جب مجھے کچھ لوگوں نے پکڑ لیا  
 اور فٹ بال کی طرح اچھالنے لگے پھر انہوں نے مجھے  
 پختہ اینٹوں پر اچھال دیا جس سے میری ٹانگ ٹوٹ گئی  
 تب ایک الگ تھک کھڑے لڑکے نے ان لوگوں  
 کو سرزنش کی اور مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ لکڑی کے  
 ایک ٹکڑے سے میری ٹانگ باندھ کر اس نے ایک پیالہ  
 میں نیم گرم دودھ مجھے دیا تین دن میں اسی کے گھر رہی  
 اور وہ مسلسل میری دیکھ بھال کرتا رہا جب میں بالکل  
 ٹھیک ہوئی تو وہاں سے نکل گئی مگر میں اپنے محسن کو بھول  
 نہ سکی تھی۔ میں اکثر شبی حالت میں اس کے گھر چلی جاتی  
 اور پھر وہ اسے دیکھتی رہتی بلال نام تھا اس کا۔“

”پھر ایک دن میں اس کے سامنے ظاہر ہو گئی  
 اور اسے سب کچھ بتا دیا کہ میرا تعلق جنات سے ہے  
 اور میں وہی لمبی ہوں مختصر ایہ کہ ہم اکثر ملنے لگے۔ یہ  
 بات میرے قبیلے سے چھپی نہ رہ سکی اور میرے چچا نے  
 مجھے سختی سے منع کر دیا جب میں نے بلال کو بتا دیا تو اسے  
 اپنے گھر والوں کو میرے خواب کے متعلق آگاہ کیا  
 اور خواہش ظاہر کی کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اس  
 کے گھر والوں نے فوراً انکار کر دیا۔“

”بہر حال ہم دونوں بہت دور چلے گئے  
 لیکن..... اس بٹھے میرے چچا نے ایک عمل کے زور پر  
 مجھے قید کر دیا اور بلال کو.....“ اس کی آواز بھرا گئی  
 تھی وہ قدرے تو وقت سے گویا ہوئی۔

”پھر میں اپنے قبیلے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ  
 آئی..... اس کے بعد جب بھی کوئی محبت کرنے والے  
 کسی مشکل میں ہوں میں ان کی مدد ضرور کرتی ہوں.....  
 تم سے غلطی یہ ہوئی سوچا کہ تم نے گناہ کی کوآ زاد کر دیا  
 اسے میں نے بہت مشکل سے سے قید کیا تھا وہ میری  
 پرانی دشمن ہے خیر جب وہ آزاد ہوئی تو حصار ٹوٹ گیا  
 اور وہ گھر ارد شیر کے لوگوں کی نظروں میں آ گیا میں اپنی  
 طاقت بڑھانے کے لئے ایک چلہ کر رہی تھی جو مجھے  
 سمندر میں رہ کر کرتا تھا۔ وہ درخت، جس پر پھول لگے  
 تھے اس کے سرخ پھول یعنی محبت کے پھول گرنے کا  
 مطلب تھا کہ تم دونوں سے کسی ایک کی موت..... جب  
 وہ پھول گرے تو مجھے یہ چل گیا اور میں چلے تو ڈر کر آ گئی  
 مجھے کچھ دیر اس لئے ہوئی تھی کہ میں چلے کے بیروں کے  
 جال میں پھنس گئی تھی میں نے اپنی ساری طاقتیں  
 جو میں نے مختلف چلوں سے حاصل کی تھیں ان سب  
 میں تھیم کر دیں اور آگئی تب تک پری مرچکی تھی ارد شیر  
 مرچکا تھا اور اس کے لوگ نہیں مارنے والے تھے.....  
 میں نے ان سب کے ہتھیار نا کارہ بنادینے اور انہیں  
 واپس جانے پر مجبور کر دیا۔“ وہ چپ ہو گئی وہ جیسے تھک  
 گئی تھی بولتے بولتے سوچا خاموش ہی رہا۔ اس کے  
 پاس گویا اب بولنے کو بھی کچھ نہیں بچا تھا۔

اس نے رات کی تاریکی میں پہلے صحرا کے  
 اندھے پن سے نگاہ ہٹا کر اپنی بے چراغ شبیلی کو کھوڑا تھا  
 کیا تھا اس کے پاس؟ کیا رہا تھا اس کے دامن میں؟  
 کیا بچا تھا اس کی زندگی میں؟ سوائے خالی پن کے.....  
 جب اس کے پاس سب کچھ تھا اور جب ارد شیر سے اس  
 کی لڑائی ہوئی تھی تب اس نے خدا سے سب کچھ ٹھیک  
 رہنے کی کتنی دعائیں مانگی تھیں اور..... اور پھر جب اس  
 کا گھر اس کا شفیق باپ اس کی محبت کرنے والی ماں  
 اس کے لاڈلے بہن بھائی، جب وہ سب مل رہے  
 تھے تو اس نے اللہ سے کتنی مدد مانگی تھی اللہ جانتا تھا تاکہ  
 اس کے سوا کوئی، کوئی بھی سوچا کی مدد نہیں کرے گا اس  
 کے سوا سوچا کی مدد کوئی کر ہی نہیں سکتا پھر اس نے.....

پھر کیوں اس نے اس کی مدد نہ کی تھی؟ سوچا نے پھر  
 بھی اس سے کوئی شکوہ نہ کیا تھا۔  
 پھر کھڑکی میں قید لگا گئی تھی اسے اللہ کا واسطہ  
 دیا تو اس نے اسے آزاد کر دیا۔ یہ سوچ کر اس کی مدد کی  
 اللہ کو دوسروں کی مدد کرنا پسند ہے..... اور اس کا صلہ  
 اسے کیا ملا.....؟ پری کی موت؟ اس نے اللہ سے مسلسل  
 پری کی زندگی مانگی تھی۔

اللہ جو کہتا ہے کہ مجھے بکاؤ، میں تمہاری دعا قبول  
 کروں گا جس کا فرمان ہے کہ جب کوئی بندہ مجھے پکارتا  
 ہے تو میں کہتا ہوں ”ایلیک یا عیدی“ (میں حاضر ہوں  
 میرے بندے) پھر؟ پھر اس کی ساری دعائیں کیوں  
 خالی ہاتھ لوٹا دی گئی تھیں؟ اس کی پکار کا اللہ نے جواب  
 کیوں نہ دیا تھا؟ اسے تو یہ تھا نا کہ اسے پری کی کتنی  
 ضرورت ہے۔ پھر اس نے کیوں.....؟ اسے اللہ سے  
 بہت سی شکایتیں پیدا ہو چکی تھیں اور یہ محض سوچا کی  
 حد تک ہی نہیں ہے، ہم سب کا رویہ تقریباً ایسا ہی  
 ہوتا ہے مگر۔

☆.....☆.....☆

وہ لوگ ناریل اور دیگر درختوں کے تنوں، پتوں  
 اور بیلوں کی مدد سے ایک جھوپڑی تیار کر چکے تھے،  
 خوراک کا مسئلہ ناریل کے درختوں نے حل کر دیا تھا۔  
 اس جزیرے پر سوائے ان کے، کوئی ڈی گیس تھا، نہ ڈی  
 روح..... انہیں یہاں آئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا  
 مگر لگتا تھا کہ سالوں بیت گئے ہیں بھی کبھی ایسا بھی  
 ہو جاتا ہے کہ وقت لگتا ہے، گویا ختم گیا ہے مگر درحقیقت  
 وقت گزر جاتا ہے زندگی رک جاتی ہے..... ایسا ان کے  
 ساتھ بھی ہو رہا تھا..... وہ اکثر جزیرے پر بولائے  
 بولائے پھرتے رہتے تھے سب کچھ رک رک کر سامحوس  
 ہوتا تھا جزیرے پر چھوٹے بڑے گڑھے موجود تھے جن  
 میں کچھ کانہوں نے مزید گہرا کر لیا تھا ہر چند دن  
 بعد ہونے والی بارش ان گڑھوں کو پانی سے بھر دیتی تھی  
 جسے وہ پینے اور نہانے کے لئے استعمال کرتے تھے  
 ڈبزی اکثر سمندر سے مچھلیاں اور سیپ وغیرہ پکڑ لاتا تھا

جن کو آگ پر بھون کر منہ کا ڈانٹہ بدل لیا جاتا.....  
 رومان اور سارہ چونکہ سیپ وغیرہ نہیں کھاتے تھے اس  
 لئے وہ ان کے لئے مچھلیاں پکڑ لاتا جزیرے پر خاموشی  
 کا راج تھا اور ویرانی کوان لوگوں کی آمد بھی نہ بھگا پانی  
 تھی وہ شام کا وقت تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا سارہ پہاڑی پر ایک  
 درخت سے ٹیک لگائے کھڑی ڈوبے سورج کو دیکھ رہی  
 تھی جوانی تاریکی کرکوں سمیت بحر اوقیانوس میں اترتا  
 چلا جا رہا تھا دور دور تک پانی کی تہوں میں ڈوبے سورج  
 کی تاریکی کرکوں سطح پر بکھری..... چل رہی تھیں..... مل  
 کھا رہی تھیں.....

”کیا سوچ رہی ہو.....؟“ رومان اچانک  
 آیا تھا۔

”ہم..... شران کو لینے آئے تھے اور خود.....“  
 اس کے حلق میں ٹھک سا بھر گیا پتہ نہیں، ہم یہاں سے  
 نکل بھی پائیں گے یا یہیں مرجائیں گے۔“ اس نے  
 اپنی نم آنکھوں کو گڑا۔

”ایسا نہیں سوچتے، پتہ ہے ایک بار جب حضرت  
 موسیٰ کی موت قریب تھی تب انہوں نے کوہ طور پر اللہ  
 سے اپنی امت بنی اسرائیل کے بارے میں تشریف  
 کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے عصا  
 کو پتھر پر مارو۔“

ایسا کرنے سے حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ تاحد  
 نگاہ سمندر ہے مجھے یہ واقعہ اپنی تمام جزئیات سمیت تو  
 یاد نہیں مگر بہر حال..... اس سمندر میں شاید چھوٹی سی کوئی  
 چٹان تھی اللہ نے اس پر عصا مارنے کا حکم دیا اور حضرت  
 موسیٰ نے ایسا ہی کیا پتھر میں شکاف پڑا اور اس میں سے  
 ایک کیڑا نکلا جس کے منہ میں سبز پتہ دبا ہوا تھا جسے وہ  
 کھا رہا تھا۔

تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔ اے  
 موسیٰ جب میں پتھر میں موجود اس کیڑے کو زرق  
 پہنچا رہا ہوں..... تو۔“

”ارے سا رہ ایکیا ہوا تم رونے کیوں

لگیں.....؟“ اسے روتا دیکھ کر وہ بات ادھوری چھوڑ گیا۔

”ہم..... ہم انسان کس قدر ناشکرے ہیں نا اذرا مشکل پڑی اور فوراً اللہ کی رحمت سے مایوس ہو گئے۔“  
 واقعی! جو رب پتھر میں کیڑوں تک کو رزق پہنچاتا نہیں بھولتا وہ بھلا ہم کو کسی مشکل میں کیسے اکیلا چھوڑ سکتا ہے؟ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔“ اس کے کم لہجے میں پختہ یقین بول رہا تھا..... اللہ کے مہربان، مددگار ہونے پر پختہ یقین کامل حدود کو چھوٹا ایمان۔“ انشاء اللہ رومان کا لہجہ بھی مستحکم تھا اور بڑی جوار دیکھ لیتا تھا ان کے لہجے میں بولنے استحکام اور یقین دایمان کی پختگی پر دم بخود کھڑا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

اس نے کسماتے ہوئے آنکھیں کھول دیں ماہ شب کا ہاتھ ابھی بھی اس کی گرفت میں تھا۔ اس نے بڑا کراہا دھڑک دیکھ اور سناٹے میں رہ گیا۔ وہ سمندر کی تہوں میں تھا ہاں بلاشبہ وہ سمندر کی تہہ ہی تھی نیلگوں مائل سمندری گھاس، وٹیکڑا پودے، پھلیاں اور دیگر آبی مخلوق..... اسے سناٹ کر دینے کو کافی تھیں پانی پر سکون تھا ماہ شب نیلگوں مائل گھاس جس پر سفید پھول جا بجا لگے تھے ایک پھلی جس کا اوپری نصف دھڑا انسانی تھا تیری ہوئی ان کے پاس آئی اس کے بے انتہا لہجے سنہری بال پانی میں بری طرح مل کھاتے تھے۔  
 وہ دم بخود سا دیکھ گیا۔

”کون ہو تم.....؟“ اس کی آواز پہ وہ گویا کرنٹ کھا کر کسی خواب کی سی کیفیت سے بیدار ہوا تھا۔  
 اور اسی لمحے اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا تھا وہ سمندر میں تھا مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ آزاد فضا میں ہولا زم تھا کہ پانی اس کے پیچھے پیچوں میں داخل ہو کر اسے ہلاک کر ڈالتا۔ مگر وہ بالکل ٹھیک تھا، جب وہ بولا تو پانی میں بلبلے سے بننے لگے۔ اس نے اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کر کے ماہ شب کو پکارا تھا..... مگر اس کے سناٹ و جود میں جھنک نہ ہوئی تھی۔

”یہ مریچی ہیں عارضی طور پر۔“

وہ پھل لٹکی بن چکی تھی تاہم اس کے ناکافی لباس نے شران کو نظر میں چرانے پر مجبور کر دیا۔  
 ”گلتا ہے آپ ان کو کافی.....“ لڑکی نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔ شران محسوس ہی نہ کر پایا اس کی دھڑکنیں تو ماہ شب کی موت کا سن کر ہی ٹھنک گئی تھیں اس کی بغض جیسے ساکت ہو گئیں۔  
 ”یہ مر گئی؟ میرے اللہ.....“ وہ زیر لب بڑبڑایا اور پانی کے چھوٹے چھوٹے سے بلبلے اسے اوپر اٹھتے چلے گئے۔  
 ”انہوں نے تم کو بتایا نہیں کہ یہ ٹھیک کیسے ہوں گی؟“ لڑکی نے دریافت کیا۔ تب اس کے حواس سمٹ کر دماغ میں ساگنے اور اس کے ذہن میں بھماکا سا ہوا۔

”اگر ایک ماہ کے اندر تم نے مجھ پر آب حیات نہ ڈکایا تو میری عارضی موت، دائمی ثابت ہوں۔“ اس نے بے قراری سے ہاتھ مسلے۔  
 پھر لڑکی کو بتایا۔ ”وہ مجھے شیا نگ قبیلے کے بارے میں کچھ بتانے والی تھی مگر.....“ اس نے حد درجہ تاسف سے بات ادھوری چھوڑ دی۔  
 ”شیا نگ قبیلہ.....“ لڑکی کا انداز پر سوچ تھا۔  
 ”ہاں..... ایہ قبیلہ یا نگ لائی کا مشہور ترین قبیلہ ہے اور کہتے ہیں کہ آب حیات ایک پھل کی شکل میں ان کے ہاں پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ جوان رہتے ہیں لیکن وہ لوگ مرکز بھی کسی اور کو اس کے بارے میں نہیں بتاتے۔“  
 ”میں ہر حال میں آب حیات حاصل کروں گا۔“ اس کا لہجہ چٹانوں کا ساخت تھا جس میں اپنی عزم جھلکتا تھا۔

”تم کون ہو.....؟“ اس نے دریافت کیا۔  
 ”میرا نام اجڑل ہے اور ماہ شب اور شاہ لبریز ہمارے پیشوا ہیں تم یوں سمجھ لو کہ جیسے تم مسلمان کسی کے مرید ہوتے ہو، اسی طرح.....“ وہ عائب دماغی سے

بلا گیا۔

”م..... میں واپس کیسے جاؤں.....“ اس کا دل بے کیفیت میں دھڑک رہا تھا۔  
 ”یہ تمہارے ہاتھ میں انگوٹھی ماہ شب ہی کی ہے“ شران نے چونک کر اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی دیکھا جہاں تقریباً انگوٹھی میں نیلگوں مائل بڑبڑ پتھر لگا رہا تھا۔ یہ اسے یا نگ لائی پر ماہ شب نے دی تھی۔  
 ”ہاں.....“ اسے اپنی آواز کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

”پھر کم از کم سمندر میں تو تم کو کوئی خطرہ نہیں۔ آؤ میں ہاتھ لائی تک چھوڑ آتی ہوں۔“  
 وہ انہی..... لیکن ماہ.....“ اس نے سناٹ کی ماہ شب کو دیکھا۔

”یہ تب تک یہیں رہیں گی ان کی حفاظت ہم کر کریں گے۔ اے اللہ ماہ شب تیرے سپرد۔“ اس نے کہا اور اسے بیک احساس ہوا کہ اس انہی دنیا میں اس کیسر انہی دنیا میں کوئی ہے جو اس کے ساتھ ہے اس کا ”اپنا“ ہے جو ایک ایسا ”اپنا“ ہے جو اسے کسی ہی حال میں کسی بھی صورت سے اسے تنہا نہیں چھوڑے گا اسے لگا کہ چاہے پوری دنیا اس کے خلاف ہو جائے اللہ اس کے ساتھ ہے اور جب ”وہ“ ساتھ ہے تو پھر رکاوٹ کا؟ اسے لگا کہ اب کوئی مشکل اس کے لئے ”مشکل“ نہیں رہی..... اس کا سینہ اللہ کی محبت و ایمان کامل سے بھر گیا۔ نور سے بھر گیا.....  
 سینان سے بھر گیا..... اس سے قبل اسے ایسا یقین ایسا یقین بھی نصیب نہ ہوا تھا جب سب ساتھ چھوڑ دیتے اس شب اللہ یاد آتا ہے اور جب اللہ یاد آتا ہے تو ہم بے اختیار اس کو پکارتے ہیں اسی کو جو واقعی مددگار ہے اور جب ہم اسے پکارتے ہیں تو یہ تو کسی صورت کسی صورت بھی ممکن نہیں کہ ”اللہ“ ہماری پکار نہ سنے اور ہماری مدد نہ کرے۔ ہاں ایسا ہو جاتا ہے کہ کچھ لوگوں کو وہ آزمائش کے لئے چن لیتا ہے سو اگر کم اللہ کے ہاتھ کا یقین رکھیں تو اس آزمائش میں پورا اثر سکتے ہیں

اس کے برعکس اگر ہم بے خبری کو اپنا شعار بنالیں وادیا کریں مشکلات کا رونا روئیں شکوے کریں تو ہمیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا ہمیں صرف ”اللہ“ سے مدد مانگنی چاہئے جو ہماری مدد کرنے پر قادر ہے اگر وہ نہ چاہے تو کوئی بھی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔

”یا اللہ حضرت محمدؐ کے صدمے میری مدد فرما۔“ اس نے دعا کی وہ دعا جس کی قبولیت پر اسے ایمان کی حد تک پختہ یقین تھا۔  
 ”آؤ.....“ اجڑل نے ہاتھ بڑھایا۔

”یا اللہ.....“ اس نے اللہ کو پکارا اجڑل کا سر د ہاتھ تھا ایک آخری نگاہ ماہ شب کے سناٹ و جود پر ڈالی اور اجڑل کے ہمراہ کی پھلی کی مانند اوپر کو تیرا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

میرے گناہ کیا تیری رحمت سے بڑھ گئے؟  
 پھر کیوں میری دعاؤں سے تاثیر سمجھتی؟  
 اس نے سلام پھیر کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے۔ ”یا اللہ! مجھے معاف کر دے، میں تیری ذات سے غافل تھا۔ میرے پاس فضول کاموں کے لئے تو وقت ہوتا تھا مگر نماز کے لئے نہیں، میں بس اتنا جانتا ہوں میرے اللہ کہ میرے گناہ ریت کے ذروں سے زیادہ سبکی پانی کے قطرے سے زیادہ سبکی، درختوں کے پتوں سے زیادہ سبکی، مگر تیری رحمت کے ایک بھی قطرے سے زیادہ نہیں، تیری رحمت کا..... صرف ایک قطرہ میرے تمام گناہوں کی سیاہی دھو سکتا ہے یا اللہ آج اس دور میں ہم تیرے وجود کو تیری ذات کو فراموش کئے ہوئے ہیں مگر اہ ہو چکے ہیں میرے مالک! ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما! میں والدین کی اجازت کے بغیر آیا ہوں، مجھے اس کے لئے معاف کر دے اور..... اور میری مدد فرما..... مجھے یہاں سے جلد فارغ کر دے تاکہ میں جا کر امی اور بابا سے معافی مانگ سکوں۔“ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے تو آنسو اس کے رخساروں پر پھیل گئے ہم جو اللہ کی ذات سے غافل ہو چکے ہیں

تو اللہ ہمیں دکھ کی، درد کی، آزمائش کی، مصیبت کی ٹھوکریں لگاتا ہے تاکہ ہم اپنے آپ کو اپنی ذات کو اپنی اوقات کو بچا نہیں غلط راستے پر چلتے ہوئے ہم سیدھے راستے کو فراموش کئے ہوئے ہیں وہ ٹھوکرا لگاتا ہے کہ ہم سنبھل جائیں غلط راہ چھوڑ کر صراطِ مستقیم پر چلیں ان لوگوں کا راستہ جو جیسے ہوئے نہیں تھے اور ہم دینی طور پر سنبھل جاتے ہیں اللہ کے قریب ہو جاتے ہیں اور جب وہ مشکل دور گزر جاتا ہے تب ہم پھر گناہوں کی دلدل میں دھنسنے چلے جاتے ہیں پھر مشکل پڑتی ہے ہم پھر خدا سے رجوع کرتے ہیں وہ ہمیں مشکل سے نکالتا ہے ہم پھر اس کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ پھر پریشانی پیش آئے تو ہم ہر باری طرح اللہ سے رجوع کرتے ہیں پھر گناہوں سے توبہ اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد۔ مگر پھر بھول جاتے ہیں۔

حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ ”ایک شخص گناہ کرتا ہے اور گناہ کرنے کے بعد اس کے اندر پشیمانی پیدا ہوتی ہے وہ اللہ سے رجوع کر کے توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے مقررین ملائکہ سے پوچھتا ہے کہ یہ شخص کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار! یہ شخص فلاں بن فلاں ہے اس سے گناہ مردود ہو گیا ہے اب یہ تجھ سے معافی کا طلب گار ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ”اے فرشتو! گواہ رہنا، میں نے اس شخص کی خطا معاف کر دی، اس کی توبہ قبول کی، اسے بخش دیا اور اس کے درجات میں بلندی کر دی۔“ وہی شخص دوسرے دن پھر گناہ کرتا ہے احساس ہونے پر اللہ تعالیٰ سے معافی اور توبہ کا خواستگار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر مقررین ملائکہ سے پوچھتے ہیں کہ یہ شخص کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس نے پھر گناہ کیا ہے اور پھر تجھ سے معافی مانگ کر توبہ کا طالب ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرماتا ہے کہ فرشتو! گواہ رہنا میں نے آج بھی اس کی توبہ قبول کی اس کے گناہ معاف کئے اور اس کے درجات میں بلندی کر دی۔“ تیسرے دن پھر اس شخص سے گناہ مردود ہو جاتا ہے اور پھر احساس

ہونے پر اللہ تعالیٰ سے معافی اور توبہ کا خواہاں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ پھر مقررین ملائکہ سے پوچھتے ہیں کہ ”یہ شخص کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟“ اب کے فرشتوں کے لہجے میں ناگواری آ جاتی ہے وہ بیزار ی سے کہتے ہیں۔ ”اے پروردگار! یہ وہی فلاں بن فلاں ہے روزانہ گناہ کرتا ہے روز تجھ سے معافی مانگتا ہے یہ تیری ربوبیت اور جاہ و جلال سے کھیل رہا ہے۔“ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

”اے فرشتو! آج سے تمہارے اور اس شخص کے درمیان میں نے ایک پردہ ڈال دیا ہے۔ آئندہ تم اسے نہیں دیکھ سکو گے لیکن اس سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے پھر اس شخص کی توبہ قبول کی اس کے گناہ معاف کر دیئے اور اس کے درجات میں بلندی کر دی اور مجھے قسم ہے اپنی ربوبیت کی اور جاہ و جلال کی کہ اگر یہ شخص قیامت تک ایسا کرتا رہے گا تو میں قیامت تک ایسا کرتا رہوں گا۔“ تو پھر کیا کوئی اس قدر مہربان ہو سکتا ہے؟ گھر سے گھر کے رشتے بھی دوسری سے تیسری مرتبہ معاف نہیں کرتے سب سے گہرا سب سے پختہ اور سب سے خوب صورت رشتہ انسان کا اللہ سے ہے اور ہم فانی، بلکہ چند روزہ رشتوں کی خاطر اس سب سے مضبوط ترین رشتے کو فراموش کئے ہوئے ہیں ہم نے اس رشتے کو محض ضرورت کا رشتہ بنا رکھا ہے یعنی جب ہمیں ضرورت ہوتی ہے تب اللہ سے رشتہ جوڑ لیا اور جب ضرورت پوری ہو گئی تو پھر عالم فراموشی..... اور اللہ تعالیٰ کی شان و رحمت دیکھنے کے ہر بار کتنی آسانی سے معاف کر دیتا ہے اللہ ہمیں سچی توبہ نصیب فرمائے آمین۔“

شران خوش نصیب تھا کہ اس نے اللہ برتر سے وہ تعلق جوڑ لیا تھا جو اس رشتے کا حق ہے وہ رشتہ جو ہر حال میں ہر صورت ساتھ نبھاتا ہے وہ رشتہ جب سب رشتے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو تب بھی واحد رشتہ کام آتا ہے وہ رشتہ..... جو قبر میں، حشر میں، عذاب سے بچائے گا جب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں کوئی پاس نہیں

رہتا تب اللہ یاد آتا ہے..... شران فنی کو بھی تنہا پائی میں بھی یاد آیا تھا..... وہ جو سب سے بڑھ کر ”اپنا“ ہے وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ اور پھر اٹھ کر ایک نظر ساحل پر لگا آگے بڑھ گیا۔

صبح کا اجالا ختم لے رہا تھا جب رات نے اس کے کانوں میں تمام واقعہ کہہ ڈالا۔ بڑے ہوتے دن نے عذاب دیا تھا۔ ”خوش نصیب ہے شران فنی..... لیکن مجھے تو اس پر ترس آ رہا ہے وہ اکیلا ہے اور اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہے۔“ رات جاتے جاتے رک کر گویا ہوئی۔ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

”اول ہوں.....“ دن نے فوراً حسیہ کی۔ ”یاد رکھو جس کے ساتھ کوئی بھی نہیں، اس کے ساتھ اللہ ہے اور جس کے ساتھ اللہ ہے اسے کوئی مشکل روزی دنیا کے دکھ بھی ہر نہیں سکتے۔ رات نے بغور سنا اور پھر تشکرانہ نظروں سے دن کو دیکھتی اثبات میں ہر بلا کر رخصت ہو گئی شران کی دن بھر کی روداد اسے تمام کون سے سننا تھی۔

☆.....☆.....☆ سورج نصف النہار پر تھا تمام جنگل، گویا پورا لٹک لائی سویا ہوا تھا۔ درختوں نے افسردگی سے جھکا کر اٹھا پرندے گھونسلوں میں دیکے ہوئے تھے۔ راقا تب بھی غالباً وہ زیر زمین خواستراحت تھی۔ قد آدم درختوں کے پتے دھوپ سے نبرد آزما تھے۔ شران کے لہجہ خور و گھاس اور نیلوں پر بکھری خاموشی کے وجود کو گلے کیلے جاتے تھے خاموشی محض کسما کسما پھر خشک ہل کے ہمراہ چراہر کر رہ جاتی وہ آگے بڑھتا رہا۔

یہی تک اسے کوئی ذی روح دکھائی دیا تھا، نہ ذی حی..... اچانک کسی درندے کی چٹکھڑا بھری رسنائے میں شگاف ڈال گئی۔ کسی کی درد بھری چیخ کھٹی گئی سی تھی۔ اس کے قدم بے اختیارانہ اس سمت لڑھکنے لگے۔ ایک خاردار جھاڑی کے پرستے ایک سفید کتا کسی کو دبوچے ہوئے تھا۔ شران نے لاشعوری طور پر چپتے کی دم پکڑ کر کھینچا۔ اس کی یہ حرکت قطعاً

اضطرابی تھی۔ چپتا مشتعل ہو کر شکار کے بیچ مداخلت کرنے والے کی جانب پلٹا اس کے کھلے جڑے سے جھانکتے خون آلود دانت لٹخ بھر کو شران کو ٹھٹھا کا گئے۔ چپتا غرایا اور اگلے پاؤں اٹھا کر اس پر چھپا..... اسی لمحے..... عین اسی لمحے ایک تیز سنسانا ہوا آیا اور چپتے کی گردن میں پیوست ہو گیا شران چند قدم پیچھے ہٹا تھا چپتے کی گردن سے خون ابل رہا تھا اور حلق سے نکلنے والی غرائشیں بڑی ہیمیا تک گئیں۔

☆.....☆.....☆ سودا جنوں کا سر سے اتر تو نہیں گیا مجنوں نکل کے دشت سے گھر تو نہیں گیا پوچھنا پھر پلٹ کے اسیر جنوں کا حال تجھ سے چھڑ کے جان سے گزرتو نہیں گیا روانے بہت کوشش کی تھی مگر وہ دیوانہ واپس جانے کو کسی طور راضی نہ ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

”میں واپس جا کر کیا کروں گا سب کچھ تو ختم ہو چکا ہے۔“ ردا اس کی خند سے ہار گئی تھی اس نے صحرا میں بسنے والے جنات کے قبیلے کو اس سے متعارف کروا دیا تھا اس قبیلے کا نوجوان سردار ارشاد ردا کا طلب گار تھا۔ مگر ردا بھی سو جھل کی طرح ان لوگوں میں سے تھی جو محبت میں بھی ”توحید“ کے قائل ہوتے ہیں وہ بلا ل کی جگہ کسی اور کو نہ دے سکتی تو پھر اپنا آپ کیسے کسی اور کے حوالے کر دیتی؟ وہ خود پھر واپس چلی گئی تھی۔

رات باقی تھی جب وہ پھر اٹھا عمر گزری ہے، رات باقی ہے پلوٹے نے اندیرے کو دیکھ کر اپنی جلتی آنکھوں کو بری طرح مسلا تھا۔ ارد شیر جب کمرے میں داخل ہوا تو، علم ہوا تھا کہ پری غائب ہے تو سب ملازموں کی شامت آ گئی تھی۔ اور بالا خرہ صدوری نے اسے بتا دیا کہ اس نے پلوٹے بی بی کے ہمراہ ایک لڑکی کو جاتے دیکھا ہے ارد شیر دندنا تاسیدھا پلوٹے کے کمرے میں گیا اور اسے بری طرح دھنک ڈالا مگر وہ اس سے ایک لفظ



بھی نہ اُلگوا سکا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کے حلق سے زبان کے ہمراہ بری کا پتہ بھی کھینچ لے مگر گھبراہٹ سے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا اس نے حواس سے بے گانہ پلوشے کے وجود کو ٹھوکر ماری اور اسے زندان میں پھینکنے کا حکم دے کر چلا گیا جلد ہی اسے علم ہو گیا کہ سوجھل اور پر زناد جنگل کی سمت گئے ہیں اور پھر..... پر زناد مر گئی..... ارد شیر کی میت بھی گھر آ گئی اسے دُعا بھی دیا گیا دوسروں کو زندگیاں سے محروم کرنے والا خود اپنی زندگی سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ زمین پر تکبر سے چلنے والا، زمین کے نیچے پڑا تھا۔ بلاول چانڈیو کم صبر ہو کر رہ گیا..... سارا انتظام صغیب چانڈیو نے سنبھال لیا لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ صغیب اور ارد شیر میں کوئی خاص فرق نہ تھا یقیناً وہ کچھ عرصے تک ارد شیر کا ظاہر کر دیتا اریب شہر میں ہاسٹل میں تھا پڑھ رہا تھا پلوشے کو بھی بھول چکے تھے زینے ماں اور امینے ماں بھی..... بلاول چانڈیو بھی..... اور صغیب چانڈیو بھی۔ صرف اریب نے اور پری چہرہ تجیس جو کبھی کبھار اس کی خبر گیری کر لیتیں صدوری اسے کھانا وغیرہ دینے پر مامور بھی صرف پلوشے تھی اور زنداں کی تنہائی اور تاریکی بھی اور کچھ نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

چیتے کے دم توڑتے ہی ایک درخت سے کوئی نیچے کودا تھا۔ دھب کی آواز ابھری اور معدوم ہو گئی۔ وہ ایک عورت تھی اس کی عمر کوئی بیس چونتیس برس رہی ہوگی چہرے کے نقش قبول صورت سے اور گرلی آنکھوں میں تشکر کی لہریں..... اس نے جیب سے آواز میں کچھ کہا۔ ثمران اس کے انداز سے سمجھ گیا کہ وہ اس کا شکر یہ ادا کر رہی ہے۔ وہ جھاڑی کی جانب بڑھی اور جب واپس پلٹی تو اس کے شانے پر ایک گیارہ بارہ سالہ بچہ جھول رہا تھا اس کا دایاں کندھا خون آلود تھا اور بچہ بے ہوش تھا عورت نے ثمران کو اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہا اس نے چند ثانیے کو سوچا اور پھر قدم عورت کی تقلید میں بڑھادیے درختوں

پر پرندوں نے شور مچا رکھا تھا مگر اس کے باوجود ویرانی کی ویرانی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ چپ ہوا تو سارہ دم بخود ہی بیٹھی رہی..... جھوپڑی کی جادو فضا میں ان کے مابین خاموشی آنٹنٹھری..... باہر سورج ڈوب رہا تھا..... اور جھوپڑی کی درندوں سے کرئیں جھانک رہی تھیں..... سوجھل کی آنکھوں میں سارے جہاں کی ویرانی سٹ آئی تھی کچھ دیر قبل جہاں تاحد نگاہ دھنک رنگ محبت کا بھیرا تھا وہاں اب خالی پن کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے سوجھل کی آنکھوں میں کرؤٹیں لیتے کرب سے گھبرا کر سر جھکا لیا سوجھل نے تھک کر جھوپڑی کی پشت سے نکالیا۔ ان کے پرکشش چہرے پر صدیوں کی ٹھکن رقم تھی۔ آبا پامساقت کی اذیت اس نے اس کے چہرے پر پڑا گاڑ رکھے تھے۔ سورج اب غالباً ڈوب چکا تھا یا درندوں سے جھانکتی کرئیں راست بھول گئی تھیں۔

”وہ نہیں بھوک لگی ہوگی۔“ سوجھل نے یکہ آ نکھیں کھول دیں اور اس کی بات سے بنا باہر نکل آیا محض دو ڈھائی منٹ بعد وہ واپس پلٹ آیا مگر وہ اور اپنے چالوں پر مشتمل کھانا اس نے سارہ کے آگے رکھ دیا اور خود پر زناد کی قبر پر جا بیٹھا اس کی خالی آنکھیں محبت کی قبر پر لڑی تھیں محبت مر گئی تھی مگر محبت زندہ تھی..... اور محبت کی یہ ”زندگی“ ہی تو اذیت دیتی ہے۔ اب ہی اچھا ہو جو محبت کرنے والوں کے ساتھ ہی محبت ہی مر جائے..... تاکہ مزید لوگ تو اس کے ہاتھوں نہ مر جائیں۔

☆.....☆.....☆

وہ کھنے درختوں سے گزر رہے تھے جب اچانک ایک سرخ رنگ کا ناگ اچھل کر عورت کی جانب آیا مگر ثمران کو اس کا چمن کھیلنے میں بھڑکائی بھی تاخیر ہو جائی تو عورت اس کا شکار بن چکی ہوئی ساکت کھڑی عورت تشکر اور ممنون انداز میں اسے دیکھ رہی تھی پھر وہ چلنے لگی اور اس بار اس کی چال میں ذرا ڈانٹا کھڑا ہٹ گئی۔

نے دیکھا کہ سامنے ٹکڑوں سے بنی ایک جھوپڑی تھی عورت اسی جھوپڑی میں داخل ہو گئی۔ اور نیچے کچھی گھاس پر بیٹے کو لادیا اسے بچے کے پاس رکھنے کا اشارہ کر کے وہ باہر نکل گئی اس دوران وہ جھوپڑی کا جائزہ لیتا رہا جہاں چند منٹ کے بتروں کے سوا کچھ خاص نہ تھا آہٹ پر اس نے سر کھٹا کر دیکھا عورت واپس آ گئی تھی اور اب وہ کوئی نگاہوں میں مرہم بچے کے بازو پر لگا رہی تھی بے ہوش بچہ کسمایا..... اور پھر اس کے چہرے پر اطمینان چھا گیا عورت پھر اسے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کے چلی گئی بچہ اس دوران سویا رہا اس باوروت کی واپسی کافی دیر بعد ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں بڑے بڑے بچوں پر بھنا ہوا گوشت رکھا تھا جو وہ بڑی چاہ سے اسے کھلانے پر مصر تھی مگر اس کے پیش نظر حلال حرام کا مسئلہ تھا وہ بڑی مشکل سے اسے اپنی بات سمجھایا عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور جا کر ایک جنگلی بکری کو پکڑ لائی پھر اس نے ایک ڈول میں دودھ نکالا اور ثمران کو پیش کیا اس نے دودھ پیا لیا اگرچہ اس کا ذائقہ کچھ مختلف تھا عورت اسے اپنے بارے میں بتانے لگی کہ اس کا شوہر پکا ہے اور وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ایک رات ہی ہے پھر اس نے اشاروں ہی سے ثمران سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کس لئے آیا ہے؟ وہ اک طویل سانس لے کر رہ گیا اشاروں میں اپنی بات سمجھانا بہت مشکل تھا مگر اسے یہ کرنا ہی تھا کہ شاید وہ عورت سے شیانگ قبیلے تک اس کی رہنمائی کر سکتی..... وہ اسے بتانے لگا تب عورت نے اشارے سے کہا کہ وہ بات کرے، وہ اس کی زبان سمجھ سکتی ہے۔ کہ اکثر لوگ یہاں آتے رہتے ہیں تب وہ اسے مختصر بتانے لگا۔

ماہ شب اور شاہ لبریز کے ذکر پر عورت کے چہرے پر حیرت انداز آیا لیکن جب شیانگ قبیلے کی بات آئی تو اس کا چہرہ ہراس کی آماجگاہ بن گیا۔ اور آنکھوں میں دہشت نے ڈیرے ڈال لئے۔ اور اس کی بات کے جواب میں عورت نے جو کہا اس نے ثمران کو تنبیہ کر دیا وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ تم نے میرے بچے

کو اور مجھ کو بچا کر جو احسان کیا ہے، وہ بہت بڑا ہے مگر اس کے بدلے تم میری جان مانگو تو میں دے سکتی ہوں مگر شیانگ قبیلے کا کا پتہ نہیں بتا سکتی۔ ثمران اشاروں کی زبان، بس اتنی ہی سمجھ سکا غالباً وہ کہہ رہی تھی کہ شیانگ قبیلے کا پتہ بتانے کی سزا موت سے بھی بھیا تک ہے وہ ساتھ ساتھ اس عجیب و غریب زبان میں کچھ بول بھی رہی تھی اسے اضطراب میں یا ڈنٹیں رہا تھا کہ ثمران اس کی زبان سے ناواقف ہے اس نے عورت کو چپ کر لیا اور کہا کہ وہ اسے مجبور نہیں کرے گا عورت پھر مگھورانہ انداز سے اسے دیکھنے لگی اس بار اس کی گہری آنکھوں میں ثمران کے لئے تشکر کے ساتھ ساتھ عقیدت بھی تھی پرندوں کی آوازوں کے علاوہ خاموشی کا عالم تھا۔

☆.....☆.....☆

موسم کے تیور جارحانہ تھے بجلی رہ رہ کر چمکتی تھی اور بادل گاہے بگاہے اسے دھمکانے کو غراتے تھے بجلی شرارت سے بادلوں کو آنکھیں دکھائی پھر پھل کر نکل جاتی اور بادل پھر غرا کر اسے دبوچ لیتے۔ سرسراہٹ ہوائیں بین کرتی محسوس ہوتی تھیں احمر کوڑی میں کھڑا باہر جھانک رہا تھا سارہ کی وہ آخری ویران نگاہ اسے نکوار کی مانند کاٹتی تھی اور اس کی دماغ سے منگنی کے بعد خود اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ خود بھی سارہ سے محبت کرنے لگا تھا۔ ہاں! اسی عام سی سارہ ارشد سے جس سے وہ ہمیشہ چڑتا تھا لیکن اس کے چڑنے کی وجہ ایک بہت خاص لڑکی زویا تھی اس کی کانچ فیلوڑ دیا فہد..... جس کے فیشن جس کی ڈریسنگ اور جس کی پرکشش شخصیت کے چرچے پورے کانچ میں تھے لڑکے جس سے بات کرنے کے خواہاں تھے اور جو اصرار ضیاء کی محبت کا دم بھرتی تھی ان کی محبت کے چرچے بھی جلد ہی ہونے لگے..... ہونٹنگ، روٹھنا منانا اور بھی کچھ..... وہ سبھی کچھ جو دو محبت کرنے والوں کے بیچ ہوتا ہے لیکن ایک شام..... بارہ جنوری کی اس شام کیا ہوا تھا؟ کیا اسے کچھ یاد کرنے کی ضرورت تھی..... نہیں؟ اسے سب

مستند ڈاکٹروں، حکیموں، ماہرین طب، ہدایات مشوروں سے لکھی گئی مفید کتاب

قیمت -/100 روپے

## پیپٹائٹس اور علاج

(کالاریقان)

پڑھے پیپٹائٹس کیوں اور کیسے ہوتا ہے، جگر کی ساخت، جگر کا اہم کام، یوریا بننے کا عمل، ناکارہ خون کے ذرات، مفید عضو، پیپٹائٹس اور کینسر، جنسی علامات، مرض کی وجوہات، قدرتی نظام، گردوں کا عمل، پیپٹائٹس اے، اور پیپٹائٹس بی، ایلو پیٹیتی اور ہومیو پیٹیتی علاج، پیپٹائٹس کا طبی علاج، دافع درد جگر، نسخہ دافع یرقان، نسخہ آلمہ، شربت انار، عرق کاسنی، نسخہ آب آہن، تاب، خشک انجیر سے علاج، گردے کا درد، گردے کا ورم، جگر پر ورم، جگر میں گرمی، یرقان (پیلیا)، زیادہ پیشاب آنا، گردوں کے نقص، جگر میں ورم کے لئے، تلی کا رائے سے علاج، تلی بڑھنا، تلی کا ورم، آک سے یرقان کا علاج، امراض گردہ مثانہ کے چند نسخے، دن میں صرف دو بار کھائیے، دن میں آٹھ گلاس پانی پینا ضروری ہے، روزانہ پندرہ منٹ ورزش کریں، حفظان صحت کے 39 اصول، اور دیگر معلومات اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

شیخ بک ایجنسی نوید اسکوائر گراچی اردو بازار

Ph:32773302

یاد تھا اور یہی تو سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ اسے سب "یاد" تھا..... بارہ جنوری کی وہ صبح آلود شام آج بھی زندہ تھی اور ابھی بھی تازہ تھی۔ اس شام ہر منظر کو دھند نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اور ہر ذریعہ فہمید کا ہاتھ تھا سے پارک میں ٹہل رہا تھا پارک میں اکا دکا لوگ تھے وہ اس سے باتیں کرتے تھے شیخ پر آن بیٹھا تھا زویا نے اپنا سر اس کی آغوش میں رکھتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا اور احمر نے کرنٹ کھا کر اسے دیکھا تھا اس کی نظروں میں صاف بے یقینی تھی مگر..... زویا کے چہرے پر مذاق کا شائبہ تک نہ تھا صرف سنجیدگی تھی اور خوار تھا۔

"کیا کہا تم نے.....؟" اس نے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔ تب زویا نے اپنی بات دہرائی اور اگلے ہی لمحے وہ اسے پرے جھٹکتیوں دور ہوا گویا ہزاروں پھوؤں نے اسے ایک ساتھ ڈنک مار دیا ہو۔ "کیا ہوا احمر.....؟" زویا نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں زویا.....؟" وہ آم کے تناور پیر پر لٹے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو دھند کے مہلین پردے میں ملخوف تھے۔ "تو اس لئے تو میں نے کہا ہے۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

"زویا! شادی سے پہلے یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی محبت کو آلودہ نہیں کر سکتا۔" اس نے نرمی سے بولتے زویا کے حسین چہرے کو دیکھا تھا۔

"مگر..... ہماری شادی ممکن نہیں احمر، میرے پایا کبھی اس کے لئے نہیں مائیں گے اور ویسے بھی میرا رشتہ تو میرے کزن زہیر کے ساتھ طے ہو چکا ہے۔" اس نے بڑے آرام سے دم پھوڑا۔

"م..... مگر زویا! تم تو مجھ سے محبت کرتی ہونا!" وہ بمشکل بول پاتا تھا۔

"ہاں..... اسی لئے تو تمہیں پانا چاہتی ہوں یوں احمر مجھے جتنے لوگوں سے محبت ہوئی اور جتنے بھی لوگ

میری زندگی میں آئے مجھے لگتا ہے کہ تم ان سب سے زیادہ پر جوش ثابت ہو گے۔" اس کا معنی خیر لہجہ احمر کی شریانوں میں آگ لگا گیا۔

"کتنے لوگ آئے ہیں تمہاری زندگی میں.....؟"

احمر کے لہجے میں غصے کے سوا کچھ نہ تھا۔

"یاد نہیں..... اس وقت تو صرف تم یاد ہو۔" اس نے احمر کا ہاتھ تھامنا چاہے احمر نے جھٹک کر چھڑا لیا۔

"مجھے نہیں پتہ تھا زویا کہ تم اس قدر گھٹیا لڑکی ہو اور میں اپنے بے لوث جذبات سے تم پر لانا تار ہا تم پر؟" پچھتاوا محض اس سے سرخ کیا۔

"آئی کاٹٹ پلیٹ اسٹ زویا آئی کاٹٹ پلیٹ....."

"اس نے ایک جلتی، آخری نگاہ زویا پر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا اپنی روفی کر لاتی محبت کو جہاں اس نے اپنے ہاتھوں سے کل کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اور پھر اگلے چند دنوں میں اس نے زویا اور میر کو تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آتے دیکھا تھا۔

اور پھر..... اور پھر ایک دن اس نے زویا کو میز کے فلیٹ سے نکلے دیکھا اس کے بے ترتیب بال آنکھوں میں چھایا ہوا شمار اور چال کی ہلکی سی لڑکھاہٹ اسے سب سمجھا گئی تب اس لمحے اس نے خود سے نفرت محسوس کی تھی کہ اس نے اپنے خالص جذبات اس لڑکی پر لائے جو عزت بھری ایک نگاہ کی بھی حق دار نہ تھی زویا نے بھی اسے ٹھنک کر رکھتے دیکھ لیا اور کمال ڈھٹائی سے اس کے پاس چلی آئی تھی۔

"میری آفر ابھی بھی برقرار ہے احمر....." اس کی آواز میں نشہ سا تھا۔ احمر کے لب سختی سے سمجھ گئے اور پھر جب وہ کھلے توان میں سے آواز نہیں

پھنکارا برآمد ہوئی تھی۔

"کاش اتم....." اس قابل ہوتیں تو میں تم پر تم کوک دیتا۔ لیکن افسوس، کہ تم تم کوک کے بھی قابل نہیں ہو۔" وہ ایک جھٹکے سے پلٹ گیا اور پھر وہاں سے اپنے گاؤں واپس چلا آیا تھا اس نے اپنے تعلیمی سلسلے کو بھی

خبر باد کہہ دیا تھا وہ انکو بتا تھا اس کے والد ضیاء الدین کافی عرصہ قبل عدم آباد سدھارے تھے اس نے واپس آ کر ان کی چھوڑی ہوئی زمین سنبھال لی حالانکہ پہلے وہ اس کام سے چڑتا تھا سارہ کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر جو چراغ جل اٹھے تھے وہ ان سے چڑتا تھا اسے ہر لڑکی مویا جیسی لگتی تھی اور اسے محبت سے نفرت ہو گئی تھی مگر..... اب..... اب وہ خود اسیر محبت ہو چلا تھا اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ زویا تو اسے پسند تھی جو شخص آپ کی محبت کا دم بھرتا ہونہ چاہتے ہوئے بھی وہ آپ کو اچھا لگنے لگتا ہے اور چونکہ زویا اسے بے حد اہمیت دیتی سو اس لئے وہ بھی اسے پسند کرنے لگا تھا اور پھر..... اس کی سوچوں کے تسلسل کو کلی میں سے گزرتے ارشد نے توڑا اس کے کمرے کی کھڑکی کی گلی میں مکی تھی۔

”اگر اپنے سارہ نہیں آئی تمہاری طرف؟“ ان کا لہجہ خفیف تھا اور وہ دیوار پر ہاتھ رکھے ہاتھ رہے تھے۔

”سارہ.....؟“ نہیں تو..... کیوں خیریت.....؟“ اس نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ ڈاکٹر کا پتہ کرنے لگی تھی، میں نے کہا تھا کہ احریا واصف کو بلاؤ وہ کہہ گئی تھی کہ ڈاکٹر کا پتہ کر کے واصف کو بلا لاتی ہوں تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا ہے..... تم..... تم اس کا پتہ تو کرو۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“ ان کی آواز بھرا گئی احمر کا گھر چونکہ قریب تھا اسی لئے وہ سیدھے اسی کے پاس چلے آئے تھے۔

”آ..... آپ اندر آئیں میں ابھی پتہ کرتا ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔ انہیں اندر آئی کے پاس بیٹھا کر اس نے ڈاکٹر کے گھر کا رخ کیا الماس نے اسے بتایا کہ سارہ قریباً گھنٹہ پہلے آئی تھی اور شفقت کا پوچھ کر فوراً ہی چلی گئی تھی وہ فوراً ہی پلانا تھا واصف کے دروازے پر وہ تب تک ہاتھ بجاتا رہا جب تک دروازہ نہ کھلا۔ بارش ابھی جاری تھی مگر اس کی شدت میں میں قدرے کمی واقع ہوئی تھی۔ دروازہ کھولنے والا واصف ہی تھا۔ وہ بارش سے بچنے کے لئے

چھتری لے آیا تھا۔

اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔ چپکلی بجلی میں اسے نے واصف کے چہرے کا بدلتا رنگ بغور دیکھا تھا۔

”مجھے کیا پتہ.....؟“ اگلے ہی لمحے وہ خوا کو سنبھال چکا تھا۔ اس کے شانے اچکانے پر احمر کو پیش کی لہر چھو گئی۔

”وہ تمہارے گھر تمہیں بلانے آئی تھی، کہاں ہے وہ.....؟“ اس نے بشکل خود کو کپڑو کیا تھا۔

”میں کافی دیر سے سو رہا تھا وہ نہیں آئی..... اکی اور احمر بھائی تو ایک شادی میں گئے ہوئے ہیں میں آ گیا تھا اس لئے سو گیا اور.....“ اس کی روانی سے چلتی زبان کو بریک لگا یا۔

”سارہ بیٹی کو تم خود اندر لے جا رہے تھے۔ میں اپنے بیٹے کی ضد پر اس کے لئے سیب توڑنے جا رہا تھا۔“ اس نے دائیں جانب اشارہ کیا جہاں سیبوں کے چند درخت تھے۔

”تب میں نے سارہ کو تمہارا دروازہ کھٹکھٹانے دیکھا تو رک گیا کہ خیریت ہوا اس موسم میں وہ اکیلی پھر چھوڑی دیر بعد تم آئے تو وہ تمہارے ساتھ اندر چلی گئی آواز تو مجھے نہیں آئی مگر میں نے سوچا کہ کوئی کام ہوگا۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

ابھی پھر وہ اپنے کاشی کے لئے مزید سب توڑنے کے لئے جا رہا تھا کہ کاشی کو بخار تھا اور وہ چڑھا ہو رہا تھا۔

”ہاں..... وہ.....“ واصف کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”وہ آئی تو تھی مگر فوراً ہی چلی گئی تھی۔“ احمر نے ضبط کی حد جس میں تک تھی اس کا دایاں ہاتھ واصف کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا واصف لڑکھڑا گیا احمر سختی سے اس کا گریبان جکڑے پھینکا۔

”کہاں ہے وہ.....؟“ مجھے نہیں پتہ چھوڑو مجھے۔“ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

”واصف! سیدی طرح بتا دو سارہ کہاں ہے۔“

ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گا کہاں ہے وہ..... کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟“ اس نے واصف کا گلا دیوچ لیا۔ اس پر دیوگی کا عالم جاری تھا واصف سانس لینے کی کوشش میں تڑپ رہا تھا لطیف نے اس کے ہاتھوں سے واصف کی گردن چھڑائی تھی۔

”کہاں ہے وہ.....؟“ وہ آگ آگ لگتی لگا ہوں سے بری طرح ہانپتے واصف کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ..... وہ..... اس جنگل..... کی طرف گئی تھی۔“ واصف نے اشارے سے بتایا تو وہ ایک بھر پور گھونسے مار کر جنگل کی جانب لپکا اس لمحے بادلوں کا سینہ شق ہوا اور ایک کوندا سا لپکا بادل پھر شدت سے برس رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

خاموشی نے تاحد نگاہ پر پھیلا رکھے تھے۔ سناٹا گونم بدھ کے سے انداز میں آگئی باقی مارے چپ کی بگل مارے بیٹھا تھا سکوت وشت زدہ سانسیں سانسیں کرتا پھرتا تھا اس سانسیں سانسیں میں قدموں کی چاپ ابھری جو خاموشی اور سکوت کو بے حد ناگوار گزری گونم بدھ کے سے انداز میں ”خاموشی“ بیٹھا سناٹا دھیرے سے سر جھکا گیا۔ تاہم اس کی گدلی آنکھوں میں بیڑاری کی لہر کر دیکھیں لگنے لگی۔ شران غنی کے قدم سکوت کے وجود کو روندتے جا رہے تھے دفعتاً وہ ٹھک کر رکا۔ ایک شخص اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا گویا زمین سے پھوٹ پڑا ہو۔ اس کے بال شانوں سے نیچے لٹک رہے تھے اور ان کی رنگت براؤن تھی۔ بڑی بڑی براؤن آنکھیں کس قدر سرخ تھیں کھڑی ناک تختی سے نیچے ہونٹ، چوڑا چمکا سینا اور کسرتی گٹھا ہوا جسم..... وہ محض لنگوٹ میں لباس تھا شران نے کٹر آکر گزرتا چاہا مگر وہ بول اٹھا۔

”میری بات سنئے۔“ شران رک کر اس کو سوالیہ لگا ہوں سے دیکھنے لگا۔

”آگے مت جاؤ.....“

”کیوں.....؟“ شران نے ہمنویں اچکا کیں۔

”کیونکہ اگر تم آگے گئے تو مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔“ اس کا لہجہ کھر درا تھا۔

”مجبوری ہے دوست! مجھے شیا تک قبیلے کو ہر حال میں تلاش کرنا ہے۔“ شران پھیکے انداز میں مسکرایا۔

”شیا تک قبیلہ.....؟“ اس شخص نے حیرت سے ہمنویں سیکڑیں، پھر تو تم بہت جلد مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے سسر۔ سیدھے چلتے جاؤ جلد ہی منزل تک پہنچ جاؤ گے۔“ وہ طنزیہ لب و لہجے میں بولتا آگے بڑھ گیا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وہ چلتا رہا پھر ایک درخت سے ٹیک لگا کر سناٹے لگا اس نے بیٹھ کر ہاتھ میں موجود بوتل میں سے پانی پیا اور پھر سرخنے سے ٹکا کر آنکھیں موند گیا۔ اس کی آنکھوں میں ماضی گردش کرنے لگا۔

ماضی..... جہاں خوشیاں تھیں..... ماضی..... جہاں بے گفتری تھی..... ماضی..... جہاں اس کے اپنے تھے امی بابا کالا ڈاؤر پیرا تھا۔ رومیہ کی محبت اور ہارومان کی دوستی اور خلوص..... وقت کس قدر بدل گیا تھا اس کے لئے اس کی آنکھوں میں ماہ شب کا سا کرت وجود لہرایا تو دل میں بیڑے سے کھب گئی اس نے صدق دل سے اللہ سے مدد مانگی..... صرف اور صرف وہی ہے جو وہاں بھی ہماری مدد کرتا ہے جہاں آکر سب کے اختیارات ختم ہو جاتے ہیں صرف اللہ ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ ”کن“ کہے تو..... ”فیکون“ ہو جاتا ہے ارد گرد ابھرنے والی بے شکم سی آوازوں پر اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اس کی نظروں نے جو دیکھا بے حد حیرت انگیز منظر تھا اس منظر نے شران غنی کو چونکا دیا تھا اور بڑی بری طرح چونکا پٹا تھا۔

☆.....☆.....☆

شدت سے برسی بارش نے ہر طرف پانی کی چادر سی تان رکھی تھی، مونی مونی بوندیں تا بڑ تو بڑ برس رہی تھیں گاہے بگاہے بجلی چمک جاتی تھی اور جب بجلی چمکتی تھی تو اس کی روشنی میں برسی بوندیں گویا ستاروں کا روپ دھار جاتیں مگر احمر کو ان چمکتے ستاروں سے قطعاً



سے بیگانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اس کے ارد گرد چند لوگ ہاتھوں میں تلوار نما ہتھیار لئے کھڑے تھے انہوں نے اسی گونگے میں لے رکھا تھا ان کے جسم سخت گھٹے ہوئے تھے اردوہ چوڑے چوڑے ہتھکڑوں کا مختصر سلاسا پہنے ہوئے تھے۔ لیکن شران کے چونکنے کی وجہ بہر حال ان کی موجودگی یا ان کے ہتھیار نہیں رہے تھے اس کے چونکنے کی وجہ ان کے چہرے تھے ان کی رنگت جھلکی ہوئی اور نفوش کرخت تھی۔ اور چہروں پر لکیروں کا جال سا بچھا تھا۔ عین اسی طرح جیسے ہاتھوں کی تھیلیوں پر لکیریں ہوتی ہیں۔ ان کے چہروں پر بھی ٹھیک ویسی لکیریں تھیں۔ ٹیڑھی میڑھی..... کچھ لمبی اور کچھ مختصر..... وہ لکیریں ان کے چہروں پر کسی کٹری کے جال کی طرح پھیلی تھیں۔ ناک پر آنکھوں پر گالوں پر..... غرض ایک کان سے لے کر دوسرے کان تک اور پیشانی سے لے کر گھوڑی تک..... ”شیا جگ قبیلے کے کسی بھی فرد کا دیکھنا تمہیں چونکا دے گا۔“ اس کی ساعت میں اجول کی آواز گونجی اور ذہن میں بجلی کا گوند سا لپک گیا۔

”ہمارے ساتھ چلو.....“ ان میں سے ایک غریبا۔ اس عورت نے اسے شیا جگ قبیلے کا پتہ تو نہیں بتایا تھا مگر اسے وہ زبان کسی حد تک سکھادی تھی جو اس جزیرے پر بولی جاتی تھی اگرچہ دودن کے قلیل عرصے میں وہ چند جملے ہی بولنا سیکھ پایا تھا البتہ سمجھ نہ سکتا تھا۔ ”اٹھو“ اس شخص نے اپنے ہتھیار کی نوک اس کے بازو میں چھوئی تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے زرنے میں لئے گھٹے درختوں اور بانسوں سے گزرتے دائیں جانب بڑھنے لگا اچانک چند بھیڑیے لپک کر ان کی جانب آئے اور شران پر جھپٹنے کی کوشش کی۔

”دفع ہو جاؤ۔ پہلے یہاں مرے ہوئے تھے.....“ ان میں سے ایک شخص نے بھیڑیوں کو آنکھیں دکھائیں تو وہ مست قدموں سے پلٹ گئے

کوئی دلچسپی نہ تھی اس کی تو جان پر پتی تھی اور جب جان پر پتی ہو تو دلچسپی سے دلچسپ نظر بھی اڑیکٹ نہیں کرتا کیونکہ اس وقت ”کچھ اور“ اڑیکٹ کر رہا ہوتا ہے۔ بلکہ ”کچھ اور“ خود کو ”اڑیکٹ“ کروا رہا ہوتا ہے۔ اس تندر اڑیکٹ، کہ لفظ بھر بھی دھیان اس سے بہت نہیں پاتا۔ بلکہ دھیان کسی اور سمت ”جہنش“ تک نہیں کر پاتا۔ اس کے ساتھ بھی اس وقت یہی معاملہ درپیش تھا۔ اس کے ”دھیان“ کی ”جان“ بھی سارہ میں اٹکی تھی۔ اس کی سوچ کا ارتکا ز بھی صرف اسی پتے کے نوکات حجاب وہ جنگل میں داخل ہوا تو تب بھی بازو زور و شور سے جاری تھی۔ لیکن گھٹے درخت کسی حد تک زمین کا بھاؤ کر رہے تھے۔ اس کے پاس سوائے سیل فون کے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن اس وقت اس کی حالت ایسی تھی کہ اسے سیل فون کا خیال تک نہ تھا کہ وہ روشنی ہی کر سکتا کبھی کبھی بجلی چلاتی ہوئی زمین کی سمت لپکتی تھی اور لفظ بھر کو قرب و جوار روشن ہو جاتے تھے اور پھر اگلے لمحے پھر وہی گھٹا ٹوپ..... اندھی تاریکی چھا جاتی..... وہ آگے بڑھتا رہا۔ بتا رہی تھی اور پھر اس سے اچھے والی جھاڑیوں کی پردہ کئے..... درختوں کے پتوں پر تباہ ٹاڑ پانی برس رہا تھا۔

”سارہ..... سارہ۔“ وہ وقفے وقفے سے آوازیں بھی دے رہا تھا۔ مگر کوئی جواب نہ مل رہا تھا اور پھر اس کی آواز بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں دب سی تھی جاتی تھی ایک بار اسے لگا کہ کوئی بولا ہے جواب اس نے تیزی سے آگے بڑھنا چاہا لیکن اسی لمحے وہ پھسلنا چلا گیا اس جگہ اصل میں گھاس کی بجائے زمین بھر بھی اور اس کا پاؤں سمجھڑ میں جا پڑا تھا وہ منہ کی کوشش بھی نہ کر رہا اس کا سر درخت کے موٹے تنے سے ٹکرایا تھا۔

”دھب“ کی آواز کے ساتھ کرہا پاک اذیت اس کی کھوپڑی میں کوندگی اس نے اٹھنا چاہا مگر..... اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور دردناک تکلیف اس کے سر میں تیزی سے گھوم رہی تھی۔ اس نے آخری آواز بجلی کے چلانے کی سی تھی اور پھر..... وہ ہوش و خرد

شران چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔ بھیڑیے رخصت ہوئے وہ لوگ پھر چل پڑے۔ ظاہر ہے کہ اسے ان لوگوں کی تقلید کرنا تھی ان کا سفر قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد اختتام پذیر ہوا تھا اس دوران وہ قدرے تھکاوٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ سامنے ایک بڑا پرانا تھا اور اس کے آس پاس بھی اس سے کچھ بہت پہاڑ تھے سلسلہ کوہ کافی دور تک چلا گیا تھا۔ سامنے والے پہاڑ میں یکا یک شگاف سا بڑا اور غار کا دہانہ کھل گیا۔ ہتھیار بدست اسے اندر لے گئے غار اندر سے کافی کشادہ تھا کافی آگے جا کر اسے کمرے دکھائی پڑے وہ اسے لئے ایک کمرے میں داخل ہو گئے وہ تنگ رہ گیا کہ کمرے کی آرائش جدید انداز میں کی گئی تھی جہاز کی سائز بیڈ، جس پر سرخ جمل کی بیڈ شیٹ بھی دھاری کے ساتھ قد آور ڈریسنگ ڈیسل تھی سائڈ ٹیبل پر فریوم وغیرہ دھرے تھے ایک جانب ٹیبل صوفہ بڑا تھا جس کے آگے رکھی گلاس ٹیبل پر پتھر کا ترشا ہوا لمبی گردن والا شتر مرغ رکھا تھا۔ اس کے سر میں سورخ تھا اور اس میں خوبصورت جنگلی پھول مہک رہے تھے۔ واز کے پردوں پر ننھے ننھے ہیرے دمک رہے تھے۔

”کون ہو تم.....؟“ ایک آواز نے اسے چونکا دیا وہ ایک نوجوان تھا اس کا قدر دراز تھا رنگت اس کی بھی جھلکی ہوئی تھی اور چہرے پر لکیروں کا جال اس نے بھی چہروں سے ستر پوشی کر رکھی تھی قد لم لباس اور جدید بیڈ روم.....

”اے کون ہو تم.....؟“ اب کے انگریزی میں اس کے عقب سے آواز ابھری تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ بھی نوجوان ہی تھا چہرے پر لکیریں..... تاہم اس کی رنگت ہلکی سا نالی تھی اور نفوش پر کشش تھی۔

”آتم شران غمی فرام پاکستان۔“ نوجوان نے مترجم کے فرائض سرانجام دیے۔

”کیا یہاں آنے سے تمہیں کسی نے روکا نہیں؟ جو تم منہ اٹھا کر موت کے منہ میں داخل ہو گئے؟“ پہلا شخص نیچے صوفے پر بیٹھ گیا اور وہ بولا تو اس کی بات

سانولی رنگت والے نے انگریزی میں دہرای۔ ”روکا تھا مگر..... مجھے اب حیات چاہئے.....“ ورنہ.....

”ورنہ کیا.....؟ تو تم بھی دائمی زندگی کی تلاش میں آئے ہو؟ لیکن مشر! یہاں آنے والے پر اب حیات کے تلاشی کو دائمی زندگی کے بجائے موت ملتی ہے۔ صرف اور صرف موت..... ایسی بھیا تک موت جو کہ اس کی روح کو بھی ہمیشہ تریاقتی رہتی ہے.....“ ان سب کی آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں اور ان خون چھلکائی لگا ہوں میں سفاک تاثر ابھرا آیا تھا۔

”میں اپنے لئے نہیں آیا..... اگر مجھے اب حیات نہ ملتا تو میں..... ماہ شب.....“ وہ بے ربطی سے بولا تھا۔

”اپنی بات کی وضاحت کرو نوجوان۔“ جواب اس نے مختصر الفاظ میں سب کو سنایا۔ مترجم نے بھی اس کی داستان دہرا ڈالی اور سب کے چہرے حیرت کی آماجگاہ بن گئے ان میں سے وہ شخص جسے اس نے کمرے میں دیکھا تھا اور ان سب کے اطوار بتا رہے تھے کہ وہ ان لوگوں کے لئے اہم حیثیت کا حامل ہے اس شخص نے گلاس ٹیبل پر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چند اڑھی ترجمہ لکیریں پھینچیں اور نظر میں ٹیبل کے گلاس پر ہمدایں سب کے سب دم سادھے کھڑے تھے شران کو چھپک آئی تو سب کو اس نے خشکیں لگا ہوں سے دیکھا وہ شخص ایک ہی پوز میں بیٹھا ٹیبل پر نگاہ جمائے رہا کچھ سے بعد وہ اٹھا اور ان کی سمت پلٹا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اس نے اٹھائی انداز میں سر جنبش دی۔

”میں اس قبیلے کا سردار ہوں اور اس قبیلے کے متعلق ہر فیصلہ مجھے ہی کرنا ہوتا ہے سینڈ والا سے بتاؤ کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ اس نے مترجم کو اشارہ کیا تھا۔

لیکن شران نے سینڈ کے بولنے سے قبل ہی اسے بتا دیا کہ وہ ان کی زبان سمجھ رہا ہے سینڈ نے سردار کو بتایا تو وہ کھٹکی انداز میں سر ہلکا کر مزید گویا ہوا۔

”جیسا کہ میں بتا رہا ہوں کہ اس قبیلے کا ہر فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔ ایک چھوٹی سی لے کر انسانی زندگی تک کے متعلق..... اور تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ہم لوگ ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ جوان رہتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں آب حیات پایا جاتا ہے لیکن ہم یہ راز کسی اور کو ہرگز نہیں بتاتے۔ آج تک یہاں جو بھی آیا ہے وہ زندہ واپس نہیں گیا لیکن تم..... تم نہ صرف زندہ واپس جاسکتے ہو، بلکہ آب حیات بھی لے جاسکتے ہو..... لیکن..... اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔ مجھے سفید سانپ کے گلے کا موتی چاہئے۔“ اس نے چپ کر کے شمران کے کھمبیر تاثرات کو بغور جانچا اور پھر قدرے توقف سے گویا ہوا۔

”لیکن میں یہ بتا دوں کہ سفید سانپ کو حاصل کرنا نہایت ہی کٹھن ہے۔ سانپوں کے پاس سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں آیا بلکہ واپس آنا تو درد کی بات ہے وہاں کوئی پہنچ ہی نہیں پایا تم اچھی طرح سوچ لو۔ ہمارے پاس پراسرار طاقتیں ہیں لیکن کسی میں ہمت نہیں ہے وہاں جانے کی۔“ اس کی سوالیہ نگاہیں شمران کے چہرے پر جم گئیں۔

”میں تمہاری شرط پوری کروں گا لیکن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پہلے مجھے آب حیات دے دو اور اپنے کسی شخص کو میرے ساتھ بھیج دو..... میں بعد میں آ کر تمہاری شرط پوری کر دوں۔“ مینڈو نے اس کی خواہش و ہوائی تو سردار کے تاثرات پھر پلے ہو گئے اور آنکھوں میں عجیب سفاکی در آئی۔

”اس صورت میں تم آب حیات تو کیا، اپنی زندگی بھی نہیں پاسکو گے۔“

”زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کی مرضی کے بغیر کوئی سانس بھی نہیں لے سکتا بہر حال میں تمہاری شرط ماننے کے لئے تیار ہوں تم مجھے بتا دو کہ مجھے سفید سانپ کہاں ملیں گے؟“

”مینڈو! اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اسے سانپوں کی وادی کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ کر دو

اور کھانے کے علاوہ بھی یہ جو چاہے دے دیتا۔“ اس نے اشارے سے انہیں جانے کا کہا تو سب ہی فوراً ہارنگل گئے۔ مینڈو اسے ساتھ لئے ایک کمرے میں چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

اس کی سماعت میں چڑیوں کی چھچھاہٹ نے راستہ بنایا تھا اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں درختوں کے پتوں سے چھن کر آتی دھوپ کی سنہری لکیریں اکا دکا بکھری تھیں وہ جس جگہ لیٹا تھا وہاں ابھی بھی مٹی گیلی تھی اور گرد البتہ گھاس کے سرے خشک ہو چکے تھے جبکہ ان کی جڑیں ابھی نم تھیں وہ کچھ درغائب و داعی کی کیفیت میں لیٹا رہا پھر سارہ کا خیال آتے ہی اٹھ گیا۔ اس نے اپنے سیاہ شراؤزر پر بھی کچھ جو خشک ہو چلی تھی، دائیں ہاتھ سے جھاڑی اور گھنے درختوں کو چرتا آگے بڑھنے لگا۔ وہ وقفہ بہ وقفہ سارہ کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ مگر جواباً خاموشی تھی کھمبیر خاموشی..... وہ کافی دیر تک جنگل میں بھٹکتا رہا..... پھر اس کی نگاہ نے ایک خشکی جادو پوری کو چھو پہنچنے اینٹوں کی دیوار پر جگہ کی البتہ اس کی ٹانگیں ابھی بھی زمین میں گڑی تھیں۔ وسیع اساطے خالی پڑا تھا مگر ایک جانب ایک کٹھری موجود تھی اس کی دیواروں میں درازیں پڑ چکی تھیں جبکہ دروازے نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہ تھی اس کے قدم بلا ارادہ ہی کٹھری کی سمت اٹھنے لگی اندر چند ایک لکڑیاں پڑی تھیں لکڑیوں کو کھن لگا تھا اور ان کا وجود مٹی مٹی ہو رہا تھا وہ پلٹ کر جانے لگا۔ مگر اس کے قدم ختم گئے کٹھری کی دیوار کے ساتھ کوئی چیز چپکی تھی اس نے پلٹ کر وہ چیز اٹھا لی گولڈ کے اس جگر جگر کرتے بریسلٹ کو دیکھ کر اس کا دل ٹپکی میں آ گیا وہ بریسلٹ سارہ کا تھا وہ واحد زیو رجوہ بھی کھار پونتی تھی اس کی بے قرار نظریں کٹھری کی چھت اور دیواروں کو ٹٹولنے لگیں۔

”سارہ.....؟“ وہ ہلق کے بل چلا یا وہ تیزی سے باہر نکلا اور گرد و پیش چھاننے لگا۔ لیکن سارہ ہونی تو ملتی دھنکا ایک خرگوش اس کے سامنے آ گیا اس کے گلے میں

کی زنجیر سے خشک سرخ پٹہ بندھا تھا اس خرگوش کا ل کان خون میں بیجا ہوا تھا وہ آگے بڑھا اور جھک کر دیکھنے لگا خرگوش کے کان کی لوزخمی تھی خرگوش اچانک پر جھپٹ کر حملہ آور ہوا حملہ چونکہ غیر متوقع تھا اس آخر لڑکھڑا کر پیچھے گرا آخری احساس گردن میں لپٹنے اترنے کا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے چلتے چلتے ’خہ بھر کو رک کر آسمان کی ب نگاہ ڈالی اللہ سے مدد مانگی اور پھر چلتے لگا۔ مینڈو کے ساتھ تھا۔

”تمہیں ڈرنیں لگ رہا.....؟“ وہ متعجب تھا ان کے چہرے پر چھائے اطمینان کو دیکھ کر۔

”نہیں..... لیکن یاد ایک بات تو بتاؤ۔“ شمران چلتے چلتے ایک درخت کا پتہ توڑا تھا۔

”کیا.....؟“ مینڈو نے اس کی آنکھوں میں لگا۔

”تم لوگ تو کبھی مرنے نہیں، پھر خود کیوں نہیں وہ حاصل کر لیتے.....؟“

ہم لوگ طبعی موت نہیں مرتے حادثاتی موت سے ہیں یہی وجہ ہے ہمارے سردار انکا کو جن لوگوں پر خاش ہوتی ہے اسے ختم کر دیتا ہے اسی سانپوالی پر ہی وہ سینکڑوں لوگوں کو کھینچ چکا ہے جن میں سے بھی شخص واپس نہیں آیا اور اب مجھے بھی اس نے لئے تمہارے ساتھ بھیجا ہے۔“ مینڈو کے لہجے میں کی چاشنی تھی شمران ٹھنک کر رکھا۔

”تو تم لوگ انکار کیوں نہیں کرتے.....؟“

”کوئی سردار کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو اسے قبیلے سے ہٹ کر کے سولی پڑھا دیا جاتا ہے اور سولی سے پہلے ہر سزا دی جاتی ہیں وہ اس قدر اذیت ناک ہوتی کہ انسان موت کو ترجیح دیتا ہے۔“ مینڈو کی بھوری ہوں میں کرب کی پرچھائیاں ابھرا گئیں۔

”تو تم لوگ یہ قبیلہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے.....؟“

”نہیں چھوڑ سکتے۔“ مینڈو نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں چھوڑ سکتے تمہیں اگر تمہارا مذہب چھوڑنے کا کہا جائے تو چھوڑ دو گے؟“

”کسی بھی قیمت پر نہیں۔“ شمران کا لہجہ اٹل تھا اور جواب بے ساختہ

”ایسا ہی ہمارے لئے بھی سمجھ لو لیکن اس کے باوجود کچھ لوگوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر ان کا انجام..... بہت بہت بھیناک تھا ان لوگوں میں میرا ایک دوست کا تھا اور اس کی محبوبہ کا را بھی تھی۔“ مینڈو نے کرب سے پلکیں میچیں اور جب کھولیں تو ان کی دہلیزوں پر نفی تھی۔

”کانٹھا نے کیوں بغاوت کی تھی۔“ شمران درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مینڈو بھی گھاس پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا اور غلا میں گھورتے ہوئے گویا ہوا۔

”یہ ڈیڑھ سو برس قبل کی بات ہے کانٹھا اور میں بہت اچھے دوست تھے وہ بہت بہادر تھا دوسرے قبیلوں سے ہر مقابلہ وہی جیتتا تھا۔“ مینڈو کھوئے کھوئے سے انداز میں ماضی کا ورق ورق پلٹنے لگا۔

”کانٹھا ایک بہترین لڑاکا تھا۔ اس کے باپ شہسئی کو دیوتا پر قربان کر دیا گیا تھا اور ماں کو سردار لگانے اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ ان کے دیوتا کو قربانی دینے کی یہ رسم صدیوں سے رائج چلی آ رہی ہے مہا پجاری جس شخص کے نام لے کر دیوتا نے اس کی قربانی طلب کی ہے اسے بلا توقف قربان کر دیا جاتا ہے، بہر حال کچھ عرصے بعد جب انکا کا دل کانٹھا کی ماں سے بھر گیا تو اسے آزاد کر دیا گیا۔ کارا کانٹھا کی مگھیر تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے ایک دن جب موسم ابرا کو لو تھا وہ دونوں چہل قدمی کر رہے تھے انکا شکار سے واپس آ رہا تھا کہ اس کی ناپاک نگاہ کارا پر پڑ گئی اس کا ملکوتی حسن اس کی آنکھیں خیرہ کر گیا۔ وہ بلاشبہ اس کے قبیلے کی خوب صورت ترین لڑکی تھی اور انکا کو حیرت تھی کہ وہ اب تک کہاں چھپی رہی تھی؟ اس کی



نظروں سے چھپتی ہوں نے کارا کے اندر بھی خطرے کی گھنٹی بجادی تھی ان کے ہاں روایت تھی وہ لڑکی جو سردار کو پسند آ جاتی تھی وہ پہلے سردار کے تصرف میں آتی تھی اور بعد میں جب اس کا دل بھر جاتا تب اسے چھوڑ دیا جاتا کارا نے تو کارا کی ہوس بھانپ لی تھی تاہم وہ زیادہ پریشان نہیں ہوئی بلاشبہ انکا کہ اس کی فطرت کو چاقی تھی مگر وہ ”خود“ کو اپنی فطرت کو اور کا تھا سے اپنی محبت کو بھی بخوبی جانتی تھی۔ اس سے اگلے دن انکا کے حکم پر قبیلے کے چند ایک گھروں کو چھوڑ کر باقی سب کے شیرخوار بچوں کو ہلاک کر دیا گیا ایسا انہیں اس لئے کرنا پڑا تھا کہ آبادی زیادہ نہ ہو جائے آبادی بڑھنے کی صورت میں ضروریات بھی بڑھیں اور یوں وہ دنیا کی نظروں میں آجائے۔ جو کہ ان کی روایت اور فطرت کے متضاد ہوتا۔ یوں انہیں آبادی کم کرنے کے لئے اس قسم کے اقدامات کرنا پڑتے تھے۔ کبھی شیرخوار بچوں کو قتل کر دیا جاتا، کبھی لوگوں کو قریانی کے نام پر دیوتا کی بھیبت چڑھا دیا جاتا تو کبھی سرکشی کے نام پر اذیتیں دے دے کر مار دیا جاتا قتل ہونے والے بچوں میں کارا کا تھا بھائی بھی شامل تھا۔ اس کے اس اقدام سے کارا کے دل میں انکا کی نفرت گہری ہوئی تھی۔

”انکا کے ایسا پر مہیا بچاری نے کا تھا کہ نام قریانی کے لئے پیش کر دیا تھا کارا کو تو وہ مضطرب ہو گئی۔“

”کانھا اتم بھاگ جاؤ۔“ نہیں، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن یہ لوگ تمہیں مار دیں گے۔“

”تم جانتی ہو میرے جانے کے بعد یہ لوگ تمہارا کیا حشر کریں گے۔“ اس نے نفی سے سر جھٹکا۔

”تب؟“ کارا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”دونوں چلتے ہیں فوج مئے تو ٹھیک ورنہ۔۔۔۔۔“

کا تھا نے بات ادھوری چھوڑ کر شانے اچکا۔

کارا متفق ہو گئی ان دونوں کے لئے دیے بھی یہاں موت تھی وہ زندگی بچانے کی کم از کم ایک کوشش

تو کر ہی سکتے تھے اس سے زیادہ ان کے بس میں کھ تھا بھی نہیں۔

دو دن بعد ہی انہیں پکڑ لیا گیا اور۔۔۔۔۔ انہیں دیکھتے انکاروں پر نیچے پاؤں چلا گیا انکاروں کی ایک لمبی قطار بھادی گئی تھی جو چوڑائی میں ایک گز کے قریب رہی ہوگی چند لوگ دہکتی سلاخیں لئے ان کے دائیں بائیں چل رہے تھے جب کا تھا اور کارا لڑکھڑا کر گر جاتے یا نیچے زمین پر اتر جاتے تو وہ لوگ دہکتی سلاخیں انہیں چھو کر آگے بڑھنے پر مجبور کرتے بلا خردہ دونوں بے ہوش ہو گئے اس کے بعد انہیں طرح طرح کی اذیتیں دے کر مار دیا گیا ان کے گرد آگ کا لالہ جا، کر انہیں بھجوں کر دیا گیا اس آگ کی پیش ان نیم جان جسموں کو لہجہ لہجہ جلا رہی تھی وہ بے حد حال انداز میں منتیں کر کے موت مانگ رہے تھے مگر موت تھی کہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی دو دن تک وہ موت کے لئے لہجہ لہجہ مرتے رہے، تب جا کر موت آئی تھی۔ اور پھر ان کے بے جان جسموں کو جن سے زندگی کی آخری رقیق تک نیچڑ لی گئی تھی انکاروں پر بھونکا جانے لگا ان سفاک لوگوں نے انہیں زندگی میں بھی جلا دیا تھا اور مرنے کے بعد بھی جلا رہے تھے شاید قبیلے کے افراد انکا کے حکم پر ان کے مردہ بنے ہوئے جسموں پر بھوکے درندوں کی طرہ ٹوٹ پڑے تھے۔

”اور تم چپ چاپ انہیں مرتے ہوئے دیکھتے رہے؟ تمہیں ان کی مدد تو کرنی چاہیے تھی۔“ شران نے بے یقینی سے اسے گھورا۔

”میرے باپ نے مجھے قید کر دیا تھا۔ اسے رقتہ کہ میں نے ایسی کوئی کوشش کی تو خود بھی مارا جاؤں گا میں نے بہت کوشش کی تھی مگر۔۔۔۔۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہونٹ کچلے۔

”انکا تمہیں کیوں مارنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔؟“

”اسے پتہ ہے کہ میرے دل میں اس کے۔۔۔۔۔ بے حد نفرت ہے، اس لئے اگر میں یہاں سے نہ، واپس چلا گیا تو وہ کوئی اور بہانہ بنا کر مجھے مرواد

گا۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا ان کے سچ خاموشی آن ٹھہری۔

ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی چند لمبے یونی خاموشی سے سرک گئے پھر اس خاموشی کو سنڈو نے توڑا تھا۔

وہ اٹھا تو شران نے اس کی تھلید کی تھی۔

☆.....☆.....☆

سورج نے اپنا لہولہاں چہرہ دھیرے دھیرے بلند کیا جوتا کی بہم کر بھاگ لگی خاموشی ایسی گہری تھی کہ دل کی دھڑکن تک واضح سنائی دیتی تھی اگرچہ اس سے پہلے بھی جنگل میں خاموشی ہی ہوتی تھی مگر تب کم از کم پرندوں کی آوازیں گاہے بگاہے آتی رہتی تھیں مگر اس صبح میں کسی پرندے تو کیا کسی قلی کا بھی نام و نشان تک نہ تھا۔ زمین بھر تھی تاحد نگاہ جنگل میدان تھا۔ بس اکا دکا درخت تھے وہ بھی کچھ ایسے کہ انہیں دیکھ کر ویرانی کا مزید احساس ہوتا تھا۔ ان کے تنے اور ٹیڑھی میڑھی شاخیں سیاہ ہو چکی تھیں ان کا وجود پتوں سے سرکاری تھیں اور شاید پتوں کا ”بھڑ“ ہی درختوں کو سوگ کا رنگ، یعنی سیاہ رنگ۔۔۔۔۔ موت کا رنگ۔۔۔۔۔ یعنی سیاہ رنگ دے گیا تھا۔ درخت گویا اپنے اجڑنے پر، اپنی بربادی پر، اپنی موت پر ماتم کناں تھے۔۔۔۔۔ بازو پھیلائے ”بین“ کر رہے تھے۔ زمین کے نیم جان وجود پر پڑی درازیں اس نفی کی گواہ تھیں ہر چیز یہ موت کا گمان ہوتا تھا ہر شے مردہ محسوس ہوتی تھی زمین، درخت اور سانے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں۔۔۔۔۔ سب مردہ تھیں گویا۔۔۔۔۔ دفن شدہ مضطرب نیم جان پڑ گئی۔

وہ پہاڑیوں سے اتر کر نیچے آتے لقا تھا اسانپ تھے وہ تیزی سے اپنے جسم کو بل دیتے بہہ سکتے ہوئے ان کی ہی جانب آ رہے تھے۔ ان کی رفتار جیت اٹکی تھی وہ ان کی دو شاخہ تکی زباں میں باہر لگی پڑی تھیں اور جب وہ پھٹکائیں مارتے تھے تو نیلے رنگ کی پھوار دور تک اڑتی تھی وہ ان کے عین مقابل آگئے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ حملہ کرتے، اچانک بین کی سحر انگیز آواز اُبھرے گی۔

سانپ بے چین دکھائی دینے لگے شران اور سینڈو نے بے اختیار آواز کے ماخذ کو دیکھا وہ ایک نوجوان لڑکا تھا لباس نے بھی پتوں کا ہی پہن رکھا تھا لمبے بے ترتیب بال شانوں سے نیچے بکھرے تھے اور اس کی دائیں کلائی سے عجیب و غریب موتیوں کا کڑا لپٹا تھا پتھر کے ان موتیوں سے شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ گولائی کی شکل میں بین کے دہانے سے نکلے تھے اور گالوں میں ہوا بھری تھی اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ خود بھی گویا مسکور ہو کر ایک ٹرانس کے عالم میں بین بجا رہا تھا۔

سانپ تیزی سے بل کھاتے اس کی جانب بھینچے چلے گئے جیسے لوہا تنابیس کی جانب بے اختیار نہ کھینچا جاتا ہے جیسے ”زندگی“ موت کی جانب سرکشی چلی جاتی ہے کچھ ہی دیر میں میدان سانپوں سے بھر گیا وہاں ہر نسل اور ہر رنگ کے سانپ تھے۔ سیاہ، سرخ، سنہرے، سرکشی، بھورے، دھاری دار، چستکیرے، وہ سب کے سب بین کی لے پہ چھوم رہے تھے رقصاں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر گرتے تھے لیکن کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا بلکہ کسی کو ”اپنا“ ہوش نہ تھا ان کے رقص میں اب اضطراب شامل ہو رہا تھا ان کی رگوں میں انکارے دھک رہے تھے گویا۔۔۔۔۔ وہ اب ”ناچ“ رہے تھے ”تڑپ“ رہے تھے۔

آگ پر لوٹ رہے تھے لڑکے کی سنہری پیشانی چہرے اور گردن پر پسینے کے موتی ابھرائے تھے پرسکون وہ بھی نہ تھا اگر سانپ تڑپ رہے تھے تو وہ بھی ہانپ رہا تھا سانپوں میں موت کا رقص اب فقط عروج کو پہنچ چکا تھا اب اگر وہ چاہے بھی تورک نہ سکتے تھے اور رک تو وہ ابتدا میں بھی نہ سکے تھے بین کی سحر انگیز آواز دور دور تک بکھر رہی تھی۔ نفا سحر زدہ سن رہی تھی شران اور سینڈو آواز کے ظلم میں جکڑے سانس تک لینا بھول گئے تھے گویا۔۔۔۔۔ کائنات کی نبض تھم گئی تھی ہوا ساکت رہ گئی تھی سپرے کے جنوں میں بدترج۔۔۔۔۔ لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوا جاتا تھا۔ گردن اور پیشانی کی رگیں نمایاں ہو چکی



تھیں یلکھت وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا بین اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گئی ماحول پر طاری سحر بل بھر میں ترخ کر کے ٹوٹا تھا سپیرے کا پورا وجود پسینے میں شرالو تھا اور وہ بے جان انداز میں زمین پر گر پڑا تھا اس کا سانس دھونکی کی مانند جل رہا تھا اسے سانس لینے میں بھی بے حد دشواری کا سامنا تھا۔ اسے بے حد دقت ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ اس کی سانس کی ڈور ٹوٹنے والی ہے اس کی ساری توانائیاں نیچے ڈر کر رہ گئی تھیں اور سانپوں کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ وہ بھی اب بے دم ہو کر پھنکار رہے تھے۔ ان کی دم اور جسم دھیرے دھیرے حرکت کر رہے تھے شران دھیرے دھیرے چلا وہاں جا رہا۔ سپیرا آنکھیں موندے نیم جان حالت میں پڑا تھا۔

”کون ہوتا؟“ سپیرے نے یکدم آنکھیں کھول دیں۔ اس کی گہری سبز آنکھوں میں ہلا کی چمک تھی ایک سفاک چمک شران کی سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت در آئی۔

”کون ہوتا؟“ سپیرے نے اپنا سوال دہرایا اور جتنی نظروں سے پھر اسے دیکھا۔

”میں کیا بتاؤں میری حیثیت تو خاک کے اک ذرے سے بھی کمتر ہے بہر حال میں اب ذوالجلال کا ایک حقیر بندہ ہوں اور اللہ برتر کے محبوب کا امتی..... یہی میرا تعارف ہے یہی میری حقیقت ہے، یہی میرا اچانک ہے اور اسی پر مجھے فخر ہے۔“ شران کے لہجے سے جھلکتی نجاست وہ کون سی کیفیت تھی جو سپیرے کے ساتھ ساتھ سینڈ وکھی متاثر کر گئی۔ نوجوان سپیرے کی گہری سبز کھوئی کھوئی سی آنکھیں شران کو کھوہو رہی ہیں پھر وہ گویا ہوا۔

”یہاں کیوں آئے ہو.....؟ اگر میں انہیں اپنے پاس نہ بلاتا تو اس وقت یہاں تمہاری ہڈیاں بھی نہ ہوتیں۔“ سپیرے نے سانپوں کی جانب اشارہ کیا جو مرے مرے انداز میں پڑے تھے ان کی ہانپتی پھنکاریں مدھم سانس میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

”ہم نے آنے سے قبل ایک خاص درخت کے پتے کھائے تھے جن سے زہر اثر نہیں ہوتا۔“ سینڈ نے بتایا۔

”بچوں کی کیا بات..... زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو ہم کو کوئی ذرہ بھر نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اگر وہ چاہے تو ہم اگلا سانس بھی نہ لے سکیں۔ یہ اسی کی قدرت اور اس کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمارے لئے مختلف چیزوں میں شفا بھی ہے۔ خیر..... تم مجھے سفید سانپ کے بارے میں بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ملے گا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے سپیرے کو دیکھا جس کی سبز آنکھیں اس کا سوال سن کر حیرت سے پیالہ ہو گئی تھیں۔

”تم سفید سانپ کا کیا کرو گے؟“ اس کے لہجے میں سرسراہٹ تھی۔ حیرت کی سرسراہٹ۔

”مجھے اس کے حلق کا موتی چاہئے۔“ اب کے دست حیرت نے سپیرے کے پورے وجود کو اپنے گنجانے میں جکڑ لیا۔ اور جب وہ بولا تو اس کے لہجے سے خوف آمیز تعجب مترشح تھا۔

”تم اس کے حلق کا موتی لو گے؟“ اگلے ہی لمحے وہ ہلکھلا کر اس دیا۔

”لوگ مجھے سانپوں کا شہزادہ کہتے ہیں میرا بچپن انہی میں گزرا ہے میرے دادا جوگی تھے۔ لیکن میرے باپ کو دشمنی کی بنا پر ان کے ایک دوست نے قتل کر دیا۔ تب میں چار سال کا تھا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی تب دادا دل برداشتہ ہو کر مجھے انسانی سستی سے دور یہاں لے آئے یہ سانپ میرے دوست ہی نہیں سیوک بھی ہیں لیکن اس کے باوجود میں سفید ناگ سے آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ اس کی دہشت ہی ایسی ہے اور تم.....؟“ ہوا ہلکی دھوپ میں چکرار ہی تھی۔

”مجھے ہر حال میں وہ موتی چاہئے۔“ شران نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

”تم اس لئے اسے عام لے رہے ہو کہ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے جان کنی کی اذیت کو بھیلنے والا ہی

جان سکا ہے جس کی روح نے یہ عذاب بھیلیا ہوا۔ اسے دیکھنے والا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔“

سپیرے کا لہجہ خاصا سرد تھا شران بے تاثر لگا ہوں سے اسے دیکھ گئے۔

”میں مانتا ہوں کہ اس موتی میں بے انتہا پر اسرار لکھیاں ہیں، اس کا مالک دولت میں کمیٹا ہے لیکن اس کے باوجود..... اس کے باوجود زندگی کا کوئی بدل نہیں۔“ وہ رسائیت سے گویا ہوا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ جیسے زندگی..... اور جیسے اس کے لئے ماہ شب تھی۔ محبت کا بھی کوئی نعم البدل نہیں..... اور اس کے لئے محبت زندگی، اپنی زندگی سے بڑھ کر تھی۔

اس..... تھا وہ لالچی..... لیکن اگر دیکھا جائے تو ہر انسان کی لالچی ہے حتیٰ کہ اللہ کی عبادت بھی جنت کے حصول یا ہر جہنم سے بچنے کے لئے کرتا ہے۔ اسے بھی ماہ شب کی زندگی کا الٹ موت کے منہ میں لے آیا تھا لیکن ایک امت تھی کہ اسے اب موت سے ذرہ بھر بھی خوف نہ رہا تھا اب سے اس کا رشتہ اللہ سے مضبوط ہوا تھا تب سے اسے یقین نصیب ہوا تھا کہ حد نہیں..... کوئی حساب نہیں..... اسے یقین تھا کہ ”اللہ“ سے بڑھ کر اس کا کوئی رخواہ نہیں اور وہی جو ہر چیز پر قادر ہے وہ پر یقین تھا کہ اگر اللہ نہ چاہے تو اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی ہم کو بھولے ہوئے ہیں اس کا نام تک لینا ہمیں یاد نہیں رہتا۔ لیکن کبھی ایسا ہوا ہے کہ وہ ہمیں بھول گیا ہو؟ وہ ہمیں رزق دینا بھول گیا ہو؟ وہ ہمیں زندگی دینا بھول گیا ہو؟ نہیں، ایسا نہیں ہے..... ہمارے گز بھی نہیں ہے اگر ”وہ“ ہمیں بھول جائے، تو ہم سانس لیتا ہی بھول جائیں..... یہ اور بات کہ ماہ شب اب بھی اس کے دل کی کین تھی۔

”میری مامو تو واپس چلے جاؤ۔“ سپیرے کا لہجہ مہاندہ تھا لیکن وہ واپس جانے کے لئے نہیں آیا تھا۔

”تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ملے گا؟“ اس کا لہجہ بڑے کو بار کر گیا کہ اسے کچھ بھی سمجھنا بیکار ہے۔

”ٹھیک ہے اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو تو.....“ سپیرے نے کندھے اچکائے اور قدرے توقف سے گویا ہوا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے جذبہ ترحم سے لبریز نگاہ شران پر ڈالی، ویسی ہی نگاہ جیسی چھائی گھاٹ میں جانے والے کسی شخص پر کوئی بھی نرم دل انسان ڈال سکتا ہے اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ شران اور پھر سینڈ نے بھی اس کی تقلید کی تھی، سانپ اب کلہاڑے تھے ان میں سے چند ایک تیزی سے بل کھاتے شران اور سینڈ کی سمت لپکے سپیرے نے منہ سے ایک پھنکار نکالی سانپ لحد بھر میں بت بن گئے وہ پھر پھنکارا اور انہیں لئے آگے بڑھ گیا سانپ بے حس و حرکت انہیں جا تا دیکھ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

پہلا احساس جھبن کا تھا..... شدید ترین جھبن کا اسے اپنے بازو میں سونیاں اترتی محسوس ہو رہی تھیں اس نے بے ساختہ دائیں ہاتھ سے بائیں بازو پر دھکتی اس شے کو کوچ ڈالا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھا اور دھندلائی نظروں سے اس شے کو دیکھا وہ ایک مکڑی تھی۔ سنہری ٹھلی مکڑی، اس کی تھنی تھنی چمکی آنکھیں احمر کے چہرے پر ہی مرکوز تھیں اس نے مکڑی کو دھیرے سے زمین پر رکھ دیا۔ وہ دھکتی ہوئی غائب ہو گئی وہ اٹھ گیا اور آگے بڑھنے لگا اس کا حلق بری طرح خشک ہو رہا تھا وہ گرد و پیش کو مٹلاشی لگا ہوں سے کھٹک رہا تھا دفعتاً ایک دھماکا ہوا اس کے قدموں تلے زمین بری طرح لڑکھرائی تھی ڈمگرائی تھی لڑی تھی اور قدموں تلے زمین لرزنے کے سبب وہ بھی لڑکھڑایا تھا اس نے بے ساختہ ساتھ موجود درخت کو سہارے کے لئے تھما سنا چاہا اس کی یہ حرکت قطعاً غیر ارادی تھی ٹھیک اسی طرح، جس طرح اس کا لڑکھڑانا غیر ارادی تھا اس کا ہاتھ درخت سے مس ہونے کی دیر تھی کہ درخت گرنا چلا گیا گویا شخص اس کے لمس کے انتظار میں ہو قریب تھا کہ وہ بھی درخت کے ساتھ ہی زمین بوس ہوتا کسی نے اسے نفا میں معلق کر دیا اس نے

آنکھیں پھاڑ کر ارد گرد کو ٹٹول ڈالا مگر اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ لیکن نرم، خوشبودار پھولوں کا سلسلہ اس کے وجود پر برقرار تھا وہ زمین سے بلکہ درختوں سے بھی کافی اوپر غلا میں معلق تھا درختوں کے سرے گھاس کی مانند اس کے نیچے بچھے تھے۔

”کک..... کون ہو تم.....؟“ وہ ہڑبڑا گیا۔

”آ نکھیں بند کرو.....“ ایک نعلی آواز گونگی۔

اگرچہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو گھاس کے ایک قطع میں پایا اس قطع کے اطراف رنگ رنگ کے پھول کھتے تھے فضا خوشبوؤں سے بھری تھی اس کے سامنے ایک نسوانی پیکر تھا وہ سفید موی پیکر نیلے فرائک نما لباس میں ملفوف تھا اخرونی بال چہرے کے اطراف بھول رہے تھے۔

”کون ہو تم؟“ اصرار پوچھا۔

”سلینہ..... تم مجھے بہت اچھے لگے ہو اس لئے تم کچھ دن میرے ساتھ میرے گھر میں میرے مہمان رہو گے۔“

”وہ کیوں.....؟“ نہیں مجھے سارہ کو تلاش کرنا ہے۔ نہ جانے کہاں ہوگی وہ۔“ وہ مضطرب سے اٹھا۔

”اگر میں تمہیں نہ جانے دوں تو.....؟“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ آگے بڑھا لیکن اگلے ہی قدم پر اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیر زمین سے جکڑے گئے ہیں جس طرح کوئی لکڑی میں کیلیں گاڑ دے اس نے استعجاب سے لڑکی کو دیکھا وہ لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے اس کو دیکھ رہی تھی۔

”تم میری مرضی کے بغیر ایک انچ نہیں بل سکتے۔“

”لیکن..... تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟“ وہ جھنجھلایا۔

”کیونکہ..... میری مرضی.....“ سلینہ نے شانے اچکائے۔

”دیکھو، سارہ مشکل میں ہوگی مجھے اسے ڈھونڈنا ہے پلیز مجھے جانے دو۔“ اب کے اس کے منت ریز لہجے میں بے بسی کی آمیزش بھی تھی۔

”کون ہے یہ سارہ.....؟“

”میری..... کزن.....“

”اوکے۔ اگر میں اسے ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کروں تو مجھے کیا دو گے؟“ سلینہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اگر میری جان مانگو تو وہ بھی۔“ اس کے لہجے میں سچائی مترشح تھی سلینہ کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو تیر ہرایا اور پھر..... وہ بولی۔

”اوکے۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے اصرار کا ہاتھ تھا مایا اصرار آگے بڑھا تو اسے چلنے میں ذرہ بھر بھی دقت نہ ہوئی وہ آگے بڑھنے لگا۔

☆.....☆.....☆

سامنے سفید چٹانیں تھیں، گدلی، سفید چٹانیں نیچے سفید چمکدار ریت، گھری گھی تاحہ نگاہ ریت ہی ریت گھی یا پھر اکادکا چٹانیں..... ہاں کہیں کہیں صحرائی بوہے اپنی کھٹکی کی شکایت کرتے دکھائی دیتے تھے وہ لوگ پیاس سے بے حال تھے۔ لیکن آگے بڑھ رہے تھے۔

”رک جاؤ۔“ سپیرے نے کہا۔ اور ان کے قدم ٹھک گئے۔

”وہ آ رہا ہے سفید ناگ۔“ اس نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ شران اور سینڈو نے اس جانب دیکھا وہ بہت بڑا اڑتا تھا کسی درخت کے تنے جتنا موٹا اور طویل تر..... اس کے سفید چمکدار جسم پر سنہری نقطے سے بڑے بڑے لمبی سرخ و دھاتہ زبان سے نیلے قطرے گر کے ریت میں جذب ہو رہے تھے اس کی گول سیاہ آنکھوں میں گویا ہزاروں واٹ کے بلب روشن تھے۔ سینڈو سانس روکے اسے دیکھنے لگا شران بھی ساکت تھا ان کے قریب آ کر ناگ رک گیا اس نے سپیرے کو دیکھا۔ سپیرا ہاتھ باندھ کر جھکا گویا ناگ کو تعظیم دی وہ

خٹنے پھلا کر پھنکارا سپیرے نے یہ عمل دو تین مرتبہ دہرایا اب نے ایک غضب ناک نگاہ شران پر ڈالی وہ لڑا کر فرین نگاہ اس کے جسم میں پھر مری سی دوڑائی سفید ناگ پھنکارا اس کے منہ سے نیلا سیال سا پھوار کی صورت اڑا پھر وہ سپیرے کی جانب متوجہ ہو گیا کچھ دیر دونوں پھنکارتے رہے شران کی نظریں ناگ کے ہمایا تک چہرے پر جچی تھیں سپیرے نے اسے پکارا اس نے چونک کر سپیرے کو دیکھا تھا۔

”یہ پوچھ رہا ہے کہ کیا اب بھی تم وہ موتی حاصل کرنا چاہتے ہو۔“

”ظاہر ہے.....“ اس نے سر جھٹکا ناگ پھر پھنکارا۔

سپیرا کہنے لگا۔ ”یہ کہہ رہا ہے کہ تم کو اس سے لڑنا ہوگا کیا تمہیں قبول ہے؟ جیتنے والے کو منہ مانگا انعام ملے گا۔“ سینڈو کی آنکھوں میں حیرت دوڑ آئی۔ شران بلا توقف اثبات میں سر ہلا گیا سپیرے اور سینڈو نے از حد تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

”تو ٹھیک ہے چلو پھر.....“ سپیرے نے کہا اور ناگ کی تھلیل میں انہیں لئے چل دیا۔

اس جگہ صوب کی شدت اتنی زیادہ نہ تھی سفید چمکدار ریت البتہ گرم تھی۔ ”طرائی ایک گھنٹہ جاری رہے گی آخری وقت میں جس کا پلڑا بھاری ہوا اس کی جیت بھی جائے گی۔“ سپیرے نے آخری ہدایات دیں پلڑے دار سپیرا ایک جھوٹے سے نیلے نما پتھر پر بیٹھے تھے۔ ان کے دونوں طرف اور پیچھے سانپ ہی سانپ تھے کول وسیع دائرے کی جگہ چھوڑ کر ارد گرد سانپ ہی سانپ تھے۔ ہر رنگ..... ہر نسل کے سانپ..... وہ ایک انسان اور ایک ہیبت ناک سانپ کا مقابلہ دیکھنے سے بے ہوش تھے آپ سانپ کو لاکھ دودھ پلا لیں موقع ملنے پر وہ ڈھنسنے سے باز نہیں آئے گا اور اس وقت وہی سانپ اپنی تمام تر ہیبت ناک، کمینگی سمیت ایک انسان کے مقابل تھا۔ سفید ناگ، دیگر سانپوں پر نگاہ ڈال کر پھنکارا۔

سپیرے نے سینڈو کے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہ کہہ رہا ہے کہ لڑائی کا نتیجہ بھی ہو تم لوگ ہرگز بھی مداخلت نہیں کرو گے۔“ ناگ نے اپنا رخ شران کی جانب کر لیا اور دھیرے دھیرے سر کھتا ہوا شران کی جانب بڑھنے لگا اس سے کچھ فاصلے پر یہ رک کر وہ شران کو گھورنے لگا وہ بھی نہایت اطمینان سے ذرا بھی مرعوب ہوئے نہ اس کے عفریت جیسے چہرے کو دیکھے گیا پھر پہل ناگ نے ہی کی وہ پھنکارا وہاں سرخ زبان نکالے اس پر جھپٹا اس نے برق فکاری سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور ناگ پر ناگ چلائی جو اچھٹی سی گئی تھی۔

ناگ پھنکارتے ہوئے پھر اس پر حملہ آور ہوا اس نے پھر اچھل کر خود کو بچایا تھا۔ چند منٹ پہلی سلسلہ جاری رہا سانپ حملہ کرنا اور شران کا انداز دفاعی ہوتا جا چکا وہ اڑتا ہوا ناگ کی گردن پر جا پڑا۔ ناگ نے جھکنا چاہا مگر تب تک وہ اس کی گردن کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ ناگ کے حلق سے غضب ناک پھنکار نکلی وہ اضطرابی انداز میں اچھلا تو شران کے وجود کو بھی جھکا لگا تھا اور اسی جھکے کے سبب ناگ کی گردن اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی اب پھر ناگ اس پر حملہ کرتا اور وہ اچھل اچھل کر خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا اس نے ایک بار پھر خود کو بچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ناگ کے درمیانی دھڑ پر جا کر ناگ نے اپنی وزنی دم اس کے سر پر دے ماری اس کی آنکھوں کے آگے تارے سے تارے گئے اس بار وہ بڑی مشکل سے بچا تھا۔

وہ اب جھکنے سے ڈر رہا تھا اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا پسینے میں بیٹیکے بال فراخ پیشانی سے چپک گئے تھے۔ ناگ کا پلڑا بلاشبہ بھاری رہا تھا اگر وہ چاہتا تو اب تک شران کو ڈس کر ختم کر چکا ہوتا لیکن اب وہ اسے تھکا تھکا کر لطف اندوز ہو رہا تھا شاید وہ جان چکا تھا کہ جب چاہے ڈس کر اسے ”ختم“ کر سکتا ہے لیکن اب وہ اس سے ٹھیک رہا تھا شران کی مزاحمت اب بھی جاری تھی مگر اس میں پہلا سادہ نہیں رہا تھا اب کے ناگ نے اسے اپنے ٹھکانے میں جکڑ لیا اس کا دھڑ شران کے جسم

## خونفک سایہ



آج سے تقریباً سو سال پہلے تمہارے اندر بے شمار خلقتیاں موجود ہیں اور جب تم سب جوان ہوئے تو تم نے ایک مندر کے بت کو توڑا تھا جو ہندوؤں میں بہت مقبول مانا جاتا تھا۔

سردیوں کی رات تھی، رات کی تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، دور سے کسی الکی منیوس آواز آ جاتی، اس وقت رات تقریباً آدمی بیت چکی تھی، جب ایک خونفک سایہ ایک گھر کے سامنے آ کر اچانک غائب ہو گیا اگلے ہی لمحے گھر کے اندر سے کسی لڑکی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں..... بابا وہ مجھے ماروے گا بابا مجھے اس سے بچاؤ، دیکھو بابا وہ سامنے کھڑا ہے اس لڑکی نے روتے ہوئے کہا..... دوسرے ہی لمحے روٹی کا ایک پیولہ اس لڑکی کے جسم میں داخل ہو گیا اور پھر اس لڑکی کے منہ سے غرائشیں نکلنے لگیں..... میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا..... میں سب کو مار دوں گا ختم کر دوں گا.....

میرے ہاتھوں سے دھرتی کا ہکلا ہر دانش ہوگا..... بوڑھا باپ اپنی بیٹی کو سنبھال رہا تھا..... لائٹ آن ہوتے ہی اس نے اپنی بیٹی کی لال سرخ آنکھیں دیکھ کر خوف سے جھرجھری لی..... وہ بری طرح سے اپنے سردائیں بائیں بھٹکے مار کر بے قابو ہوتی دکھائی دی..... بیٹی..... بیٹی کیا ہو گیا تجھے..... یہ تجھے آدمی رات کو کیا ہو جاتا ہے..... بیٹی..... بیٹی اپنے آپ کو سنبھال..... اے خدا..... اے میرے مالک میری اکلوتی بیٹی کی حفاظت فرما وہ کھانسا ہوا بابا ہر دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کو کھولنے لگا..... تو دروازہ کھلتے ہی ایک انجانہ طاقت نے اندر لا پیچکا..... اس لڑکی کے اندر سے ایک

کیسی لہر سی برقی رو کی مانند اس کے وجود میں سرایت کر گئی اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا درودافیت کی ٹوکی لہریں بار بار اس کے وجود میں سرچتی تھیں وہ بے دم ہو کر گر گیا ناگ کی گردن پکھنی پکھلی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی، ہم ہی آوازیں ابھر رہی تھیں کھیدوں کی جھنجھٹ جیسی آوازیں کسی نے اسے تمام کر سیدھا کیا۔

”بہت زہریلا سانپ تھا۔“ نجانے کون بول رہا تھا۔ آوازیں پھر اپنا مغموم ٹھونسن۔  
”تو میں مر رہا ہوں؟“ اس کی آنکھوں میں بہت سے چہرے لہرائے امی کا، بابا کا شفیق چہرہ رومیہ اور روبان کا چہرہ..... اور ماہ شب..... ماہ شب کا چہرہ..... جو گہرے پانیوں میں پوشیدہ تھا اس نے آنکھوں کو کھولنا چاہا مگر اسے تاریکی کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا تاریکی کی دبیز چادر کے پار کچھ بھی نہ تھا شاید کچھ تھا لیکن اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ شاید اس کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔

”تو کیا میری موت اس گمنام جزیرے پر لکھی تھی؟ گھر والوں سے دور.....“ اس نے خود سے سوال کیا۔ ایک ایسا سوال جس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ ۱۱  
مر جائے گا اور کسی کو اس کے بارے میں علم بھی نہ ہوگا کہ اس پر کیا گزری؟ گھر والے اس کا انتظار کرتے ۱۲  
جائیں گے اور سمندر کی تہہ میں ماہ شب تا قیامت تک سوئی رہ جائے گی..... اس نے پھر خود سے سوال کیا کہ اس نے سفر آخرت کے لئے کیا تیاری کی تھی؟ اس کے پاس ساتھ لے جانے کے لئے کیا تھا؟ کیا تھا اس کے پاس بھلا.....؟

”اللہ.....“ درو کرٹ کی مانند اس کے پورے وجود میں دوڑا تو اس کے دل سے بے اختیار کراہ نکلی تھی۔  
”اللہ.....“ اس کا بے جان ساسر ایک طرف ڈھلک گیا اور ذہن پاتال کی اندھی گہری کھائیوں میں ڈوب گیا۔ یہ اس کا آخری احساس تھا۔  
(جاری ہے)

کو اپنے کنبے میں جکڑ چکا تھا اور..... اس کا کنبہ..... اس کی گرفت میں لمحہ بہ لمحہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

شران غر حال تو تھا ہی اب بے دم ہو کر نیم جان بھی ہو رہا تھا اسے اپنی ہڈیاں تنہی تنہی محسوس ہو رہی تھیں اسے اپنی رگیں پھٹتی محسوس ہو رہی تھیں وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر..... اس کی یہ کوشش صرف ”دکوشش“ ہی تھی۔ کامیابی سے کسوں دور..... اذیت نے اس کے پورے وجود میں دانت گاڑ رکھے تھے شدت مضبوط سے اس کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ سفید ناگ کی زہریلی پھنکاریں اس کی سماعتوں میں تیزاب انڈیل رہی تھیں اس کے وجود سے توانائیاں رخصت ہو گئی تھیں ذہن میں تیزی سے گھٹا ٹوپ تاریکی گھس رہی تھی اور سر پارے کی مانند بھاری ہو رہا تھا۔ تمام سانپ اطمینان سے دیکھ رہے تھے شران نے اپنی پچی پچی تمام قوتوں کو جمع کیا اور دونوں ہاتھوں سے ناگ کی گردن جکڑ لی اس بار ناگ کی پھنکار میں تکلیف کا عنصر تھا اس نے تمام تر قوت صرف کر کے اس کی گردن پر گرفت مضبوط کر لی ناگ نے کرب سے مل کھا کر اپنی دم کو تیزی سے حرکت دی شران کے گرد لپٹا ناگ اپنی دم کو تیزی سے گھماتا اسے آراؤ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی درو میں ڈوبی پھنکاریں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

بالآخر اس نے شران کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اس کے ایسا کرتے ہی اس کی گردن پر شران کی گرفت مضبوط ہو گئی ناگ اپنے ذہنی جسم کو بری طرح جھٹکتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا شران کو بھی جھٹکے لگ رہے تھے لیکن وہ ناگ کی گردن کسی طور چھوڑنے کو تیار نہ تھا کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ ناگ اب اسے ڈسنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اپنا یک سینڈ چلا یا نجانے کیا کہہ رہا تھا وہ؟ مٹا اسے اپنے پہلو میں بجلی سانس محسوس ہوا وہ بڑی دقت سے اپنے قدموں پر جما کھڑا تھا یک اس کی دائیں کلائی میں کہنی کے پاس چہن ہوئی جیسے کسی نے وہی سلاخ اس کی کلائی میں کھوپ دی ہو شدید ترین درو کی



بھیاںک مردانہ آواز بلند ہوئی..... میں تیری بیٹی نہیں ہوں، میں بہت پرانا ہوں..... صدیوں سال پرانا ہوں..... مجھے اس لڑکی اور اس کے سات ساتھیوں کی تلاش تھی..... اور اب اس لڑکی کے ملنے ہی میں ان ساتوں تک پہنچ جاؤں گا..... پچھلے سات جنہوں سے مجھے ان کی تلاش تھی..... انہوں نے میری تمام تر ہلکتیوں کو ناکام بنایا تھا..... جب انہوں نے مجھے مارا تھا تو ان لوگوں نے میری لاش کو جلایا نہیں تھا..... بلکہ مجھے تڑپنے کے لئے انہوں نے ایک پہاڑ میں موجود دو سال پرانے خوفناک مندر میں میری لاش کو دفن کر دیا تھا..... اس مندر میں بہت سی آتماں موجود ہیں لیکن وہ سب رات کو اپنا شکار تلاش کرتی ہیں..... یہ لڑکی اور اس کی تین سہیلیاں وہاں گئی تھیں..... اور اس طرح میں نے اس کے جسم میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا..... اور اس لڑکی کے پیچھے آ گیا..... اور گھر تلاش کر لیا..... اور اب میں اس لڑکی کے جسم میں داخل ہو کر ان لڑکوں کو ڈھونڈوں گا..... باہا با..... وہ قہقہے لگنے لگا اس کے بعد وہ خوفناک سایہ اس لڑکی کے جسم سے نکل گیا اور وہ لڑکی بے ہوشی کی حالت میں نیچے گر کر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

اور سناؤ آخر آج کل کیا کر رہے ہو..... سہیل عباس نے اس سے سوال کیا..... اس نے جواب دیا..... کچھ خاص نہیں جی..... اس کی بات سن کر کاشف نے سوال کیا..... تم تو ہر وقت میج کرتے رہتے ہو..... تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے..... تم تو اپنی دوست کی طرف زیادہ توجہ ہی نہیں دیتے..... وہ بیچاری ہر وقت تمہیں یاد کرتی رہتی ہے.....

دراصل..... وہ چار دوست تھے اور چاروں ہی ٹیچر تھے..... اور اتفاق سے چاروں ایک ہی اسکول میں پڑھاتے تھے..... ایک کا نام سہیل عباس، دوسرے کا نام آخر اور تیسرے کا نام کاشف تھا اور چوتھا امتیاز تھا..... چاروں ہر وقت خوش رہتے تھے..... ان کی زندگی میں ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی..... وہ کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا

نہیں کرتے تھے..... آج امتیاز نے ان سے ایک بہت ہی عجیب و غریب قسم کے خواب کا ذکر کیا اس نے ان سے کہا..... کروہ جب رات کو سوتا ہے تو اس کو خواب میں ایک بہت ہی خوفناک قسم کا آدمی نظر آیا ہے..... اس کی شکل بہت ہی خوفناک تھی اس کی کالی سیاہ رنگت اور جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ بہت ہی خوفناک تھا..... اس نے مجھ سے کہا کہ تم اور تمہارے ساتھی اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ..... اب میں نے دوبارہ اس لڑکی کے جسم پر قبضہ کیا ہے..... وہ تم لوگوں کو جانتی ہے اور اب تم کو کوئی بھی میرے قبر سے نہیں بچا سکتا..... وہ لڑکی اور کوئی نہیں بلکہ کاشف کی دوست سارہ ہے..... اور اب تو تم لوگ کسی طرح مجھے نہیں مار سکتے کیونکہ میرے پاس بے شمار غلگتیاں ہیں۔

دراصل میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں جہاں وہ مجھے نظر آتا ہے وہ بہت ہی بھیاںک پہاڑ نظر آتا ہے، ہم سب دوست اس پہاڑ پر چڑھتے ہیں..... اس پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد ہمیں ایک بہت ہی ڈراؤنا مندر نظر آتا ہے..... اس میں بے شمار تابوت پڑے ہوئے ہیں اور سامنے ہندو مذہب کا ایک بت کھڑا ہوتا ہے اس پر چمکاڑ کا نشان بنا ہوتا ہے..... اچانک اس کی بے نور آنکھیں چمکنے لگتی ہیں..... اس کی آنکھوں کی روشنی ایک تابوت پر پڑتی ہے تو اس کا ڈھکن خود بخود کھل جاتا ہے اور اس میں سے وہ بھیاںک شیطان نکلتا ہے اور وہ مجھے یہ سب کچھ کہتا ہے جو میں نے تم سب کو بتا دیا ہے.....

اس کی بات سن کر سب کھڑے ہو گئے..... ان میں سے سہیل نے کہا..... ”کہ میں ایک اللہ والے بزرگ کو جانتا ہوں، ان کا نام عبدالکیم ہے، عبدالکیم ہی ہمیں اس مسئلے کا حل بتائیں گے۔ سب نے اس کی بات کی تائید کی اور وہاں سے روانہ ہو گئے.....“ کچھ دیر بعد وہ عبدالکیم کے گھر پہنچ گئے..... امتیاز نے عبدالکیم کو اپنا مسئلہ بتایا..... عبدالکیم نے ان کی بات غور سے سنی..... اور بولے..... ایک منٹ روک میں ابھی آتا ہوں..... وہ ان سے کہہ کر باہر نکل گئے..... تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ واپس آئے تو ان

کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا..... انہوں نے وہ پیالہ میز پر رکھا..... انہوں نے ان چاروں کی طرف دیکھا اور سکرانے لگے اور بولے.....

”میں تمہارا مسئلہ تلاش کرتا ہوں“ انہوں نے ان سے کہا کہ اب تم مجھ سے بات مت کرنا..... انہوں نے مندر ہی مندر میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا..... تقریباً پانچ منٹ بعد پانی زور زور سے بہنے لگا..... دو منٹ بعد پانی رک گیا اور پانی میں ایک بھیاںک چہرہ نمودار ہوا، اس کی شکل بہت خوفناک تھی..... اچانک پانی میں سے ایک بھیاںک آواز بلند ہوئی..... پانی میں موجود شیطان نے ان سے کہا..... ”کہ اب میں امر ہونے والا ہوں اور اب میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا“..... ہاہاہاہ.....

تم لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ مجھے صرف سات انسانوں کے خون کی ضرورت ہے اور اب میں نے تین خون کر دیے ہیں، اس طرح اب مجھے امر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا..... تم لوگوں نے پچھلے جنہوں میں مجھے بہت شکست دی ہے، لیکن اب تم نہیں بچ سکتے..... ہاہاہاہ..... اس کے بعد حکیم صاحب نے پانی پر ہاتھ مارا تو بھیاںک چہرہ غائب ہو گیا..... سب نے حکیم صاحب سے سوال کیا کہ اب کیا ہوگا، ہمیں اس شیطان کو مارنے کے لئے کیا کرنا ہوگا..... عبدالکیم نے ان سے کہا حوصلہ رکھو میرے بچوں..... اس مسئلہ کا ابھی حل نکلتا ہوں، یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے..... جب وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جو دیکھنے میں بہت پرانی نظر آ رہی تھی..... وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر اس کتاب کا مطالعہ کرنے لگے..... تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد انہوں نے سر اوپر کواٹھایا اور بولے مجھے ایک دن کا وقت چاہئے کل صبح میرے پاس آ جانا..... ان کی بات سن کر سہیل عباس بولے..... ”کہ ہم نے تو کسی شیطان کو نہیں مارا، ہم تو کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے..... پھر یہ شیطان ہمارے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔“

اس کی بات سن کر حکیم صاحب بولے کہ تم کو کون سا کہانی معلوم ہو جائے گی..... اور وہ سب کھڑے

ہو گئے..... اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

سحر تم کیسی ہو..... نیلم نے فون اٹینڈ کرتے ہوئے پوچھا..... اس کی بات سن کر پاس کھڑی چاندنی نے پوچھا.....

اس کو تو ہر وقت اپنے دوست امتیاز کا خیال رہتا ہے..... اس کی بات سن کر سحر نے کہا کہ چاندنی تم کو بھی تو ہر وقت اپنے دوست سہیل کی فکر رہتی ہے، کہ وہ کہاں ہے..... اس وقت وہ کیا کر رہا ہے..... اس نے کھانا کھایا ہے کھینٹیں اور تو اور نیلم کو ہی دیکھو، ہر وقت اپنے پیارے آخر کو کونج کرتی ہے اس کے بعد سب کے قہقہے کمرے میں گونجنے لگے..... اچانک ان کو سارہ کی یاد آ گئی..... اور سب اس ہو گئیں..... اچانک نیلم کی آواز ابھری..... کہ کاش ہم اس ویران کھنڈر زرا مندر میں نہ جاتے..... تو آج سارہ ہمارے ساتھ ہوتی۔

اس کی بات سن کر سب کی آنکھیں بھر آئیں..... دراصل وہ چار دوست تھیں..... ایک کا نام چاندنی، دوسری کا نام نیلم تھا اور تیسری کا نام سارہ تھا جبکہ چوتھی کا نام سحر تھا..... چاروں ہی ایک کالج میں پڑھتی تھیں..... وہ سب سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھیں..... ایک دن وہ سب دوسری لڑکی کے گھر گئیں..... اس کا نام حنا تھا..... حنا نے ان کو ایک خوفناک پہاڑ کے درمیان ایک ڈراؤنے مندر کا ایک واقعہ سنایا..... حنا ایک لڑکے سے پیار کرتی تھی اس کا نام ریشم تھا..... وہ دونوں ہی کالج میں پڑھتے تھے..... وہ ہر وقت اپنے بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے..... ایک دن ریشم، حنا، نیلم، چاندنی، سحر اور سارہ نے اس پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنایا..... ریشم نے اپنی بانٹیک کو باہر نکالا اور اسے اشارت کر کے باہر نکل آیا وہاں پر سب موجود تھیں ان سب نے اپنی کاریں اشارت کیں اور وہاں سے روانہ ہو گئے..... ان کی بانٹیک سب سے آگے تھی اور باقی کاریں پیچھے تھیں..... ڈرائیونگ سیٹ پر نیلم تھی..... اس کی برابر والی سیٹ پر سحر موجود تھی..... سحر باہر کے موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی..... اس کی نظر اچانک

انتیاز پر بڑی... تو اس نے گاڑی روکنے کو کہا۔ تو ٹیلیفون نے کار روک دی۔ اتنے میں ملک انتیاز گاڑی کے قریب آ گیا۔ اس نے سحر سے پوچھا کہ آج تم سب کہاں جا رہی ہو۔ سحر نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ گھومنے پھرنے کے لئے۔ اس نے کہا۔ شام کو ہوٹل میں ملیں گے، سحر نے کہا ٹھیک ہے۔ اس کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کی بائیک تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی جب آبادی ختم ہوئی تو آگے ویرانہ ہی ویرانہ آ گیا۔ ان سب کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ ان کو انہیں سامنے ایک پہاڑ نظر آیا۔ ان سب نے اپنی کاریں روک دیں۔ وہ سب کاروں سے باہر نکلیں اور اس پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ پہاڑ پر چڑھنے کے بعد ان کو سامنے ایک مندر نظر آئی۔ وہ سب اس کی جانب بڑھے۔ اور پہاڑ کی دوسری سائیڈ پر پہنچے اترنے لگے۔ وہ سب مندر کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

اچانک سارہ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی۔ وہ سب سارہ کی جانب بڑھیں۔ سارہ ایک گڑھے میں جا گری۔ ریش اور حنا نے ہمت کی اور گڑھے میں اتر گئے۔ تو ان کی خوف سے چیخیں نکل گئیں۔ سامنے ایک غار تھا وہ دونوں اس غار میں داخل ہو گئے۔ جو پانی پیچھے رہ گئی تھیں۔ انہوں نے اس گڑھے میں اترنے کے لئے اپنے قدم آگے بڑھائے۔ تو گڑھا خود بخود بند ہو گیا۔ وہ دونوں سارہ کی تلاش میں اس غار میں داخل ہو گئے، وہ دونوں آگے بڑھتے گئے، غار تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اس غار کا اختتام ایک بہت ہی خوفناک تہ خانے میں جا کر ختم ہوا جب وہ تہ خانے کے اندر داخل ہوئے تو حنا کی خوف سے چیخ نکل گئی۔

سامنے ایک بہت بڑا بت بنا ہوا تھا اس کے آگے بے شمار تابوت موجود تھے اور ایک تابوت کے قریب سارہ نیچے کی طرف منہ کر کے بیٹھی ہوئی تھی اس کی پشت ان کی طرف تھی۔ حنا نے سارہ کے قریب جا کر اس کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ سارہ کی سرخ

انگاری جیسی آنکھیں ان کو گھور رہی تھیں۔ حنا نے خوف سے ایک جھرجھری کی اور ریش کے پاس آ گئی۔ ریش نے سارہ کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔ کون ہے تو۔ ریش نے سب کچھ دیکھ کر کہا اور کیوں اس لڑکی کے جسم میں داخل ہوا ہے۔ سارہ نے اپنے منہ سے بھیا تک قہقہہ لگایا اور باہر کی جانب بھاگی۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے باہر نکل آئے۔ سارہ نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے تو وہ ہوا میں اڑنے لگی۔ وہ ایک راستے سے باہر آ گئی۔ وہ راستہ اس شیطان کے بت کے پیچھے سے نکل رہا تھا۔ وہ دونوں بھی باہر نکل آئے۔ باہر موجود ان تین لڑکیوں نے جو سارہ کو دیکھا تو انہوں نے شور مچا دیا۔ لیکن سارہ ہوا میں اڑتی ہوئی ان کے پاس آئی اور بولی اب تم سب کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے کہا اور ہوا میں بلند ہو کر ایک جانب اڑنے لگی۔ وہ دونوں ان لڑکیوں کے پاس آئے اور انہیں وہاں سے بھاگ جانے کا کہنے لگے۔ اتنے میں زوردار ہوا چلنے لگی۔ اور وہ وہاں سے بھاگیں۔ سب اپنی کاروں میں بیٹھ گئیں اور اب ان کا رخ گھر کی جانب تھا۔

یار اب ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ سہیل نے پوچھا اس کی بات سن کر انتیاز نے جواب دیا کیا کریں۔ گماب ہم نہیں بلکہ اب تو باجی ہی اس کا کوئی حل تلاش کریں گے۔ جب وہ سب اکٹھے ہو گئے تو انہوں نے ان لڑکیوں کو کال کی اور گھر پر بلا لیا۔ کال سننے کے بعد وہ سب ان کے گھر جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔ اور اب وہ اپنے گھر جا رہی تھیں کیونکہ وہ سب دوست آخر کے کہ موجود تھے۔ اب وہ سب ان کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ تمام تیاری کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

جھے چھوڑ دو میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا اس ختم میں جیت میری ہوگی، وہ لڑکے میرا کچھ نہیں کاٹ سکتے سارہ بے قابو ہو کر مردانہ آواز میں بول رہی تھی کیونکہ

وہ بیہوش ہو گئی تھی تو اس کے والد نے اسے رسیوں سے باندھ دیا تھا۔ سارہ کے وجود میں جو شیطان تھا اس نے تین لڑکوں کو جان سے مار دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ سات خون کرے گا۔ اس کے گرد بابا جی نے آیت الکرسی کا حصار بنادیا تھا۔ اور اب وہ اس حصار کے اندر قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اب وہ شیطان جو کہہ رہا تھا کہ مجھے چھوڑ دو۔ وہ لڑکے اور لڑکیاں میرے تابوت میں اگر پہنچ گئے تو پھر مجھے ان سے شکست کھانی پڑے گی لیکن وہ نہیں جانتے کہ میری آتما کو وہ کیسے ختم کر سکتے ہیں، پھر اس نے کہا۔ ہاں وہ بڑھا کھوٹ ان کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دے گا لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔

☆ ☆ ☆ وہ سب اکٹھے ہو کر صبح بابا حکیم کے پاس پہنچ گئے۔ بابا حکیم کی آنکھیں سرخ لال ہو رہی تھیں۔ جیسے وہ ساری رات جاگتے رہے ہوں۔ انہوں نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ سب بیٹھ گئے۔ بابا حکیم نے اپنے پوتے کو بلایا جس کا نام ظفر تھا بابا جی کے دو بیٹے تھے ایک کا نام محمد شفیع تھا اور دوسرے کا نام بشیر احمد تھا۔ شفیع کا ایک بیٹا تھا ظفر جبکہ بشیر احمد کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام محمد تنویر احمد اور دوسرے کا نام فلک شیر۔ تنویر اور فلک شیر دونوں ہی پڑھائی میں بہت ذہین بچے تھے۔ اور وہ دونوں ہی اس اسکول میں پڑھتے تھے۔ جس میں وہ چاروں استاد پڑھاتے تھے۔ تنویر اور فلک شیر چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ جبکہ ظفر ان دونوں سے بڑا تھا۔ وہ دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بابا نے ظفر کو بلایا اور چائے لائے کو کہا۔ پچھویر بعد ظفر چائے لے آیا۔ تو سہیل نے کہا۔ بابا اس کی کیا ضرورت تھی۔

اس بات کو سن کر بابا مسکرانے لگے۔ اور گویا ہوئے۔ کہ آج سے تقریباً سو سال پہلے تمہارے اندر بے شمار شکتیاں موجود تھیں اور جب تم سب جوان ہوئے تو تم نے ایک مندر کے بت کو توڑا تھا جو ہندوؤں میں بہت مقبول مانا جاتا تھا۔ اس کا ایک پجاری جس کا نام رام لال تھا۔ اس نے تم کو مارنے کے لئے بہت سے

چلے گئے۔ اس کے پاس بے شمار کالی طاقتیں موجود تھیں تم نے اس کی تمام شکتیوں کو ناکام بنا دیا تھا اور ایک داس نے جس کا نام سارہ ہے اس کے جسم پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اپنا جسم چھوڑ دیا تھا۔ یہ جب کی بات ہے جب تم سب کالج چارہ تھے۔ تو وہ اچانک سارہ کے جسم میں داخل ہو گیا۔ اور اس نے تم سب پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے تم سب زخمی ہو گئے۔ اس نے صرف سہیل اور چاندنی اور انتیاز پر حملہ نہ کیا کیونکہ ان کے گلے میں آیت الکرسی کے لاکٹ موجود تھے۔ اس نے جب سب کو زخمی کر دیا تو۔ سہیل چاندنی اور انتیاز بھاگنے لگے، اچانک سہیل کو شوگر لگی اور وہ نیچے گر گیا تو اس کا لاکٹ ٹوٹ گیا۔

اس بدروح نے اس پر بھی حملہ کر دیا۔ چاندنی نے اور انتیاز نے مسجد کی طرف دوڑ لگادی جبکہ بدروح ان کے اوپر اڑ رہی تھی۔ وہ دونوں مسجد میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے امام صاحب کو سب کچھ بتادیا اور امام صاحب نے ان کو پانی پڑھ کر دیا۔ اور کہا اس بدروح پر ڈال دو۔ اور جب چاندنی اور انتیاز باہر آئے تو اس بدروح پر انہوں نے پانی ڈال دیا اور اس طرح تم لوگوں نے اس بدروح کو ختم کر دیا لیکن مکمل ختم نہ کر سکے۔ اور اس کی لاش کو پرانے مندر کے تہ خانے میں ڈال دیا۔

جب سے یہ تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ بابا کی باتیں سن کر انہوں نے پوچھا بابا اب ہم کس طرح سارہ کو بچائیں۔ بابا نے ان کو پانی دیا اور بولا جاؤ اور جا کر اس پانی کو اس بدروح پر ڈال دو اور اس کی لاش کو چلا دو۔ وہ سب سارہ کے گھر گئے تو وہاں انہوں نے اس پر پانی ڈالا اور ویرانے میں جا کر انہوں نے اس شیطان کی لاش کو چلایا تو زوردار ہوا چلنے لگی اور پہاڑ لرزنے لگا۔ وہ سب پہاڑ کے احاطے سے باہر آئے تو پورا پہاڑ زمین بوس ہو گیا۔ انہوں نے اپنی کامیابی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

☆☆

”میں اس کا بہترین دوست ہوں آئندہ اسے یوں بلا وجہ سزا دینے کا سوچنا بھی مت ورنہ بہت برا انجام ہوگا تمہارا۔“

**جنوبی** کوریہ کے چوتھے بڑے شہر ڈیگو کے اس آرام دہ گھر میں اس وقت دوپہر کے تین بجے تھے وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔ سترہ سالہ ٹی من نہایت خوبصورت خدوخال کا مالک تھا۔

”Yes Yes میں جیت گیا۔“ ٹی من گاڑیوں کی ریس کا گیم جیتتے ہوئے بولا۔ وہ اس وقت کمرے میں اکیلا تھا۔ اور اپنے آپ ہی بڑبڑا رہا تھا وہ جیت کے بالکل قریب تھا کہ تب ہی اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور اس کے مام اور ڈیڈ آگے پیچھے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔

”اوہ امام، ڈیڈ آپ دونوں یہاں میں بس گیم جیتنے ہی والا ہوں۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ اس کی مام اور ڈیڈ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اس کے ڈیڈ بولے۔

”ٹی من اپنا گیم بیچ میں چھوڑ دو ہم تم سے ایک ضروری بات کرنے آئے ہیں۔“

”بس ذرا سی دیر ڈیڈ میں گیم جیتنے ہی والا ہوں۔“ ٹی من نے کہا۔

”سنائیں تم نے بند کر داسے۔“ اب کی بار وہ ذرا غصے سے بولے۔

”بس ایک منٹ ڈیڈ۔“

ٹی من بعد تھا۔ اس کے ڈیڈ نے غصے سے اس

خونفک کہا بھائی 126 اپریل 2018ء





”ٹھیک ہے بتاؤ کیا وضاحت ہے اس بار تمہارے پاس ٹیل ہونے کی۔“ نام بولیں۔  
 ”نام ڈیڈ آپ تو جانتے ہی ہیں امتحانوں سے پہلے میری طبیعت کافی خراب ہوگئی تھی لہذا میں تیار نہیں کرسکا۔“

”بس بچے بہت ہو گیا۔ طبیعت تو تمہاری میں ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ تمہاری سزا اب یہ ہے کہ جب تک ہم تمہیں کسی سخت سے اسکول میں نہیں بھیج دیتے تمہارے کمرے سے ایک ایک چیز نکال لی جائے گی۔“ اتنا کہہ کر اس کے ڈیڈ اسکا ویڈیو گیم لے کر کمرے سے باہر نکلتے چلے گئے۔

”آخر آپ لوگوں کو یہ کیا گیا۔“ تی من حیران پریشان سا بولا۔  
 ”اب تو تمہیں ہونے والا ہے بچے۔“ اس کی مام یہ کہتے کے ساتھ ہی میز کی دراز کی طرف بڑھیں اور چنگی باہر نکال لی اور پھر اس کے ٹی وی کی تار کاٹ ڈالی۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں مام؟ کیا آپ دیوانی ہوگئی ہیں۔“ تی من اب بستر سے نیچے اتر آیا تھا۔ اس کی مام نے اس کا لپٹ ٹاپ میز پر سے اٹھایا اور کمرے سے باہر لے گئیں۔ تی من انہیں روکتا ہوا پیچھے پیچھے آنے لگا۔ تب ہی کمرے میں اس کے ڈیڈ داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی اس کی کتابوں کی حلیف میں سے کتابیں نکالنا شروع کر دیں۔

”ڈیڈ پلیز یہ تو رہنے دیجیے یہ تو پڑھنے کی کتابیں ہیں۔“ وہ بے چارہ اب رونے والا ہو رہا تھا لیکن اس کے ڈیڈ نے ایک نہ سنی اور غصے سے کتابیں اس کی طرف کرتے ہوئے بولے۔

”یہ ساری کاک بکس ہیں لڑکے۔ آج سے تم صرف اسکول کی کتابیں پڑھو گے۔“ وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

تی من بچوں کی طرح رو دیا۔  
 اس کے مام باپ شروع سے ایسے ہی تھے معمولی

کی بات پر سخت سزا دینے والے۔ انہوں نے کبھی اس کا اس طرح خیال نہیں رکھا تھا جیسے کہ کسی اچھے مام باپ کو کھنا چاہئے۔ تی من بھی اس وجہ سے بے چارہ الگ تھک رہتا تھا۔ اس کے والدین بھی کبھی اس سے کوئی بات نہ کرتے نہ ہی کبھی اس پر کوئی توجہ دیتے لیکن بس انہیں یہ لگی رہتی کہ ان کا بیٹا دوسروں کے بچوں میں نمایاں نظر آئے جو کہ والدین کی توجہ کے بغیر ناممکن تھا۔ تی من بھی اپنی دنیا میں مست رہتا کبھی لپٹ ٹاپ پر دوستوں کے ساتھ چیٹنگ کر رہا ہوتا تو کبھی ٹی وی دیکھ رہا ہوتا تو کبھی کاک بک بڑھ رہا ہوتا یا پھر ویڈیو گیم کھیل رہا ہوتا جو اس کا محبوب شغل تھا۔ اس وقت بھی وہ ویڈیو گیم ہی کھیل رہا تھا جب اس کے مام اور ڈیڈ نظر پڑے کمرے میں چلے آئے اور آتے ہی اسے امتحانوں میں ٹیل ہونے کی سزا سنائی اور سزا بھی اتنی سخت کہ بے چارہ تی من کا دل خون کے آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا وہ خاموشی سے بستر پر بیٹھ کر آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔

شام کا وقت قریب آیا تو اس کے ڈیڈ نے اسے کمرے سے باہر بلایا اور اسکول کی کتاب اس کے ہاتھ میں تھادی۔

”اسے اونچی آواز سے پڑھو۔“ تی من صوفے پر بیٹھ کر پڑھنے لگا تب ہی وہ سختی سے بولے۔  
 ”یہاں بیٹھ کر نہیں سامنے کھڑے ہو کر میرے سامنے پڑھو۔“

”ڈیڈ آخر آپ میرے ساتھ اتنا برا سلوک کیوں کر رہے ہیں۔“ وہ منہ نہایا۔

”برا سلوک تو ابھی میں نے کچھ بھی نہیں کیا مام لیکن اگر تم اسی طرح بکواس کرتے رہے تو بتاؤں گا کہ برا سلوک کسے کہتے ہیں۔“ انہوں نے سختی سے کہا۔ وہ بے چارہ پھر پڑھنے لگ گیا جب پڑھتے پڑھتے آدھا گھنٹہ ہو گیا تو وہ تنگ آ کر بولا۔

”ڈیڈ میں مزید دیر یوں کھڑا نہیں رہ سکتا۔ آپ مجھے بیٹھنے کیوں نہیں دیتے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے جاؤ اپنے کمرے میں

کر آرام کرو۔ لیکن یاد رہے آج رات تمہیں ڈنڈوں ملے گی۔“ انہوں نے اپنی طرف سے ایک اور کم بلاسٹ کر دیا اب تو تی من بیٹھنا ہی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں پڑھ رہا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”نہیں اب تم کمرے میں جا کر آرام کرو اور تمہارے لئے آج رات کوئی کھانا نہیں ہوگا۔“ مجھے اب جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔“ وہ طیش میں آتے ہوئے بولے۔ تی من چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔

اس رات تی من اپنے بستر پر بیٹھا خاموشی سے کتابوں کی خالی حلیف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پیر کی طرف دیکھا اس کی تار کی پڑی تھی پھر وہ اپنے ویڈیو گیم کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور ایک دم اداس ہو گیا اسے آج رات کھانا بھی نہیں ملا تھا وہ بے چارہ بس ایک کپ کافی پی کر اپنے کمرے میں سوئے کے لئے آ گیا تھا مگر بھلا خالی پیٹ جب چوہے دوڑ رہے ہوں تو نیند کسے آتی ہے۔ وہ بھی بے چارہ کمرے کی لائٹ بجھا کر بستر پر لیٹ کر میٹیں بدل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے مام، ڈیڈ ایسے کیوں ہیں۔ اس کے تمام دوستوں کے مام

ویڈیو بہت زیادہ خیال رکھنے والے اور بیمار کرنے والے ہیں پھر آخر اس کے مام، ڈیڈ ایسے کیوں ہیں۔ وہ اس کی سالگرہ والے دن بھی سختی سے پیش آتے ہیں۔ اور دوسرے بچوں کے سامنے اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ

ان کا بیٹا کتنا نالائق ہے۔ اور تو اور وہ کبھی اس کے ساتھ تصویر کھینچنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ مام تو بچوں سے بہت لاف کرتی ہے۔ اس پوری دنیا میں ہی تو ایسی سختی ہے جو اپنی اولاد کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے لیکن اس کی مام کو ہر وقت پارٹیز میں جانے کی لگی رہتی ہے۔ وہ کبھی اس کی طبیعت کو چھینے تک کی روداد نہیں تھیں۔

پھر اچانک ہی اسے خیال گیا کہ مام اور ڈیڈ نے آج کہا تھا کہ وہ اسے کسی سخت سے اسکول میں داخل کرائیں گے نامعلوم وہ کونسا اسکول ہوگا، یہ سوچ کرتی

من پریشان ہو گیا اور پھر کبھی سوچتے سوچتے اسے نیند بھی آ گئی۔

اگلی صبح جب آنکھ کھلی تو وہ جلدی جلدی شاور لے کر ناشتے کی میز پر پہنچا۔ رات کو بھوکے پیٹ سویا تھا سو اس وقت خوب زوروں کی بھوک لگی تھی مام ہائے ڈیڈ۔ اس نے شکر اترے ہوئے انہیں دیکھا۔ اور جلدی جلدی ناشتہ شروع کر دیا وہ کھانے پڑوٹا پڑوٹا تھا۔ ڈیڈ نے تنقیدی نگاہوں سے اسے دیکھا تب ہی اس کی مام بول پڑیں۔ ”یہ تم کیا بھوکے منیڈوں کی طرح کھانے پڑوٹے پڑوٹے ہو۔ کھانا کہیں بھاگ نہیں جائے گا۔ آرام سے کھاؤ مجھے۔“

”مام پلیز! میں رات کو خالی پیٹ سویا تھا۔“ تی من نے رحم طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ”خالی پیٹ سوئے تھے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کھانے کے آداب بھول جاؤ۔“ مام بولیں۔

”اچھا مام سنو تی من، میں نے اور تمہاری مام نے تمہارے لئے ایک اسکول دیکھا ہے ہم تمہیں وہاں داخل کر رہے ہیں۔“ ڈیڈ نے بتایا۔

”اچھا وہ اسکول کہاں ہے؟“ تی من نے پوچھا۔

”وہ اسکول یہاں سے تقریباً تین گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔“ ڈیڈ نے بتایا تو تی من اپنی جگہ سے اچھل ہی تو پڑا۔

”تین گھنٹے کی ڈرائیو پر تو بھلا میں روزانہ آنا جانا کیسے کروں گا۔“

”تم وہاں سے آنا جانا نہیں کرو گے تم وہیں رہو گے۔“ مام بولیں۔

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔

”مطلب یہ کہ اسکول میں ہی ہاسٹل بھی ہے تم وہیں رہو گے اور ہاں نہ ہی وہاں ٹی وی دیکھنے کی سہولت ہے اور نہ ہی ویڈیو گیمز کھیلنے کی اجازت ہے اور نہ ہی کاکس رکھنے کی اجازت ہے۔ ہاں کمپیوٹر کی سہولت وہاں

ہوئی۔“ ڈیڈ نے تو گویا اس پر ہم بلاسٹ کر کے رکھ دیا۔  
”نہیں، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ میرے  
ساتھ ضرور کوئی مذاق کر رہے ہیں۔“ وہ بری طرح گھبرا کر  
بولتا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کوئی تمہارے ساتھ مذاق نہیں کر رہا۔  
اور آرام سے بیٹھ کر اپنا ناشتہ کرو کل رات بھی تم بھوکے  
سو گئے تھے۔ اور ہم اتنے ظالم ماں باپ نہیں ہیں کہ تمہیں  
بھوکا مار دیں۔“ ڈیڈ نے کہا۔

”یہ آپ لوگ میرے ساتھ زیادتی کر رہے  
ہیں۔ اچھا نہیں کر رہے ہیں یہ آپ لوگ میرے ساتھ۔“  
تی من اب بالکل روئے والا ہو گیا تھا۔ آگئیں بھی  
بھڑائی تھیں۔

”مجھے ایک موقع اور دیجیے۔“ اب کی بار میں  
ایکرازم میں اچھے نمبرز لاؤں گا۔“ وہ اچھا لہجے میں بولا۔  
”ہمیں تمہاری کوئی بات نہیں سنی سمجھے؟“ نام  
نے سختی سے کہا تو ڈیڈ نے تی من کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس  
کسی پر بیٹھا دیا۔ ”چلو ناشتہ کرلو۔ خواہ وہ روئے دھونے  
سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ تی من نے آنسو صاف کئے  
اور خاموشی کے ساتھ ناشتہ کرنے لگا۔

تی من کے مام اور ڈیڈ اسے جلد از جلد دوسرے  
اسکول بھیجنا چاہتے تھے لہذا انہوں نے اسے اپنا سامان  
پیک کرنے کا کہہ دیا۔ وہ بے دلی سے اپنا سامان پیک  
کرنے لگا۔ اور پھر ایک بجے کے اندر اس کے ڈیڈ اسے  
اپنی کار میں بٹھا کر دو دروازے کے علاقے کے اسکول میں  
لے گئے۔ سارا سفر خاموشی میں گزرا۔ تی من سارا وقت  
کھڑکی کے باہر جھانکتا رہا۔ وہ اپنے ڈیڈ کی طرف دیکھنا  
بھی نہیں چاہتا تھا وہ ان سے سخت ناراض تھا اور دوسرے  
وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کی اتاری ہوئی صورت دیکھیں  
وہ ان پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ بھلے نہیں اس کی کوئی پرواہ  
ہو یا نہ ہو بھلے وہ اس کے ساتھ جیسے مرضی پیش آئیں  
اسے اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے انہیں اس کی  
پرواہ نہیں ہے ایسے ہی اسے بھی اسے بھی ان کی کوئی پرواہ  
نہیں ہے۔ لیکن اندر سے اس کا دل درد رہا تھا۔ تقریباً تین

گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ ایک جنگل نما جگہ پر آ گئے  
۔ یہاں دو دروازے کوئی آبادی نہیں تھی مگر البتہ سامنے  
ایک بہت بڑی عمارت نظر آ رہی تھی جو بے شک اس  
اسکول کی تھی۔ ”یہ تمہارا نیا اسکول، پسند آیا؟“ اب کی  
بار ڈیڈ نے مسکرا کر پوچھا۔ تو بے چارہ زبردستی مسکرا دیا۔

”چلو اندر چلتے ہیں۔ اپنا سامان گاڑی سے باہر  
نکالو۔“ تی من نے بے دلی سے اپنا سامان گاڑی سے  
باہر نکالا اور ڈیڈ کے ساتھ اسکول کی عمارت میں داخل  
ہوا۔ یہ عمارت ذرا پرانی طرز کی تھی اندر داخل ہوتے ہی  
تی من نے پیچھے مڑ کر دیکھا دو دروازہ بند ہو رہا تھا اسے یوں  
لگا جیسے یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو رہا ہے۔

”چلو پھیل کے آفس میں چلتے ہیں۔“ اس کے  
ڈیڈ نے کہا۔ تو وہ خاموشی کے ساتھ ان کے پیچھے چل دیا۔  
پر پھیل کے آفس میں اجازت لے کر اندر داخل  
ہوئے سامنے ایک عمر رسیدہ سخت سے نظر آنے والے  
پرنسپل اپنی ٹیبل کے پیچھے کرسی پر براجمان تھے۔

”آئیے تعریف رکھیے۔“ انہوں نے ڈیڈ سے  
ہاتھ ملایا اور پھر تی من سے وہ دونوں ٹیبل کے سامنے رکھی  
دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تی من کو اپنے سامنے بیٹھے پرنسپل  
سے بے حد خوف آ رہا تھا۔

”میرا نام گن ہو ہے۔“ پرنسپل نے اپنا نام بتایا۔  
”جی اور میرا نام جن جن دو ہے۔ خوش قسمتی سے یہ  
میرا بیٹا ہے تی من لیکن بد قسمتی سے نہایت کمزور لائق  
ہے۔ آپ پلیز اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے گا۔“ ڈیڈ  
نے کہا تو تی من ادا اور شرمندہ سا نظر آنے لگا۔ پرنسپل  
جلدی سے مسکراتے اور بولے۔

”آپ بے فکر رہیں ہم پیار سے ہی اسٹوڈنٹس  
کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔“  
”وہ تو ٹھیک ہے۔ پرنسپل صاحب لیکن یہ پیارت  
سمجھنے والی چیز نہیں ہے۔“ ڈیڈ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔  
”آپ بے فکر رہیں ہم سنہال لیں گے۔“ کچھ  
دیر مزید بات چیت کرنے کے بعد ڈیڈ وہاں سے چلا  
گئے تو تی من نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”ڈیڈ پلیز مجھے کال کریں گا۔“

”ہاں ضرور کروں گا۔“ وہ اتنا کہہ کر اپنا ہاتھ  
چھڑاتے اسکول کی عمارت سے باہر نکلتے چلے گئے۔ تی  
من انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

تب ہی اچانک پیچھے سے کسی نے اس کے  
کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا سامنے  
پرنسپل صاحب کھڑے تھے۔

”آ جاؤ ٹیک میں پہلے تو تم سے کچھ باتیں کرنی  
پڑیں گی۔“ انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا اور اسے  
اپنے ساتھ لے کر ایک بار پھر اپنے آفس میں آ گئے۔  
”Well تو تمہارے ڈیڈ نے بتایا ہے کہ تم  
مارے پیچھے میں فیل ہو گئے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں  
کیوں؟“ انہوں نے رعب سے پوچھا۔

”میرا میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے تیاری  
نہیں کر سکا۔“ تی من نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔

”بہت خوب۔“ بہانے اچھے کر لیتے ہو تم جب ہی  
تو شاید تمہارے والدین نے تمہیں یہاں ڈلوایا۔ لیکن  
بے فکر ہو یہاں ہم تمہاری طبیعت خراب نہیں ہونے  
دیں گے۔ اب اپنا سامان لاؤ سب سے پہلے اپنا سامان  
پیک کرواؤ۔“ اتنا کہہ کر پرنسپل گن ہونے اس کا سوٹ  
کیس کول ڈالا اور سارا سامان الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے  
اس میں انہیں MP3 نظر آیا۔ انہوں نے ایک دم  
گھور کر اسے دیکھا اور پھر وہ سامان میں سے نکال لیا  
پر بولے۔

”جس دن تمہیں اس اسکول سے گھر جانے کی  
اجازت ملے گی اس دن اب یہ تمہیں ملے گا۔ اس سے  
پہلے اسے آخری بار دیکھ لو۔“ اتنا کہہ کر پرنسپل نے وہ اس  
کی نظروں کے سامنے لہرایا اور ایک طرف ہٹا کر رکھ دیا۔  
پرانوں نے اس کا سوٹ کیس بند کیا اور اسے تھما دیا۔

”ہاں سب ٹھیک باتم اپنے کمرے میں جاسکتے  
ہے۔“ اتنا کہہ کر پرنسپل صاحب نے تی من کو اس کے  
کمرے میں بھیج دیا۔ وہ اپنا سوٹ کیس لے کر اپنے  
کمرے میں پہنچا۔

تی من نے دھیرے سے دروازہ کھولا  
اور اندر کمرے میں قدم رکھا تو اپنے سامنے اسے تین  
لڑکے اور دکھائی دیے۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔  
”ہائے۔“ وہ سب ایک ساتھ بولے۔

”ہائے تم لوگ میرے کمرے میں؟“ تی من  
نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”تمہارا کمرہ نہیں یہ ہمارا کمرہ بھی ہے۔“ ایک  
لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو یعنی ہم سب ایک روم شیئر کریں گے؟“ تی  
من نے پھر حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں بالکل یار اور نہیں تو تمہیں کیا لگتا ہے کہ یہ  
کوئی فائیو اسٹار ہوٹل ہے جو تمہیں رہنے کے لئے الگ  
سے کمرہ ملے گا۔“ اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ویسے تمہارا نام جان سکتا ہوں۔“ اس نے  
پوچھا۔

”میرا نام تی من ہے۔“ تی من نے مسکراتے  
ہوئے اپنا سوٹ کیس ایک طرف رکھا اور اس لڑکے سے  
ہاتھ ملایا۔

”میرا نام سی جن ہے۔“ اس نے بتایا۔ باقی کے  
دو لڑکے بھی آگے آئے۔ ”میرا نام دوگک دو ہے۔“ ایک  
موٹے سے لڑکے نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے  
اس سے ہاتھ ملایا میرا نام جی سنگ ہے تیرے لڑکے  
نے اس سے ہاتھ ملایا وہ ان تینوں میں سب سے  
خوبصورت تھا۔

دوگک دو لگتا ہے تم پڑھائی میں بہت اچھے ہو ورنہ  
میرا تو حال ہی نہ ہو پوچھو۔“ تی من نے دوگک دو کی طرف  
دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں ایسا کیوں لگا؟“ اس نے حیرت  
کا اظہار کیا۔

”تمہارے چشمے سے۔“ سچ بتاؤ تمہیں پڑھتے  
پڑھتے چشمہ لگ گیا نا؟“ تی من نے پوچھا۔

”ارے نہیں یار یہ تو یونہی میری نظر کمزور ہے  
ورنہ تو میں پڑھائی میں بالکل پیچھے ہوں۔“ دوگک دو نے

انسوس سے کہا۔  
”کیا واقعی؟“ ”تی من کو حیرت ہوئی۔“

”ہاں واقعی اور ایسے بھی میں پڑھائی میں سب سے پیچھے ہوں جب ہی تو میرے والدین نے میرا یہاں داخلہ کرایا ہے۔“ ”دو ٹنگ دو نے بتایا۔“

دوستو بھی پڑھائی میں سب سے پیچھے ہوں۔  
میرے والدین بھی مجھ سے بے حد تنگ ہیں انہوں نے بھی تنگ آ کر مجھے یہاں ڈال دیا ہے۔“ ”تی من نے بتایا۔“

”سمجھ نہیں آ رہا ہمارے والدین ہم سے تنگ آ کر ہمیں اسی سخت سے اسکول میں کیوں داخل کر رہے ہیں۔“ ”تی من نے کہا۔“

”اسی لئے تو انہوں نے ہمیں اس سخت سے اسکول میں داخل کرایا ہے کیونکہ وہ ہم کو ناپسند کرتے ہیں۔“ ”تی منگ نے کہا۔“

”سمجھ نہیں آتا حالانکہ میں تو اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ان کی اکلوتی اولاد ہوں پھر نامعلوم یہ سب کیوں۔“ ”تی من اواس لہجے میں بولا۔“

”خیر چھوڑو یہ سب آؤ تمہیں اسکول دکھاتے ہیں۔“ ”تی من نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔“

”ہاں پلیز! ضرور دکھاؤ دیے یہ اسکول ہے کیا؟“ ”تی من نے اچانک ہی خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔“

”ہم ابھی تمہیں دکھاتے ہیں اور بھتا رہ جائے گا وہ تم خود دیکھ لو گے۔“ ”تی منگ نے شریہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔“

”کیا مطلب؟“ ”تی من نے چونک کر دیکھا۔“

”مطلب تم ابھی خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ چلو ہمارے ساتھ تمہیں اس اسکول کی سیر کرائیں۔“ ”تی منگ نے ایک بار پھر اسی شریہ لہجے میں جواب دیا تو تی من خاموشی سے ان کے ساتھ چل دیا وہ اسے لے کر کلاس رومز دکھانے لگے۔“ ”یہ ہماری کلاس ہے، یہاں سے سوئمنگ پول بھی نظر آتا ہے۔“ ”تی من نے بتایا۔“

”تی من نے کھڑکی سے باہر جھانکا واقعی وہاں باہر

سوئمنگ پول نظر آ رہا تھا۔“ ”ارے واہ۔ یہ تو بہت ہی عالی شان نظارہ ہے۔“ ”تی من خوش ہوتے ہوئے بولا۔“

”باہر چل کے دیکھو اور یہی عالی شان نظارہ ہے۔“ ”اتنا کہہ کر جی سنگ اسے اپنے ساتھ کلاس سے باہر لے آیا۔ دو ٹنگ وادری جن بھی ساتھ میں تھے۔ وہ تینوں اسے لے کر اسکول کے ایک ایسے حصے میں آ گئے جو بالکل خالی اور ویران سا لگ رہا تھا۔“

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ ”تی من نے پوچھا۔“

”ہا ہا ہا! ارے یہی تو اصل جگہ ہے۔ یہی تو وہ جگہ ہے جو ہمارا مقام ہے اور خدا نہ کرے مستقبل میں تمہارا بھی مقام بن سکتا ہے۔“ ”جی سنگ نے ہنستے ہوئے کہا۔“

”کیا مطلب میں کچھ سمجھا نہیں؟“ ”تی من نے حیرت سے سر ہکیا۔“

”مطلب یہ کہ یہ کمرہ دیکھ رہے ہو جس کا دروازہ لوہے کی سلاخوں والا ہے اس کمرے میں اسٹوڈنٹس کو سزا کے طور پر بند کیا جاتا ہے۔“ ”دو ٹنگ دو نے بتایا۔“

”ناممکن..... تم لوگ ضرور میری ٹانگ سمجھ رہے ہو۔“ ”تی من نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔“

”نہیں یہاں ہم میں سے کوئی تمہاری ٹانگ نہیں سمجھ رہا۔ یہ بات بالکل درست ہے اور جب کسی تمہیں یہاں آنے کا خیر ہوگا تب ہی تمہیں یقین آ جائے گا کہ کون کس کی ٹانگ سمجھ رہا ہے۔“ ”تی من نے کہا۔“

”لیکن یہ تو غلط ہے۔ یہ تو اسٹوڈنٹس کے ساتھ زیادتی ہے۔ یہ تو ظلم ہے۔“ ”تی من حیرت سے چیخ پڑا۔“

”ہاں یہ ظلم ہے لیکن یہ لوگ ظلم کرتے ہیں۔ انہیں ظلم کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ طرح طرح سے اسٹوڈنٹس کو سزائیں دیتے ہیں یہاں سارے اساتذہ بہت خراب ہیں۔“ ”تی من نے کہا۔“

”اور تو اور تمہیں ان کے مظالم کا ایک شاہکار نمونہ مزید دکھاتے ہیں۔“ ”اتنا کہہ کر سی جن باقی لڑکوں کو لے کر اس کے ساتھ آگے بڑھا سامنے ایک لکڑی کا دروازہ تھا جس پر ایک بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا۔ اور اس کے اوپر دیوار پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔“

”پشمنٹ روم“

”ارے نہیں اب یہ کیا ہے۔ اب کیا کمرہ مگی ہے۔“ ”تی من بڑبڑایا۔“

دو ٹنگ دو ٹنگ دیا پھر بولا۔ ”یہ کمرہ اب استعمال نہیں ہوتا یہ کمرہ سالوں سے بند پڑا ہے ہم نے کبھی اس کمرے کے اندر جا کر نہیں دیکھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں تمام اسٹوڈنٹس کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ جس کسی کو بھی سخت سزا دینی ہوتی اسے یہاں لے آتے۔ پھر ایک دن کسی لڑکے نے یہاں خودشی

کر لی۔ اس نے خود کو چھائی دے ڈالی۔ اس کے بعد سے یہاں کوئی نہیں آتا۔ جب سے یہ جگہ بالکل ویران پڑی ہے۔ یہاں آنا منع تو نہیں ہے لیکن اس تالے کو کھولنا منع ہے۔ کہتے ہیں کہ اس لڑکے کی آتما اس کمرے میں قید ہے۔“

”واقعی یہ جگہ تو بے حد پراسرار ہے۔ لیکن دیکھنا ایک دن میں اس راز پر سے پردہ اٹھا دوں گا۔“ ”تی من نے کہا۔“

”ارے کیا باؤ لے ہوئے ہو تم۔ ایسا کرنے کا سوچنا بھی مت۔ انتہائی کڑی سزا ملے گی۔“ ”دو ٹنگ دو نے گھبرا کر کہا۔“

”میں سب کے سامنے تھوڑی چپکے سے یہ کام کروں گا۔“ ”تی من نے کہا۔“

”سوچ لو پکڑے گئے ناں تو اساتذہ تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ برا حال کر کے دکھ دیں گے تمہارا۔“ ”جی سنگ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔“

”مجھے انجام کی پروا نہیں ہے مجھے تو بس آغاز کرنا ہے۔“ ”تی من نے حوصلے سے جواب دیا تو تینوں لڑکوں نے کندھے اچکا دیئے۔“

ابھی وہ مزید کوئی بات کرتے کہ انہیں اپنے پیچھے سے آواز آئی۔ ”غلطی ہوئی جن سو آئندہ ایسا کچھ نہ کریں گے۔“ تینوں نے آواز پر پلٹ کر دیکھا۔

سامنے ایک بکھرے بالوں والا شخص جس کے کپڑے کافی میلے لگ رہے تھے۔ پشمنٹ روم کے

نزدیک کھڑا کسی جن سو نامی لڑکے سے معافیاں مانگ رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ ”تی من نے حیرت سے پوچھا اس لئے کیونکہ وہاں ان چاروں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ تینوں لڑکے اسے لے کر واپس جانے لگے۔

”یہ بے چارہ پاگل ہے۔ سنا ہے کہ جب اس لڑکے نے خودشی کی تھی تو اس کے بعد اس نے یہاں اسکول میں کچھ دیکھ لیا تھا۔ بس تب سے یہ اپنا ذاتی توازن کھو بیٹھا ہے۔“ ”سی جن نے بتایا۔“

”اس بے چارے کا نام کیا ہے۔ اور یہ یہاں کیا کرتا ہے؟“ ”تی من نے پوچھا۔“

”ہاں اب یہ تم نے دلچسپ سوال پوچھا اس کا نام لا اون ہے اور یہ یہاں کے پرنس صاحب مگن ہوگا چھوٹا بھائی ہے۔“ ”سی جن نے بتایا۔“

”ارے نہیں کیا تم کچھ کہہ رہے ہو۔ کیا واقعی یہ؟“ ”تی من نے حیرت سے آنکھیں پھلائیں۔“

”ہاں بالکل سچ۔“ ”سی جن نے کہا۔ اور پھر تینوں لڑکے واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ جی سنگ اسے اپنا کمرہ دکھانے لگا وہ ایک ڈیجیٹل کمرہ تھا اس نے اسے کمرے میں سے بے شمار تصویریں دکھائیں اس میں ہوم ویڈیوز بھی تھیں۔ ”تی من کو بہت مزہ آیا چلو یہاں کسی چیز کی تو اجازت ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا

چاروں لڑکے ریت تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اگلے روز تی من کو صبح ہی صبح لڑکوں نے جگایا۔ ”بس تھوڑی دیر مزید سونے دو۔“ ”تی من مکمل منہ پر ڈالتا ہوا بولا۔ تب ہی سی جن نے سمجھ کر اس پر سے مکمل اتار پھینکا۔“

”اٹھ جاؤ جلدی سے ورنہ بہت برا ہو جائے گا تمہارے ساتھ تمہارا آج پہلا دن ہے ابھی تمہیں یہاں کے اصول نہیں پتا۔“ ”سی جن نے متشکر لہجے میں کہا۔“

”دیکھو اگر یہاں سچ کر رہنا چاہتے ہو تو ذرا سنبھل کر چننا۔“ ”جی سنگ نے اسے سمجھایا تو تی من سن آ نکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے اس نے ہاتھ شاور

خونفاک کہانیاں 133 اپریل 2018ء



لیا اور پھر اسکول یونیفارم پہن کر تیار ہو گیا۔

اس کے پاس اب ناشہ کرنے کا وقت بھی نہیں بچا تھا۔ لڑکوں نے اس سے کہا کہ ”اس نے اٹھنے میں ویسے ہی بہت دیر کر دی ہے اگر وہ سزا سے بچنا چاہتا ہے تو جلدی سے گراؤنڈ میں ورزش کرنے پہنچے۔“ وہ جلدی جلدی گراؤنڈ میں پہنچا ادا کھنڈہ یونٹی سب کو ورزش میں گزر گیا۔ پھر سارے لڑکے اپنی کلاسز میں چلے گئے تی من بھی ان تینوں کے ساتھ اپنی کلاس میں پہنچا اس کی سیٹ اتفاق سے سی جن کے آگے ہی تھی۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔

پہلا پریڈ شروع ہوا ہن ہونا نامی ٹیچر اندر چلے آئے ان کے اندر آتے ہی پوری کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ ”گڈ مارننگ اسٹوڈنٹس“ انہوں نے بارعب آواز میں کہا۔

”تو ایسا ہے کہ یہاں آج ایک نیا چہرہ بھی ہمارے بیچ موجود ہے۔“ تی من غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ایسے حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو لڑکے میں تمہاری ہی بات کر رہا ہوں۔ اٹھ اپنی جگہ سے ادا آؤ اور اپنا تعارف کراؤ۔“ انہوں نے حکم دیا تو تی من خاموشی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے برابر پوری کلاس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”میرا نام تی من ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

”اور یہ بھی تو بتاؤ کہ تم یہاں کیوں لائے گئے ہو۔“ ہن ہونے طوفی اس کی طرف دیکھا۔

تی من پہلے تو تھوڑا حیران ہوا پھر اس کی نظر دونگ وپر پڑی وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھ داری سے کام لینے کا اشارہ کر رہا تھا۔

”میں تمام پیرز میں فیل ہو گیا تھا اس لئے میرے والدین نے مجھے یہاں داخل کرایا ہے کیونکہ یہ اسکول بہت اچھا ہے تاکہ یہاں رہ کر میں اچھی طرح پڑھ سکوں۔“ تی من نے قدرے بھولپن سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم واپس اپنی جگہ پر بیٹھ سکتے ہو۔“ ٹیچر ہن ہونے کہا تو تی من شرمندہ شرمندہ سا اپنی جگہ واپس جا کر بیٹھ گیا۔

پوری کلاس خاموش تھی کسی کے سانس تک لینے کی آواز نہیں آ رہی تھی پھر کچھ دیر یونٹی پڑھائی میں گزر گئی۔ ٹیچر ہن ہو بورڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور پوری کلاس اس طرف متوجہ تھی سوائے تی من کے وہ کھڑکی میں سے باہر سوئمنگ پول کو دیکھ رہا تھا۔ ٹیچر نے ایک دو بار اس کا نام لیا لیکن جب وہ متوجہ نہ ہوا تو وہ خود اس کے پاس چلے آئے۔ تی من اب بھی سوئمنگ پول کی طرف دیکھ رہا تھا ہن ہونے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

”کوہر دھیان ہے تمہارا لڑکے، میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ اب تو تی من پٹپٹا گیا اس بے چارے کو واقعی ان کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی تھی۔

”کیا کر رہے تھے؟“

”کچھ نہیں۔“ تی من نے پھکلاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا گریبان اب بھی ان کے ہاتھوں میں تھا۔

”تم کھڑکی سے باہر سوئمنگ پول دیکھ رہے تھے ہے نا۔“

”جی جی..... وہ تمہیں اچھا لگتا ہے۔“

”جی۔“ تی من نے ایک بار پھر مصحوبیت سے جواب دیا۔

”چلو آؤ باہر جا کر تمہیں اس کی سیر کراتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے تی من کو کھینچ کر کھڑا کیا اور اسے کلاس سے باہر لے گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی کلاس میں شور مچا گیا۔

”ارے نہیں بے چارہ تی من مارا گیا۔“ یہ جی سنگ کی آواز تھی۔ پھر اچانک ہی سی جن نے سب کا دھیان کھڑکی کے باہر سوئمنگ پول کی طرف دلایا۔ ”وہ دیکھو وہ رہائی من۔“ اس نے کہا۔ ٹیچر ہن ہوئی تی من کو لئے سوئمنگ پول کی طرف بڑھ رہے تھے وہاں لے جا کر وہ اسے سوئمنگ پول میں دھکا دینے لگے۔ تب ہی تی من حیرت سے چلا پڑا۔

”سریہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”تم ہوتے کون ہو مجھ سے یہ پوچھنے والے۔“ بہت پسند ہے ناں تمہیں سوئمنگ پول تو جاؤ مڑے کرو۔“ اتنا کہہ کر ٹیچر ہن ہونے اسے پانی میں دھکیل دیا۔ وہ بے چارہ اتنی ٹھنڈ میں نہ پانی میں گرتے ہی غوطہ کھڑا ہو گیا۔

”مڑے کر لئے ہوں تو باہر آ جاؤ۔“ انہوں نے کہا تو بے چارہ تی من سردی سے کانپتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ اسے لے کر واپس کلاس میں آگے اور اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ بے چارہ تی من سر سے پیر تک ہچکچا ہوا تھا۔

”جب یہ پریڈ ختم ہو جائے تو جا کر کپڑے چھین کر لیا۔“ انہوں نے سختی سے جواب دیا۔ تی من نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ بے چارہ سارا پریڈ سردی سے کانپتا رہا۔ سی جن نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہل دیئے کے لئے اپنا ہاتھ رکھا۔ جب پریڈ ختم ہوا اور ٹیچر ہن ہو ہانچکے جی سنگ جھٹ سے بولا۔

”دیکھ لیا کیسے جلا دیں یہاں کے ٹیچر، چھوٹی

ہوئی بات پر سزا دیتے ہیں۔“

”میں کپڑے چھین کر کے آتا ہوں۔“ تی من نے کہا اور پیچھے کرنے چلا گیا۔ وہ واقعی حیران پریشان تھا کہ یہ اسکول ہے یا جیل۔ یہ اسکول تو اس کی توقع سے بھی کچھ کہیں زیادہ خراب لگتا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے والدین نے اس اسکول میں ایسی کیا خوبی بھی جو اسے یہاں ڈالوایا۔ انہیں آخر کیوں ایسا لگا کہ اس کے بہتر مستقبل کے لئے یہ اسکول اچھا رہے گا۔ کیا وہ اس سے پیار نہیں کرتے؟ لیکن نہیں بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے وہ دونوں تو دنیا کے سب سے اچھے ماں باپ ہیں۔

”من نے خود کو ٹولی دی اور پھر اس نے سوچا کہ وہ فون اپنے نام ڈیڈ کو اس سب کے بارے میں بتائے گا۔“

اگلے روز تی من صبح وقت براٹھ گیا۔ ہاٹ شارڈ کے بعد اس نے بیچ روم میں ناشہ کیا۔ ”آج کے دن بہت سنبھل کے رہوں گا کوئی ایسا کام نہیں کروں گا کہ پر ٹیچر مجھے سزا دیں۔“ تی من نے تینوں لڑکوں سے۔

”چاہے جتنا مرضی بیچ کے رہ لو سزا تو تب بھی تمہیں مل کر ہی رہے گی۔“ جی سنگ نے کہا۔

”یہ درست کہہ رہا ہے یہاں کے اصول تو تم نے دیکھ ہی لئے ہیں۔“ کتنے انوکھے ہیں۔“ دونگ وونے کہا۔

”ہاں یہ بات بھی ہے۔“ تی من نے کہا۔ لیکن اس بے چارے کو خبر نہ تھی کہ اس کی ساری کوششیں ناکام جانے والی ہیں۔ ناشہ کے کچھ ہی دیر بعد جب سارے لڑکے ورزش کرنے گراؤنڈ میں پہنچے تو اچانک ورزش کرتے کرتے تی من کے جوتے کھل گئے وہ انہیں باندھنے کے لئے جیسے ہی جھکا ورزش کے ٹیچر من جن نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ”اسے لڑکے ادھر آؤ کیا نام ہے تمہارا؟“ انہوں نے رعب سے پوچھا۔

تی من نے اپنا نام بتایا اور ان کے پاس چلا گیا۔

”جب تم سے ورزش کرنے کو کہا گیا تو تم اپنے جوتوں کے ساتھ کیوں کھیل رہے تھے۔“ من جن نے ڈانٹ کر پوچھا۔

”نہیں سر وہ میرے جوتے کھل گئے تھے۔“ تی من بری طرح بولکھلایا۔ ”اب جو کرنا وہ وہاں جا کے کرنا۔“ اتنا کہہ کر ٹیچر من جن نے اسے بازو سے پکڑا اور اسی جگہ لے آئے جہاں وہی سلاخوں کے دروازے والا کمرہ تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور اسے اندر بند کر دیا تی من اپنا سامان لے کر رہ گیا ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد وہ اس کمرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ تب ہی اس کی نظر فرش پر پڑ گئی والے لال بیگ پر پڑی وہ ایک دم ہی گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ لال بیگ اور دوسرے کپڑے کموڑوں سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک بار پھر یہ سوچ کر پریشان ہونے لگا کہ آخر اس کے ماں ڈیڈ نے اسے اس اسکول میں کیوں داخل کر دیا۔ کیا انہیں پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ یہ اسکول کتنا خراب ہے۔ یا انہیں معلوم تھا؟ وہ جانتے تھے؟ لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وہ یہاں اسٹوڈنٹس کے ساتھ کئے جانے والے سلوک سے بالکل انجان ہیں۔ ورنہ میں تو ان کا اپنا پیارا بیٹا ہوں وہ میرا برا بھی نہیں چاہیں گے۔

سوچتے سوچتے قی من کی نظریں باہر کچھ فاصلے پر بنے  
پشیمت روم پر پڑیں۔ اور وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا  
کہ آخراں سزاوانے کمرے کا معرکہ کیا ہے آخر کیوں جن  
سوتے خود کشی کی اور اس کی روح اس کمرے میں قید کیوں  
ہے؟ اور اس کے مرنے کے بعد لاوان نے ایسا کیا دیکھا  
کہ اپنا قاضی تو ازان کھو بیٹھا۔ وہ ضرور ایک روز ان سارے  
رازوں پر سے پردہ اٹھاے گا۔ وہ ایک ایک راز فاش  
کر کے رہے گا۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ سچر، جن جن  
نے آخر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک دم ہی اپنی  
سوچ کے پردے سے باہر نکلا۔

”چلو اب کلاس میں تمہاری سزا پوری ہوئی  
۔“ انہوں نے کہا تو قی من ان کے پیچھے اپنی کلاس میں  
چل دیا۔  
ابھی ایک ہی پریڈ گزارا ہوگا کہ دوسرے ٹیچر بیون  
وہ اپنی کلاس لینے چلے آئے۔ انہوں نے آتے ہی قی  
من کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا اور پھر بولے۔  
”قی من، میں نے سنا ہے کہ آج پھر تمہیں  
ورزش کے وقت سزا ملی۔ آخر تم آتے ہی ان سب کے  
ریکارڈز کیوں توڑ رہے ہو۔“ انہوں نے باقی لڑکوں کی  
طرف طنز یہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا ہے سر۔ مجھے یونہی خواہ  
مخوا چھوٹی چھوٹی بات پر سزا دی جا رہی ہے۔ اور وہ بھی  
اتنی سخت۔“ قی من روٹھے روٹھے لہجے میں بولا تو بیون  
وہ تو جیسے غصے سے ہلکی سی ہنسی ہو گئے۔  
”کیا کہا لڑکے ذرا پھر سے کہہ کر دکھانا میں  
تمہاری زبان سمجھ لوں۔“ اتنا کہتے ہی وہ اپنی جگہ سے  
اٹھے اور نزدیک پہنچ کر قی من کو گرجان سے پکڑ لیا۔  
پھر گرج کر بولے۔ ”سخت سزا تو تمہیں ابھی  
بکلی ہی نہیں ہے۔ میں بتانا ہوں کہ کسے کہتے ہیں سخت  
سزا۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے ہاتھ میں پکڑی لکڑی کی  
انک سے قی من کو بری طرح پیشنا شروع کر دیا وہ بے  
چارہ اف اف کرتا رہ گیا۔ جی تنگ ہی جن اور دو ٹک دو  
اپنا سر پکڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ جب بھی ایسی

صورتحال ہوتی تو پوری کلاس میں سناٹا چھا جاتا۔ اس  
دقت بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا۔ جب وہ اسے مار مار کر اپنا  
جنون اس پر اتار چکے تو تھک کر واپس اپنی کرسی پر  
جا کر بیٹھ گئے۔  
”بے ہودہ تہذیب لڑکا ہو نہ۔“ وہ غصے سے لٹائی کی  
ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولے۔  
قی من سخت پریشان تھا اس نے تو سوچا تھا کہ سزا  
سے زیادہ سے زیادہ بچے گا۔ لیکن اسے تو ساری سزائیں  
آج ہی مل رہی تھیں۔ ہاف بریک کے وقت قی من  
بہت بے چین ہو رہا تھا اس اسکول میں نہ فی وی کی  
سہولت تھی نہ کوئی کہانی کی کتاب پڑھنے کی اجازت تھی نہ  
ہی ویڈیو گیمز نہ ہی ایمر کی تھری کچھ بھی تو نہیں تھا یہاں وہ  
بری طرح بور بور رہا تھا کھر پر وہ وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہی  
رہتا تھا لیکن یہاں تو ان لوگوں نے قید کر کے  
رکھا ہوا تھا۔ اس سے مزید صبر نہ ہوا تو وہ سزاوانے کمرے  
کا راز جاننے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ پہلے وہ پشیمت روم  
کے باہر پہنچا تاں لکڑیوں کا جلا کر دیکھا لیکن وہ بہت بھاری  
اور مضبوط تالا تھا۔ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والا نہیں تھا۔  
اس نے اسے توڑنے کے لئے آس پاس میں کوئی چیز  
تلاش کی لیکن کچھ نہ ملا۔  
مجبوراً اس نے اسکول کے باہر لان میں سے  
ایک بڑا اور بھاری پتھر اٹھایا اور اسے لے کر واپس  
اندرا سی جگہ آ گیا۔ پہلے اس نے اوپر اوپر دیکھا جب تکلی  
ہو گئی کہ آس پاس کوئی نہیں ہے تو اس نے پتھر کو زور سے  
تالے پر دے مارا۔ زور کی آواز پیدا ہوئی۔ لیکن تالا نہ  
ٹوٹا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی چند دفعہ کی کوشش سے  
تالا ٹوٹ ہی گیا۔ قی من نے پتھر ایک طرف پھینکا ہاتھ  
جھاڑے اور دھیرے سے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔  
دروازہ جھڑکی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ قی من نے  
کمرے میں قدم رکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اتنے عرصے  
سے یہ کمرہ بند ہے یہاں تو بید ہوئی ہوگی لیکن وہاں  
تو عجیب قسم کی بڑی پیاری خوشبو آ رہی تھی قی من کمرے  
کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں مختلف سامان فرنیچر وغیرہ

اور کمرے کے بیچ میں ایک لکڑی کی کرسی گری ہوئی تھی  
اس کے اوپر قی من نے نگاہ کی تو سناٹے میں آ گیا۔  
چھت پر ایک بچائی کا پھندہ لٹک رہا تھا قی من  
سوچ میں پڑ گیا کہ کیا یہی وہ بچائی کا پھندا ہے جس  
پر اس لڑکے نے خود کو لٹکا تھا ابھی وہ کمرے کا مزید جائزہ  
لے رہا تھا کہ اسے کمرے کے باہر سے کسی لڑکے کے بولنے کی  
آواز سنائی دی۔  
”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔ تم یہاں کیا  
کر رہے ہو؟“

قی من نے اپنی چوری پکڑے جانے کے ڈر  
لے وہاں دیکھا تو قی من کی طرح ایک سیدھا سادہ معصوم سا  
لڑکا کمرے کے باہر کھڑا اسے باہر مل رہا تھا۔  
”وہ..... وہ..... دراصل میں دیکھ رہا تھا کہ اس  
کمرے میں کیا ہے۔“ قی من نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔  
”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم کیا کر رہے  
تھے۔ لیکن تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اگر کسی کو پتا  
چل گیا تو بڑی لکڑی سزا ہو جائے گی۔“ اس لڑکے نے  
کہا۔

”ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو لیکن تم تو کسی کو اس  
کمرے میں کچھ نہیں بتاؤ گے نا؟“ قی من نے ایک دم  
کھبرا کر پوچھا۔  
”بے شک نہیں..... بالکل نہیں کبھی نہیں  
کہو یہ بھی میں تمہیں اتنا برا لگتا ہوں کیا..... میں تو خود  
اس کے نظام سے تنگ ہوں۔“ اس لڑکے نے کہا۔  
”تمہارا نام کیا ہے؟“ قی من نے پوچھا۔  
”ہنگ جن۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا اور قی  
من سے ہاتھ ملایا اس نے بھی اپنا نام بتایا اور خوشی اس  
کے ہاتھ ملایا۔

”سنا ہے کہ جن سونے یہاں خود کشی کر لی تھی؟“  
قی من نے ہنگ جن کو بتایا۔  
”اس نے خود کشی نہیں کی تھی۔ اسے مارا گیا تھا۔“  
جن نے انکشاف کیا۔  
”مارا گیا تھا لیکن کس نے مارا۔“ قی من حیرت

سے اچھل پڑا۔  
”یہ بات تو ایک معمہ ہے لیکن اس کے مرنے  
کے بعد جن سو کی روح بے قابو ہو گئی اور وہ پورے اسکول  
میں راج کرنے لگی۔ اساتذہ کے کام بگاڑنے لگی۔ تب  
ہی اساتذہ نے منتہر پڑھ کر اس کی روح کو یہاں قید کر دیا  
اور رہی بات لاوان کی تو اس نے روح کو بھیا تک روپ  
میں دیکھ لیا تھا اس لئے وہ اپنا قاضی تو ازان کھو بیٹھا۔“ ہنگ  
جن نے بتایا۔  
”کیا واقعی؟“ قی من نے حیرت سے پوچھا۔  
”ہاں واقعی..... اب چلو یہاں سے چلتے ہیں کسی  
نے دیکھ لیا تو خیر نہیں ہماری۔“ ہنگ جن نے کہا تو قی من  
بھی وہاں سے چل دیا۔  
بریک کا وقت ختم ہوا تو تمام لڑکے اپنی کلاسوں  
میں واپس آ گئے پر پیل گن ہو کلاس کا راونڈ لینے آئے  
ہوئے تھے۔ ان کے چہرے سے شدید غصہ اور خوف  
جھلک رہا تھا۔ ”تم میں سے کس کم بخت نے سزا کے  
کمرے کا دروازہ کھولا۔“ انہوں نے غصے سے کپکپاتی  
آواز میں پوچھا۔

یہ سنتے ہی پوری کلاس میں سرگوشیاں سی ہونے  
لگیں کیونکہ کسی کی بھی توقع میں ایسی بات ہرگز نہیں تھی  
کہ آج ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔  
”میں پوچھتا ہوں کس کم بخت نے وہ تالا توڑا۔“  
”ہم نے نہیں توڑا سر..... ہم تو وہاں جاتے بھی  
نہیں۔“ سب لڑکوں نے فوراً سے کہا۔  
”ہاں نہیں جاتے لیکن آج وہاں کوئی گیا ہے  
..... شرافت سے بتاؤ کہ یہ کام کس کا ہے ورنہ بہت برا  
ہوگا۔“ تمام لڑکے سہجے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے  
رہے۔  
”ٹھیک ہے تو پھر سزا سب کو ملے گی۔ اسی وقت  
سارے لڑکی سو تنگ پول کے ٹھنڈے پانی میں چھلانگ  
لگائیں جا کر اور پانچ منٹ سے پہلے کوئی باہر نہیں آئے  
گا۔“ پیل گن ہونے لگا کہ تو سارے لڑکے اپنی سزا  
پوری کرنے چلے گئے۔ قی من کو اپنی جگہ سے سب کو سزا

ملتا دیکھتا برا تو لگ رہا تھا لیکن پرنسپل صاحب کے سامنے جج بولنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

اس رات فی من نے اپنے گھر فون ملایا۔ تین بارنیل بچنے پر اس کے ڈیڈے نے فون اٹھایا۔

”ہیلو؟“ انہوں نے کہا۔

”ہیلو ڈیڈے میں فی من بات کر رہا ہوں۔“ فی من بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”اور سناؤ بڑھائی کسی چل رہی ہے۔ کچھ سیکھا وہاں جا کے یا بس یونیورسٹی گھر کی طرح فارغ بیٹھے ہو۔“ ان کے لہجے میں اپنے بیٹے فی من کی آواز سن کر کسی قسم کی کوئی خوشی نہیں تھی۔

”ڈیڈے آپ تصور نہیں کر سکتے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہاں کا نظام بے حد خراب ہے معمولی سی بات پر سخت سزا میں دی جاتی ہیں مجھے آج خواتین بارسز ملی ہے۔“ فی من نے جلدی جلدی بتایا۔

”کیا کہا؟ تین بارسز ملی ہے۔ شرم آنی چاہئے تمہیں ایسا کیا کر دیا تم نے کہ تمہیں ایک ہی دن میں تین بارسز مل گئی ہو سدا جاتی من اتنی ڈھٹائی اچھی نہیں ہوتی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے وہاں جا کر بھی کچھ نہیں سیکھا میرا تو خیال تھا جب میرا بیٹا وہاں سے پڑھ کر نکلے گا تو ایک نیا من بن چکا ہوگا۔ لیکن تم تو.....“

اف بس بہت ہو گیا..... میں پرنسپل سے بات کروں گا کہ تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئیں اور ایک بات اور سن لو آئندہ مجھے تمہاری طرف سے کوئی شکایت نہ سننے کو ملے۔“ انہوں نے سختی سے کہا۔

”لیکن ڈیڈے میری بات تو سنیں۔“ فی من نے التجا یہ لہجہ میں کیا۔

”لیکن وہیں کچھ نہیں۔ میں مزید تمہاری کوئی بکواس نہیں سن رہا۔ مجھے پہلے ہی تمہاری باتیں سن کر سر درد ہو گیا ہے اب تم سو جاؤ اور مجھے سونے دو۔“

”ڈیڈے پلیز ایڈیو بتا دیں کہ کام کیسی ہیں؟“ فی من نے بے قراری سے بولا۔

”وہ بالکل ٹھیک ہیں..... یہیں پاس بیٹھی ہیں۔

تمہیں ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ڈیڈے نے لاپرواہی سے کہا۔

”پلیز کیا میں ان سے بات کر سکتا ہوں۔“ فی من نے ایک بار پھر التجا یہ لہجہ میں کہا۔

”ہاں کر سکتے ہو یہ لو کرو۔“ اتنا کہہ کر ڈیڈے نے فون فی من کی ہام کو تھما دیا۔

”ہیلو فی من..... مام آپ کیسی ہیں میں آپ کو بہت یاد کرتا ہوں۔“ فی من نے مصمومیت سے کہا۔

”ہاں ہاں بہم بھی تمہیں یاد کرتے ہیں لیکن یہ میں کیساں رہی ہوں ڈیڈے کہہ رہے ہیں تمہیں آج تین بارسز مل گئی ہیں..... تم وہیں سے کام کیوں نہیں کرتے۔ بہت دل دکھایا ہے تم نے میرا۔“ انہوں نے ایک ہی سانس میں غصے سے کہا۔

”مام پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔ میں آئندہ خیال رکھوں گا۔“ فی من نے اداس لہجے میں کہا۔

”ایسا کرو اب تم سو جاؤ میں اور تمہارے ڈیڈے بھی مووی دیکھ کر سونے کے لئے لیٹ رہے ہیں۔“ اتنا کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے لائن کاٹ دی۔ فی من بیوا ہیلو کرتا رہ گیا۔

بہر حال اس نے ریسور واپس کریڈل پر رکھا اور اپنے کمرے کی طرف سونے کے خیال سے چل دیا وہاں پہنچا تو تینوں لڑکے اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

”ہاں کیا بنا بات ہوئی گھر والوں سے؟“ سی جن نے پوچھا۔

”ہاں ہو گئی۔“ فی من نے آہستگی سے جواب دیا۔

”کیا کہہ رہے ہیں وہ لوگ؟“ دوگ دو نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر دریافت کیا۔

”کچھ بھی نہیں وہ ناراض ہیں ابھی بھی..... اور میں نے یہ بتا کر کہ آج مجھے تین بارسز مل گئی ہیں۔“

”مزید ناراض کر دیا۔“ فی من نے بستر پر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں ایک دن تو مان جائیں گے۔“ جی سنگ نے اسے اداس دیکھ کر تسلی دی۔

فی من خاموشی سے بستر پر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ باقی تینوں لڑکے بھی لاش آف کر کے سونے کے لئے لیٹ گئے۔

رات کا نامعلوم کون سا پہر تھا جب دوگ دو کی آنکھ کسی کے کراہنے کی آواز سے کھلی۔ وہ نیند میں آ نکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”جن سو مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی بہت بڑی غلطی ہو گئی۔“ کمرے کے باہر سے لا اون کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”نن نہیں جن سو نہیں رک جاؤ۔“ اور پھر بارہ تیز قدموں کی آواز سنائی دی شاید لا اون بھاگ رہا تھا دوگ دو کو تحس ہوا وہ یہ تو جانتا ہی تھا کہ آج کسی سر پھرے لڑکے نے سزا کے کمرے کا تالا توڑ ڈالا ہے۔ اس نے جلدی جلدی بستر سے اتر کر چیل پیروں میں پہنی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے لا اون تیزی سے بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن نامعلوم وہ کس چیز سے ڈر رہا تھا وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ تب ہی اسے دیوار پر کسی کا سایہ نظر آیا جو سسٹل لا اون کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ دوگ دو نے منظور دیکھ کر بری طرح ہنسا گیا اور واپس کمرے میں چلا آیا اور دروازہ اچھی طرح سے بند کر دیا۔ پھر اس نے فی من کو بخیر کرنا دیا۔

”فی من فی من جلدی اٹھو۔“ وہ بدحواسی کے عالم میں بولا۔

”کیا ہوا..... سب ٹھیک تو ہے ناں۔“ فی من نے نیند سے جاگتے ہوئے پوچھا۔

”رو..... روح..... باہر جن سو کی روح ہے۔“ دوگ دو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آرام سے تمہیں ہو کیا گیا ہے..... کیا دیکھ لیا تم نے.....“

”آرام جن سو کی آتما دوگ دو نے ہی ایک رٹ لگا رکھی تھی۔“ ان کی آوازیں سن کر جی سنگ اور سی جن بھی نیند سے بیدار ہو گئے۔

”کیا ہوا؟ کیا مصیبت ہے سارا دن اسکول میں

خوار ہوتے ہیں رات کو بھی سونے نہ دو تم۔“ جی سنگ بے زار لہجے میں بولا۔

”یہ سونے کا وقت نہیں ہے..... جن سو کی روح۔“ آزاد ہو گئی ہے۔ نچانے کون کم بخت تھا وہ جس نے سزا کے کمرے کا دروازہ کھول ڈالا۔“ دوگ دو نے کہا۔

”دوگ دو پلیز شانت ہو جاؤ۔“

”سزا کے کمرے کا دروازہ میں نے کھولا تھا۔“ فی من کے اس انکشاف پر تینوں لڑکے اپنی جگہ سے اچھل بی تو پڑے۔

”فی من تمہارا دماغ پھر گیا تھا کیا؟“ سی جن نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔

جبکہ جی سنگ کو چپ لگ گئی اور دوسری طرف دوگ دو سیدھے ہاتھ کی انگلیاں منہ میں کاٹتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

”کیا کر دیا تم نے یار..... اب جن سو کی روح ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑے گی۔“

”دوستو! پلیز شانت ہو جاؤ اور میری بات سنو میں آج تم لوگوں کو اس بارے میں بتانے ہی والا تھا لیکن مام ڈیڈے سے فون پر بات کرنے کے بعد میں انتخاب سیٹ ہو گیا کہ مزید کوئی بات کہنے بنا ہی سونے کے لئے لیٹ گیا۔ دیکھو میری بات سنو لا اون تو بے چارہ بالکل ہے اس بے چارے کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کرتا لیکن تم لوگ تو اس طرح مت ڈرو۔ وہ تو پہلے ہی جن سو کی روح سے ڈرتا تھا۔ اور اب یہ بات جاننے کے بعد کہ اس کمرے کا دروازہ کھل گیا ہے تو وہ مزید ڈر گیا ہے کہ جہاں اتنے سالوں سے جن سو کی روح قید میں اب دروازہ کھلنے سے آزاد ہو گئی ہے۔ تم لوگ پلیز پریشان نہ ہو سو جاؤ۔ بے فکر ہو کے دیکھنا کل تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہونہ..... ٹھیک ہو جائے گا تمہیں تو میں چھوڑوں گا نہیں۔“ فی من، دوگ دو بڑبڑایا تا ہوا سونے کے لئے لیٹ گیا۔

فی من کے سمجھانے پر باقی سب بھی سونے کے لئے لیٹ گئے۔



اگلے روز صبح تی من نے اٹھتے ہی معمول کے مطابق ہاتھ شاور لیا اور پھر کچھ روم میں ناشتہ کرنے پہنچا پھر خاموشی سے ورزش کرنے کے بعد وہ جی سبک، سی جن اور دو دو گ دو ابھی کلاس کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ انہیں سزا کے کمرے کے باہر لڑکوں کا جھوم نظر آیا اور عجیب افراتفریح کا عالم تھا۔ کافی شور سننے میں آ رہا تھا۔ تی من جھوم میں راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھا اور سزا والے کمرے کے سامنے جا کر روک گیا۔ نظروں کے عین سامنے کمرے کے بیچوں بیچ لا اون کی لاش پھائی کے پسند سے لٹکی ہوئی تھی۔

تی من کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کمرے میں پرنسپل گمن ہوسیت تمام اساتذہ موجود تھے۔ خاموشی کے ساتھ لا اون کی لاش کو نیچے اتارا گیا۔ اور پھر پرنسپل صاحب کے کہنے پر اسے اسکول کے باہر بے لان میں زمین کھود کر دفن دیا گیا۔ انہوں نے تابوت وغیرہ کا بھی کوئی بندوبست نہیں کیا۔

”یونہی اس کی لاش کو ٹی تلو دبا دیا۔“ تمام لڑکے اسکول کے لان میں لا اون کے جنازے میں شریک خاموش کھڑے تھے۔ پرنسپل گمن ہو کر بالکل چپ لگ گئی تھی۔ آج کے دن کے لئے پڑھائی بھی کینسل کر دی گئی تھی۔ تمام لڑکوں کو ان کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔

تی من اپنے دوستوں کے ساتھ واپس کمرے میں پہنچا تو کافی پریشان لگ رہا تھا۔ تینوں دوست بھی اس سے کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ وہ اس سے الگ الگ ہو کر بیٹھ گئے۔ تی من نے یہ دیکھا تو پریشان ہو گیا۔

”دوستو! پلیز میری بات سنو میں جانتا ہوں تم سب لا اون کی موت کا ذمہ دار مجھے سمجھتے ہو لیکن یقین جانو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ تی من نے کہا۔

”ہاں ہاں تم تو بڑے بھولے ہو۔“ جی سنگ نے ناراضگی سے کہا۔

”آخر تمہیں پڑی کیا تھی سزا والے کمرے کا

دروازہ کھولنے کی۔“ سی جن نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی ہے لیکن میرا یقین کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ تی من نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یونہی..... کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر مرنا ہی تھا تو پرنسپل گمن ہو کیوں ناں مر گئے۔ ہر وقت نظر بنے پھرتے ہیں۔“ جی سنگ نے منہ بسور کر کہا تو تی من نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”مطلب یہ کہ یہاں کے اساتذہ اتنے برے ہیں اگر یہی ہی مر جائیں تو بڑا مزہ آئے۔ ہمارے ہیرو تو تم تب بنو گے۔ ابھی تم نے تالا توڑ کر کوئی کمال نہیں کیا۔ ان جلا دوں سے ہماری جان چھڑاؤ تو بات ہے۔ جی سنگ مسکراتے ہوئے بولا تو دو دو گ دو اور سی جن بھی مسکرا دیے۔ جبکہ تی من نا بھیجی کے عالم میں اپنا سر کھجاتا رہ گیا۔

اس رات دو دو گ دو کی نیند سے آنکھ کھلی تو اسے ٹیچر بن جن کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

”نن نہیں جن سو میری بات سنو میں مانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ لیکن پلیز مجھے معاف کر دو۔“ اور پھر بن جن کے بھاٹنے کی آواز سنائی دی۔

دو دو گ دو بری طرح ڈر گیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ خاموشی کے ساتھ دوبارہ سو جائے لیکن پھر رہا نہ گیا تو پچھلی رات کی طرح تی من کو بخود دکر اٹھا ڈالا۔

”تی من جلدی اٹھو جن سو کی روح پھر آگئی ہے۔“

تی من فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”سنگ کیا ہوا؟“ تی من نے گھبرا کر پوچھا تو دو دو گ دو نے اسے ٹیچر بن جن کے بولنے کی آواز کے بارے میں بتایا۔

”کچھ کرو تی من یا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”دو دو گ دو گھکھایا۔“

”تم گھبراؤ مت اور ایسا کرو کہ بے فکر ہو کے سونے کے لئے لیٹ جاؤ۔ تم دیکھنا صبح سب ٹھیک ہوگا۔“ تی من نے تسلی دی۔

”اے یار کیسے ٹھیک ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں ان دونوں کو بھی اٹھا دیتے ہیں۔“ دو دو گ دو سہے ہوئے لیجے میں بولا۔

”نہیں نہیں ان دونوں کو سونے دو اور تم بھی سو جاؤ میرا یقین کرو کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ تی من نے تسلی دی۔

”ٹھیک ہے لیکن آج رات میں تمہارے ساتھ سوؤں گا۔ ہٹو مجھے جگہ دو اپنے بستر پر۔“ اتنا کہہ کر دو دو گ دو نے اپنے بستر پر سے نکل اٹھا یا اور تی من کے بستر میں گھس گیا۔ تی من بھی بے چارہ خاموشی کے ساتھ لیٹ گیا۔

ساری رات دو دو گ دو کی گھبرا کر آنکھ کھلتی رہی اور وہ بار بار تی من کے ساتھ چٹ جاتا۔

اگلے روز چاروں لڑکے جب ورزش کرنے گراؤنڈ میں جمع ہوئے تو ٹیچر بن جن ابھی تک نہیں آئے تھے۔ دو دو گ دو نے گھبرا کر تی من کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میں تمہیں بتا رہا ہوں آج ٹیچر بن جن نہیں آئیں گے۔ تم دیکھ لینا۔“

”افو ہو..... کیوں فضول کی بات کر رہے ہو وہ آگئی آتے ہی ہوں گے۔“ تی من نے تسلی دی۔

لیکن پانچ منٹ، دس منٹ اور پھر پورے پندرہ منٹ گزر جانے پر پرنسپل گمن ہونے تی من کو بھیجا کہ باکرہ دیکھ کر آئے کہ ٹیچر بن جن کہاں رہ گئے۔ تی من اٹھتا میں سر ہلاتا ہوا ٹیچر بن جن کو دیکھنے چلا گیا۔

اس نے پورا اسکول چھان مارا لیکن وہ کہیں نہ ملے سب سے آخر میں وہ سزا والے کمرے کی طرف آیا تو اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر گرتے گرتے بچا۔

سامنے پھائی کے پسند سے پرنسپل گمن جن کی لٹکی ہوئی تھی۔

بے اختیار اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا

اور اٹنے قدموں واپس بھاگا۔ وہ ہانپتا کانپتا گراؤنڈ تک پہنچا۔

”پرنسپل صاحب..... وہ ٹیچر بن جن سزا والے کمرے میں..... وہ مر گئے ہیں۔“ تی من نے ہانپتے ہوئے کہا۔

پرنسپل گمن ہو کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ دوڑتے ہوئے سزا والے کمرے کی طرف بھاگے تمام لڑکے بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑے یہ دیکھنے کے لئے کہ اب کیا نئی مصیبت آگئی۔ جب سارے دہاں پہنچے تو پرنسپل گمن ہوا آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے بن جن کی لاش کو لٹکتے ہوئے دیکھا اور پھر پریشانی سے اپنا سر پکڑ لیا۔

پھر کل کی طرح پرنسپل صاحب اور دوسرے ٹیچر نے ان کی لاش نیچے اتاری اور پھر خاموشی کے ساتھ انہیں بھی دفن دیا گیا۔ تمام لڑکوں نے پھر ان کے جنازے میں شرکت کی۔

تی من کو حیرت اس بات کی تھی کہ یہ لوگ اس بارے میں نہ پولیس کو کچھ بتا رہے ہیں اور بس خود ہی لاش کو دفن دیتے ہیں نہ ہی یہ وجہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آخر یہ لوگ خود کو پھانسی پر کیوں لٹکا رہے ہیں۔

اس رات تی من ہاتھ شاور لینے کے بعد سونے کی نیت سے اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا جب ہی اسے پرنسپل گمن ہوئے آفس میں سے کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی۔

اسے تجسس ہوا کہ آخر اتنی رات مجھے کوئی پرنسپل کے آفس میں کیا کر رہا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے وہ آگے بڑھا اور چھپ کر دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکنے لگا۔

سامنے پرنسپل گمن ہو، بیرون دو اور ٹیچر بن جن ہو کر سیوں پر ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ان کے سامنے میز پر موم بتیاں جل رہی تھیں۔

”جن سو کیا تم لوٹ آئے ہو۔“

”ہاں میں لوٹ آیا ہوں۔“ پرنسپل گمن کے

پوچھنے پر ایک لڑکے کی آواز سنائی دی۔

”کک..... کیا تم اپنا بدلہ لینے آئے ہو؟“ پرنسپل نے دوبارہ پوچھا۔

”ہاں میں اپنا بدلہ لینے آیا ہوں..... دوبارہ“ کسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر کمرے میں تیز ہوا چلی اور ساری موم بتیاں بجھ گئیں۔

تی من گھبرا کر واپس اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ سیدھا اپنے بستر میں گھس گیا اور کبل منہ تک اوڑھ لیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر وہ کس کی آواز سنی؟ کیا وہ واقعی جن سو کی آواز تھی؟ اور جن سو کی روح اگر آزاد ہوگئی ہے تو وہ اپنا کون سا بدلہ لینے آئی ہے۔ اور یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔

اور پھر اگلے روز پھر جون وکی لاش سزا والے کمرے میں چھت سے لگتی ہوئی ملی۔ اور اس سے اگلے روز پھر جن ہوئی بھی ٹھیک اسی طرح سوت واقع ہوگئی اب تک پورے اسکول میں بہت زیادہ خوف پھیل گیا تھا۔ پرنسپل من کے چہرے پر جہاں پہلے ہر وقت غصہ رہتا تھا اب خوف کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔

اس روز تی من نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سزا والے کمرے کا معرہ جل کر کے ہی رہے گا اس کے لئے وہ چپکے سے سزا والے کمرے میں پہنچا۔ وہاں اس نے کسی قسم کی کوئی ایسی چیز تلاش کرنا شروع کی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہاں سالوں پہلے ہوا کیا تھا۔

تب ہی اسے کمرے کے ایک کونے میں ایک ڈبچہ کیل کیمرہ نظر آیا۔ اس نے فوراً اسے اٹھا کر دیکھا کیمرہ بند تھا۔ اس نے اس میں سے میموری کارڈ نکال لیا اور اسے احتیاط کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس رات جب سب سو رہے تھے تب تی من نے جی رنگ کا کیمرہ میز پر سے اٹھا لیا اور وہ میموری کارڈ اس کے اندر لگایا۔ اور پھر اس میں بنی ایک ویڈیو دیکھنے لگا۔

ویڈیو میں اس نے دیکھا کہ جن سو کی کسی چھوٹی سی بات پرنسپل من ان کے چھوٹے بھائی لا اون اور

مرنے والے باقی کے تمام اساتذہ جن سو کو پکڑ کر سزا والے کمرے میں لے کر جا رہے ہیں۔ جن سو ان کی منت سماجت کر رہا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

”اس سے غلطی ہوگئی ہے اسے معاف کر دیا جائے۔“ لیکن پرنسپل من ہونے لگے کہ دیا کہ ”ہر غلطی کی سزا ملتی ہے۔“ اور پھر انہوں نے کمرے کے بیچوں بیچ ایک کرسی رکھی اور اس پر جن سو کو کھڑا کیا اور پھانسی کا پھندہ جو اسٹوڈنٹس کو ڈرانے کے لئے رکھا گیا تھا جن سو کے گلے میں ڈال دیا۔

وہ محض اسے ڈرانا چاہتے تھے..... لیکن جن سو کی بد قسمتی کہ اس کے اپنے حیر کی شوکر لگ جانے سے کرسی اپنی جگہ سے گر گئی اور بے چارہ جن سو پھانسی کے پھندے پر لٹکا ہوا رہ گیا۔

پرنسپل صاحب اور باقی اساتذہ نے اسے پہچانا چاہا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ دم توڑ چکا تھا اس کے بعد ویڈیو ختم ہوگئی۔

اب تی من کو اصل بات معلوم ہوگئی تھی کہ جن سو کی موت کے ذمہ دار یہاں کے اساتذہ ہیں اور اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ جن سو وہ لڑکا ہے جو اس دن سزا والے کمرے کا تالا توڑنے پر اسے ملاتھا اور اپنا نام جن سو بتایا تھا۔

اس نے کیمرہ آف کیا میز پر رکھا اور جیسے ہی پلٹ کر دیکھا تو سامنے جن سو کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

”تو تم نے میری اصلیت جان لی۔“ جن سو نے پوچھا۔

”ہاں میں نے سب جان لیا لیکن یہ بتاؤ کہ یہ ویڈیو کس نے بنائی۔“ تی من نے پوچھا۔

”یہ ویڈیو ایک لڑکے نے چھپ کر بنائی تھی لیکن وہ بعد میں اتنا ڈر گیا کہ اس نے یہ کیمرہ وہیں چھپکا اور کسی کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ جن سو نے بتایا۔

”تو تم یہاں اپنا بدلہ لینے آئے ہو؟“ تی من نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

”ہاں میں اپنا بدلہ لینے آیا ہوں۔ تو تم اپنا بدلہ

لے لو۔“ تی من نے کہا تو جن سو بولا۔

”ہاں میں اب وہی کرنے جا رہا ہوں۔“ اور وہ وہاں سے غائب ہو گیا۔

اگلے روز پرنسپل من ہوئی بھی لاش مل گئی۔ پولیس نے تمام لڑکوں کے بیانات نوٹ کر لئے۔ تی من کے پاس سے میموری کارڈ بھی مل گیا جس میں جن سو کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کی ویڈیو بنی ہوئی تھی۔

حکومت کی طرف سے اس اسکول پر پابندی لگ گئی کہ وہاں اسٹوڈنٹس کے ساتھ خراب سلوک کیا جاتا ہے۔ اسکول کی عمارت بھی حکومت کے قبضے میں آ گئی۔

اس دن تی من اپنے گھر میں مام ڈیڈ کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی دادی بھی کھڑی تھیں وہ نہایت طش میں لگ رہی تھیں۔

”شرم آتی ہے مجھے تم دونوں پر کیسے سنگدل ماں باپ ہو تم دونوں۔ تم دونوں اس قابل نہیں ہو کہ تی من کی پرورش کر سکو لہذا آج سے تی من میرے ساتھ رہے گا۔“ ”چلو بیٹائی من اپنا سامان پیک کر دو اور میرے ساتھ میرے گھر چلو۔“ انہوں نے تی من کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مام پلیز! ہم ماننے ہیں ہم سے غلطی ہوئی لیکن پلیز آپ ہمیں تی من سے الگ نہ کریں۔ ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔“ ڈیڈ نے کہا۔

”ہو گیا ہوگا تمہیں اپنی غلطی کا احساس لیکن اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ تی من میرے ساتھ رہے گا۔“ انہوں نے سختی سے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں دادی جو ہوا سو ہوا میں مام اور ڈیڈ کے ساتھ رہنا پسند کروں گا۔“ تی من نے کہا اور اپنے مام ڈیڈ کی سائیڈ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

دادی دھیرے سے مسکرائیں۔

”تم دونوں بہت خوش قسمت ہو کہ تی من تم سے اتنا پیار کرتا ہے ورنہ اگر یہ انکار کر دیتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے میرے ساتھ جانے سے نہیں روک سکتی تھی۔

آئندہ سے تی من کا خاص خیال رکھو اور نہ ہی آئندہ تم دونوں کی طرف سے کسی قسم کی کوئی شکایت سننے کو ملے مجھے۔“ دادی نے وارن کیا۔

”آئندہ ایسا بھی نہیں ہوگا۔“ مام نے تی من کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا تو ڈیڈ نے بھی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تی من بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد کی بات ہے تی من اس وقت کلاس میں اکیلا اپنے ٹیچر کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کسی معمولی سی بات پر اس پر چلا رہے تھے۔

اور پھر انہوں نے اسے مارنے کے لئے اسٹک اٹھائی تب ہی پیچھے سے ایک ڈراؤنی شکل کے لڑکے نے انہیں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”ت..... تم کون ہو؟“ انہوں نے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”میں اس کا بہترین دوست ہوں آئندہ اسے یوں بلا دو جسے سزا دینے کا سوچنا مجھے مت ورنہ بہت برا انجام ہوگا تمہارا۔“ اس لڑکے نے کہا اور ٹیچر کو چھوڑ دیا۔

وہ بری طرح ڈرے اور گھبرائے ہوئے کلاس سے باہر بھاگ گئے۔ ان کے جاتے ہی وہ لڑکا اپنی اچھی شکل میں لوٹ آیا۔ وہ جن سو تھا۔

”جن سو تم یہاں؟“ تی من نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں میں یہاں..... تم میرے سب سے بہترین دوست ہو۔ تم نے مجھے سزا والے کمرے سے آزاد کروایا۔ قید سے رہائی دلائی۔“ جن سو نے پیار سے کہا۔

”اور تم بھی میرے بہترین دوست ہو تم نے بھی مجھے اس اسکول سے نجات دلا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ وہاں رہنا بالکل قید کاٹنے جیسا تھا۔“ تی من نے اس کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔

☆☆

# رقص عروسی

عامر ملک - راولپنڈی

ہم قباکیوں میں بچہ کے زمانے سے یہ قانون رائج ہے کہ جو شخص بھی ہماری کسی عورت کی توہین کرے اسے دورانوں سے زیادہ زندہ نہیں رہنا چاہئے،

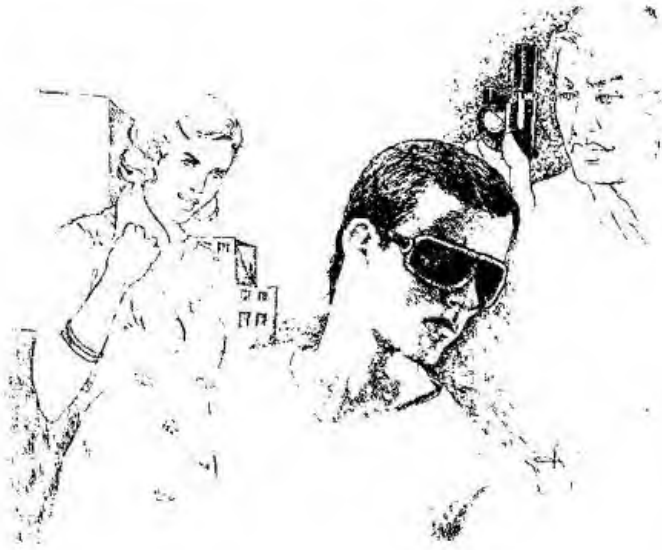
”جارج قرشن“

”اچھا وہ بڑا صاحب جو تیل کی تلاش میں ان پہاڑیوں میں آیا تھا، جی ہاں صاحب مجھے وہ خوب یاد ہے کیونکہ میں بھی تیل کی تلاش میں اس سفر میں اس کا ساتھی تھا جس سے وہ کبھی واپس نہ آیا آپ پوچھتے ہیں اس کا کیا حشر ہوا تو یہ ایک ایسا ہی سوال ہے جس کا صحیح جواب اور کوئی تو کیا میں خود بھی آپ کو بتا نہیں سکتا۔ حالانکہ میں پڑھا لکھا ہوں اور اپنے قبیلے کے دانش مندوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ اس دور دراز علاقے میں اپنی انشورنس کمپنی کی طرف بلسلہ تحقیقات آئے ہیں۔ آپ بڑے صاحب کی موت کے ثبوت کی تلاش میں آئے ہیں تو جناب واقعات کا جہاں تک مجھے علم ہے میں بیان کئے دیتا ہوں یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ ان واقعات کو اس کی موت کے ثبوت کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔“

کہانی کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب بڑا صاحب دریائی کشتی سے ہمارے ساحل پر اتر آئے تو ذاتی طور پر اسے جانتے ہوں مگر مجھے اس کا حلیہ اچھی طرح یاد ہے وہ بڑا لمبا چوڑا تنومند انگریز تھا آنکھیں انگاروں کی طرح دھبکی ہوئی، آواز میں بادلوں کی سی گرج اور لہجہ ایسا توہین آمیز جیسے وہ کسی آزاد پہاڑی قباکیوں سے نہیں بلکہ کنوئیں سے مخاطب ہو۔ ہم

پہاڑی لوگ ٹھنڈے مزاج اور حیرت انگیز صبر و تحمل کے مالک لوگ ہیں اور غیر ملکی لوگ عموماً کبھی غلطی کر کے نقصان اٹھاتے ہیں کہ وہ ہمارے صبر و برداشت کو ہماری بزدلی اور کم ہمتی سمجھ بیٹھتے ہیں میری بات سکون سے سنئے صاحب آپ معاملات کو ان کی صحیح شکل میں دیکھ ہی نہیں سکتے اگر آپ پہلے سے بڑے صاحب کے مزاج ذہنیت اور اس رعونت کا اندازہ نہ کر لیں جو اس کا خاصہ تھی اور اس نفرت اور حقارت کو بھی نہ سمجھ لیں جو ہم لوگوں کے لئے شروع ہی سے اس کے دل میں موجود تھی اس کی آنکھیں ڈراؤنی تو تھیں ہی بلکہ سفاک بھی تھیں وہ ایک سرد ملک کا باشندہ تھا شاید اسی لئے وہ ہماری عورتوں کے تحقیر ترین لباس کو موسم کا تقاضہ سمجھنے کی بجائے دعوت گناہ سمجھ بیٹھا۔

آپ پھر بے چینی کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ ہمارا نکتہ نظر سمجھنے کے لئے سکون کی ضرورت ہے کیونکہ آپ ہم سے وقتی طور پر ہم آہنگ ہوئے بغیر یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ بڑے صاحب نے جب جنگل میں پہلی بار لپٹا کو اپنے سامنے نیم عریاں لباس میں پایا تو اس کے دل میں ہوس نے کیسی پھیل چادی ہوئی۔ لپٹا ہمارے گورے باپو کی حسین و جمیل آنکھوں میں بیٹی ہے۔ گورے باپو بھی آپ کی طرح انگریز تھے مگر میں برس پہلے وہ ہم میں آئے ہمارے سب سے بڑے قبیلے



سن کر اپنے نتھنے اس طرح پھیلانے جیسے کسی مردار کی بو سونگھ رہے ہوں۔ مگر جواب اسے زنی ہی سے دیا۔ ”ہاں میں کچھ سامان لینے آیا ہوں اور منج سویرے واپس جاؤں گا۔“

”نہیں میں دوپہر کے کھانے کے بعد روانہ ہونا چاہتا ہوں اور اگر تم کچھ مزدوروں کا انتظام کرو تو میں تمہیں کچھ روپے بھی دوں گا۔“ بڑے صاحب نے رعونت سے کہا۔

”دوپہر کا وقت آرام کا وقت ہے اور یہاں ایک کہادت مشہور ہے کہ دوپہر کے وقت پاگل کتے یا بے وقوف انگریز ہی سفر کرتے ہیں۔“ گورے بابو نے جواب دیا اس پر بڑے صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور گورے بابو کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولا۔

”ان لوگوں کو مجھے بے وقوف گورا کہنے دو میں اس سے بھی برے خطاب حاصل کر چکا ہوں۔“

چنگہ کی ایک حسین و جمیل لڑکی سے شادی کی اور ہمیشہ کے لئے ہمارے ہو کر رہ گئے وہ چھوٹے قد کے ہیں سر گنجا ہے اطوار اتنے پیارے اور آواز ایسی میٹھی ہے کہ ہم میں دیوتا کی طرح پوجے جاتے ہیں وہ دریا کے کنارے آباد ہو گئے اور صحرانوردانوں کا جنگل صاف کر کے کیلے کے درختوں کا باغ لگا لیا اب ان کے چھ بچے ہیں جن میں لپٹا سب سے بڑی اور اکلونی لڑکی ہے اس دن وہ کچھ سامان خریدنے بازار گئے ہوئے تھے جب بڑے صاحب کشتی سے اترے تو وہیں ان سے اس کی ملاقات ہو گئی لمبے چوڑے بڑے صاحب نے کشتی گورے بابو کو بے حد سرد دھری سے مخاطب کیا۔

”میں نے سنا ہے تم اس علاقے میں کاشتکاری کرتے ہو اور یہ کہ تم پہاڑی علاقے تک نہ صرف میری زمینیں کر سکتے ہو بلکہ وہاں تک میرا سامان لے جانے کا انتظام بھی کر سکتے ہو میں اوپر پہاڑوں میں تیل تلاش کرنے آیا ہوں۔“ گورے بابو نے اس کی بات



”مردود پہر کی دھوپ میں مزدوروں کے لئے بوجھ اٹھا کر چلنا ممکن نہ ہوگا کل صبح پری رکھیے۔“ گورے بابو نے گویا اچیل کی۔

”لعنت بھیجی صبح پر اور اپنے مشورے پر بھی اگر تم روئے کماتا نہیں چاہتے تو میں کوئی اور انتظام کر لوں گا۔“ گورے بابو کے لئے چونکہ روپے چھوڑ دینا مشکل تھا کیونکہ ان روپوں سے ان کے کئی کام نکل سکتے تھے اس لئے انہوں نے رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے بڑے صاحب سے پوچھا۔

”مگر آپ پہاڑیوں میں جا کر کیا کریں گے۔“  
”میں تیل کی تلاش میں ہوں ہمیں ریپورٹ ملی ہے کہ ان پہاڑیوں میں تیل کے آثار موجود ہیں کیا تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو۔“  
”میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“ گورے بابو نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔

”تمہارے جیسے نیک قوم انگریزوں کو میں کیا کہوں جو دھوکے کی جنگی عورتوں پر سمجھ کر اپنی قوم کا مفاد تک بھلا دیتے ہیں۔“

بڑے صاحب نے بڑے نفرت سے کہا اور جب اس نے یہ الفاظ کہے تو میری نظر گورے بابو کے چہرے پر پڑی اور میں ان کے چہرے کے پیچھے بدلتے ہوئے رنگوں سے ان کے دل کی کش مکش کا اندازہ لگا رہا تھا مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے صبر سے کام لیا اور پتا اور تمباکو جیب سے نکال کر سرگرم بنانے لگے۔

بڑے صاحب نے آخر اپنی ضد منوائی لی اور ٹھیک دوپہر کے وقت ہم بڑے صاحب کے سامان کے بوجھ تلے دبے ہوئے پہاڑیوں کی طرف جا رہے تھے ہم چھ مزدور تھے اور گورے بابو بھی۔ پتے دو چھروں پر اپنا سامان لا دے ہمارے ساتھ تھے بڑا صاحب اپنے شانے پر ایک چڑی بیک لٹکائے ہمارے آگے آگے جا رہا تھا۔

عین دوپہر کے وقت چلتے ہوئے سورج کے نیچے بھاری بوجھ اٹھا کر چلنا کتنا مشکل کام ہے یہ کچھ ہم ہی

لوگ جانتے ہیں جس سے دم گھٹنے لگتا ہے پسینہ چوٹیوں کی طرح کاٹا ہے جبر من بھر کے ہو جاتے ہیں اور قدم اٹھانا مشکل لیکن یہاں کے موسم اور قیامت خیز گرمی کے اثرات مابعد سے ناواقف اور بوجھ سے آلود بڑا صاحب اتنا تیزی سے بھاگا جا رہا تھا جیسے کتے اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ ظاہر ہے ایسے بے سمجھ آدمی کا ساتھ دینا بہت ہی مشکل کام ہے لیکن کرائے کے مزدور پیچھے رہ کر اپنی مزدوری بھی خطرے میں نہیں ڈال سکتے اس لئے جیسے تیسے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ تین گھنٹے وہ ہمیں اسی رفتار سے دوڑتا رہا مگر راجو کے لئے جو مزدوروں میں سب سے کم سن تھا اور جو پیٹ کے درد کا مریض بھی تھا اب اس رفتار سے چلنا ممکن نہ تھا اس لئے اس کا بڑا بھائی رنگو دوڑا دوڑا گورے بابو کے پاس گیا اور درخواست کی کہ راجو کی حالت کے پیش نظر تھوڑی دیر تک جانے کی اجازت دی جائے۔

”مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔“ گورے بابو نے دلی رنج سے کہا۔

”بڑا صاحب تو آگے آگے بھاگ رہا ہے اور رک جانے کی اجازت وہی دے سکتا ہے۔“  
”مگر پیٹ کی بیماری اسے نہیں میرے بھائی راجو کو ہے۔“ رنگو کوچ دتاب کہا کر بولا۔

”آپ اگر بڑے صاحب سے کہیں تو وہ ضرور مان جائے گا۔“ اس ملک میں طویل قیام کے امول تجربوں میں سے گورے بابو کا ایک یہ بھی تجربہ تھا کہ بیمار مزدور کی جان بچانے کے لئے تھوڑی دیر تک جانا ضروری ہے چنانچہ انہوں نے بڑے صاحب کو آواز دی۔

”ایک مزدور بیمار ہو گیا ہے۔“ بڑا صاحب یہ سنتے ہی غصے سے پیچھے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا مزدوروں کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”تم میں سے کون ہے جو بیماری کا بہانہ کر کے آرام کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے بڑی نفرت اور غصے سے

سے سوال کیا۔ راجو نو عمر ہونے کے باوجود ایک نڈر تھا اس لئے بے جھجک بول اٹھا۔

”میں بیمار ہوں اور شدید گرمی کی وجہ سے بے بس ہو گیا ہوں تھوڑا سا آرام مل جائے تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ مگر بڑا صاحب اس طرح کا جواب سننے کا کہاں عادی تھا اس نے زور سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور چلا اٹھا۔

”گرمی تمہارے لئے بھی اتنی ہے جتنی میرے لئے۔ اب تم آگے چلو میں تمہاری بیماری کا علاج کرتا ہوں وہ جب بھی تمہارے قریب آئے گی میں تمہاری پشت پر تھوکر مار کر بھگا دوں گا۔“ بڑے صاحب کا یہ طرز عمل قطعی انتہائی تھا چنانچہ اب ہر چہرے پر اس کے خلاف نفرت نمایاں تھی راجو کا ہاتھ تو اپنے کمر بند تک بھی پہنچ گیا جہاں اس کا دھاردار چاقو پوشیدہ تھا مگر اس کے پیٹ کا درد ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا اس لئے اس نے کوئی اور حرکت کے بغیر اپنا بوجھ زمین پر رکھ دیا اور بیٹھتا ہوا بولا۔

”پیٹ کا درد دور ہونے تک میں یہاں بیٹھوں گا۔“

”ہرگز نہیں۔۔۔۔۔“ بڑا صاحب زور سے چیخا۔  
”میں تمہیں مزدوری کا ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔ جاؤ اپنی بیماری کے ساتھ دھج ہو جاؤ۔“

مزدوروں کی سانسیں تیز ہوئیں اور ان کے ہاتھ اپنے اپنے کمر بند تک جانے کے لئے بچیں مگر بڑے صاحب کے بے پناہ رعب نے انہیں کچھ نہ کرنے دیا لیکن رنگو جو سب سے پیچھے تھا جیسے کسی پھرتی سے اچھلا اور اب اس کے دائیں ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کا پھل سورج کی شعاعوں میں جگمگا رہا تھا عین اسی وقت گورے بابو آگے بڑھے اور بڑے صاحب کو بھانسنے لگے کہ وہ مزدوروں سے یہ انداز گفتگو اور طرز عمل اختیار کر کے غلطی کر رہا ہے۔ لیکن بڑے صاحب نے انہیں بری طرح ڈانٹ دیا اور وہ شرمسار ہو کر پیچھے ہٹ گیا بڑے صاحب کے پیچھے سے

## ڈاکو کی درگت

ایک بہادر شخص نے دکان میں ڈکیتی کی غرض سے آنے والے ڈاکوؤں کی درگت بنا کر انہیں پولیس کے حوالے کر دیا بتایا گیا ہے کہ بڑے کی ریاست ویلز کے شہر ایریلڈیر کے ایک اسٹور میں 2 ڈاکو داخل ہوئے اور مالک پر چاقو تان کر رقم کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس اچانک حملے کے باوجود دکان دار ڈرانہ گھبرایا بلکہ نہ صرف خود پر تھوڑا سا چاقو کیا بلکہ ڈاکوؤں کو دکان میں بند کر کے خوب درگت بنائی اور پولیس کے ہتھے چڑھا دیا۔  
(ساجد علی - کھڑوس ضلع ساٹھڑ سے)

رنگو آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور ہم بڑے صاحب کی ہولناک موت کا تصور ہی کر رہے تھے کہ وہ حیرت انگیز تیزی سے پیچھے مڑا ایک بھیانک ہتھیار لگایا اور اپنے طاقتور کتے سے رنگو کا جیڑا توڑ کر رکھ دیا رنگو قلا بازیاں کھاتا ہوا دوڑ جا کر اس کے چاقو کا تیز پھل زمین پر گپک گیا۔

اب ہم چار مزدور رہ گئے تھے اور جیسے ہی چاقو سنبھالے آگے بڑھے بڑے صاحب نے تیزی سے اپنی جیب سے پستول نکال لیا ہم اس کی پھرتی پر حیران ہششدر اور خوف زدہ ہو کر رہ گئے۔ ہمارے ہاں ایک کہادت ہے کہ گرم مکہ ٹھنڈے فولاد سے زیادہ تیز رفتار اور زوداثر ہوتا ہے اور ہم میں سے کوئی بھی چونکہ اس کہادت کا جج جھوٹ پر کھنے پر آمادہ نہ ہو سکا اس لئے ہم نے اپنے اپنے بوجھ خاموشی سے اٹھائے بڑے صاحب نے راجو کا بوجھ بھی ہم سب میں بانٹ دیا اور پستول کی زد میں ہمیں گدھوں کی طرح ہانکنے لگا خون تھوکتا ہوا رنگو بھی بوجھ اٹھائے ہمارے ساتھ تھا اور پھر جب شام کے سامنے گھرے ہوئے تو اس نے ہمیں رکے کا اشارہ کیا ہم میں کسی میں بھی اب اتنی ہمت نہ تھی کہ کھانے اور سونے کے سوا اور کچھ سوچ بھی سکے ہم نے جلدی جلدی آگ جلا کر کھانا تیار کیا

اور کھا کر لیٹ گئے اس دوران میں بڑے صاحب نے ہم سے کوئی بات نہ کی وہ ہم سے دور ایک بڑے درخت کے تنے سے پیڑ لگائے بیٹھا رہا ہم پر اس کی دہشت اس طرح چھا چکی تھی کہ سچ ہونے کے باوجود ہم اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا تصور نہ کر سکے ہم لوگ بزدل نہ تھے مگر اس کی شیطانی طاقت سے ہمارے دل و دماغ اس طرح مرعوب ہو گئے تھے کہ صبح اٹھتے ہی ہم نے اپنا سفر شروع کر دیا اور وہ سفر جو ہمیشہ تین دن میں ختم کیا کرتے تھے زندگی میں پہلی بار صرف ڈیڑھ دن میں ختم ہو گیا اور ہم شام سے پہلے پہلے کورے بالو کے ڈیرے کے سامنے پہنچ گئے۔

پہلے ایک کتا بھونکتا ہوا سامنے آیا اور اس کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی دوڑتی ہوئی آئی مگر اپنے والد کی بجائے کئی آدمیوں کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئی یہ لپچا تھی اور یہ سوچ کر خون میں میری رگوں میں جھنکے کہ جب بڑے صاحب کی خوف ناک اور پرہوس نگاہ اس کی جانب اٹھے گی تو کیا ہوگا۔ اور میرا یہ خوف بے جا نہیں تھا کیونکہ لپچا حسن اور جوانی کی ایک بے نظیر تصویر تھی اس کا سر ایا تو بیان کرتا تو میرے بس میں نہیں ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کے معمولی سوتی لباس میں جیسے ہوئے جوان جسم کی قوسیں زاویے اور اُبھار اتنے دلکش تھے کہ ایک دفعہ تو دیکھنے والے کا دل بھی دھڑکنا بھول جاتا تھا۔ اس کی بے پناہ مصوہیت اس کی پرچیا آنکھیں اس کے اچھوتے گال اور ہونٹ اور اس کا معصوم جسمانی انداز سونے پر سہاگ تھا وہ ابھی صرف سولہ برس کی تھی مگر مشرق میں سولہ سال کی لڑکی عورت کہلاتی ہے۔

وہ سڑک کے کنارے بے حس سی کھڑی رہی اور ہم مزدوروں کو اس نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا شروع ہی سے اس کی نگاہیں ہمارے پیچھے آنے والے بڑے صاحب پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کسی سحر ہرئی کی طرح اسے منسلک دیکھے جارہی تھی بڑا صاحب اس کے قریب پہنچ کر رک گیا اور ایسی نظروں سے

اسے گھورنے لگا جن کا مفہوم اگر وہ سمجھتی ہوتی تو نہ جانے کہاں جا کر چھپ گئی ہوتی لیکن وہ قطعاً معصوم تھی اور اب تک اس نے اپنے باپ کے سوا کوئی گورا آدمی دیکھا بھی نہ تھا اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے دل میں کیا تھا اور وہ کیوں اتنی توجہ سے بڑے صاحب کو دیکھ رہی تھی اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کسی سحر زدہ کی طرح دو قدم اور اس کی طرف بڑھ آئی اور پھر خدا جانے کیا ہو جاتا اگر اسی وقت کورے بالو وہاں نہ آ جاتے وہ سفر کی تھکان سے چورتے لیکن ان کے چہرے پر جو آثار نمایاں تھے وہ صرف تھکان کے نہ تھے۔

”تمہاری یہاں ضرورت نہیں ہے تم جاؤ اور مجھے اس لڑکی سے دو باتیں کر لینے دو۔“ بڑے صاحب نے کورے بالو سے کہا۔

”یہ میری بیٹی لپچا ہے۔“ کورے بالو نے کہا اور ان کی آواز خلاف معمول کشیدہ تھی بڑے صاحب نے قہقہہ لگا اور بولا۔

”میں دوغلی نسل کی عورتوں کو دور سے پہچان لیتا ہوں۔ یہ ضرور تمہاری بیٹی ہوگی۔“ اور یہ الفاظ ایسے تھے کہ اگر وہ یہ الفاظ کہنے کی بجائے کورے بالو کے منہ پر تھپڑ مار دیتا کہ شاید انہیں اتنی تکلیف نہ ہوتی پھر بڑا صاحب لڑکی کی طرف مڑا اور بولا۔

”یہاں میرے پاس آؤ۔“ لیکن فوراً ہی کورے بالو زور سے چلا اٹھے۔

”نہیں.....“ اور اٹھا ہوا لپچا کا قدم رک گیا اور وہ اس طرح دوڑ کر پیچھے ہٹ گئی جیسے گہری نیند سے اچانک بیدار ہوئی ہو۔

”جاؤ گھر چلی جاؤ۔“ کورے بالو نے لپچا سے کہا اور وہ مڑ کر دیکھے بغیر بھاگ گئی۔

”تم اسے مجھ سے بچائیں سکتے ہیں جیسے ہی اشارہ کروں گا وہ دوڑی آئے گی۔“ دوغلی نسل کی عورتوں کو میں خوب جانتا ہوں۔“ بڑے صاحب نے بے حد رعوت سے کہا اور کورے بالو کی نگاہوں کی چمک بے

بڑھ گئی ان کے ہونٹ سکڑ گئے چمکدار وادانت باہر آئے اور ان کا حجم و کشش چہرہ وفتن سیاہ ہو گیا یہ کچھ کر بڑے صاحب زور سے ہنسا اور اپنی جیب ہتھپٹانے لگا جیسے جتار ہا ہو کہ اپنے اور اس لڑکی کے درمیان آنے والی اس حقیر انسان، کورے بالو کو قتل کر دینا اس کے لئے ایک کھیل سے زیادہ نہیں کورے بالو بھی غالباً یہ بات سمجھ گئے چنانچہ ضبط سے کام لے کر وہ پیچھے ہٹ گئے اور جیب سے ہتا اور تباہی کو نکال کر سرگرم بنانے لگے۔ لیکن ان کے ہاتھ اس قدر لپ پڑے تھے کہ بہت جلد تباہی کو نیچے گر گیا یہ دیکھ کر بڑے صاحب نے خاموشی سے روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور وہ یہ روپے لے کر خاموشی سے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ کورے بالو نے نہ تو بڑے صاحب سے کوئی بات کی اور نہ ہی اسے اپنے گھر میں ٹھہرنے کی دعوت دی اور وہ بھی ان کے دل کی طبیعت سمجھ رہا تھا اور اس سے لطف لے رہا تھا۔ اس لئے خاموشی سے ہمیں ساتھ لے کر دو سو گز پر سے چلا گیا اور وہیں اپنا کیپ لگا یا صاف نظر آ رہی تھی کہ وہ فی الحال پہاڑیوں کی طرف نہیں جائے گا بلکہ اس نے کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی کئی دن تک یہاں مقیم ہے رات کے اندھیرے میں کورے بالو میرے پاس آئے اور مجھے بتایا۔

”بڑے صاحب سے ملاقات کے بعد سے لپچا بے عجیب حرکتیں کر رہی ہے جس کی وجہ سے میں مت پریشان ہوں۔“ میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

”وہ مجھے جو کچھ بھی دیں گے میں بھلاؤں گا۔“

اس پر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا میں صبح سنے سے پہلے چمکے قہیلے کے سردار تک ان کا پیغام لکھ کر اس کا جواب لاسکتا ہوں۔“

کیونکہ لپچا چمکے قہیلے کے سردار کے بیٹے سے بے ہوش تھی اس لئے پیغام کی اہمیت میری سمجھ میں آ گئی تھی فوراً آدھ ہو گیا پیغام یہ تھا۔ ”شادی اگلے ماہ طے پائی تھی مگر بعض وجوہ سے میں یہ شادی فوراً

کر دینا چاہتا ہوں اس لئے آپ کل بارات لے کر آ جائیں اگر آپ نے آنے میں دیر کی تو ہمیں بچھٹانا پڑے گا۔

میں کورے بالو کے تیز رفتار خچر پر بیٹھ کر پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گیا اور پیغام پہنچا کر مرجع ہونے سے پہلے واپس بھی آ گیا۔

صبح حالات سے بے خبر بڑا صاحب اس یقین کے ساتھ کہ لپچا اس کے پاس ضرور آئے گی تین گھنٹے تک اپنے کیپ میں انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی دوپہر کو وہ کورے بالو کے گھر پہنچ گیا اور ان کا بندر دروازہ کھٹکھٹایا میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ صحن میں شام کے ضیافت عروسی کے انتظام میں مصروف تھا میرے سامنے ہی کورے بالو نے اپنا دروازہ کھولا مگر اس طرح کڑنٹل ہیرل کی شامت گن ان کے ہاتھ میں تھی اور اس کی دونوں نالیاں بڑے صاحب کی طرف اٹھی ہوئی تھیں کورے بالو نے بڑے صاحب کو بتایا۔

”آج ان کی بیٹی کی شادی ہے اور وہ بے حد مصروف ہیں۔“ یہ کہہ کر کورے بالو نے دروازہ بند کر لیا اور بڑا صاحب بے نیل ورام اپنے کیپ میں واپس چلا گیا شادی مصروفیت میں اسے پھر مگر نے بھی یاد نہ کیا۔

آس پاس کی بستیوں میں بلاوے جیسے چائیکے تھے اور مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی ساحل پر لکڑی کے تختوں کا ایک پلیٹ فارم رقص عروسی کے لئے بنایا گیا تھا جسے ہر طرح کے جنگلی پھولوں سے سجایا گیا تھا جنگلی پھولوں کے حسن اور بیلے چنبیلی کی مست خوشبو نے روح پرور سماں پیدا کر دیا تھا۔ روغنی لکڑی کے کندے مشعلوں کی مانند جلانے کے لئے اونچائی پر چاروں طرف باندھ دیئے گئے تھے جو رات میں بھی دن کا سماں پیدا کرنے والے تھے۔ عورتوں اور بچوں نے بے ہنگم شور مچا رکھا تھا مگر یہ خوشی کا موقع تھا اور اندیشہ ہائے دور درواز کے باوجود کورے بالو بھی ہنس ہنس کر اپنے مہمانوں سے گفتگو کر رہے تھے

اور پھر جب ضیافت کی ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو شام ڈھلے چمکے قہیلے کے بارانی بھی پہنچ گئے دولہا کمار کے جھرمٹ میں تھا اور اس کی آن بان قابل دید تھی کمار اپنے قد قامت اور حسن شباب کے لحاظ سے ان سب میں ممتاز اور نمایاں تھا اور صدیوں کی سرداری کا جاہ و جلال اس کی ہر اداسے بھلک رہا تھا۔ چمکے قہیلے کا بڑا بچاری اور حکیم بھی بارات کے ساتھ تھا کیونکہ شادی کی رسوم اسے ہی انجام دینی تھیں وہ بے حد جود تھا اس کی عمر ڈیڑھ سو سال سے کم نہ ہوگی اور ڈیڑھ صدی کا تجربہ علم اور دانش معمولی چیز نہیں ہو سکتی۔ بارانی گورے بابو کے مکان کے سامنے نصف دائرے کی شکل میں اپنے نیزے تان کر کھڑے ہو گئے اور بچاری نے متر پڑھنے شروع کر دیئے ساتھ ساتھ وہ ڈھول بھی بجائے جارہا تھا دفعتاً دروازہ کھل اور کمار آگے بڑھ کر دہن لپٹا کر جو اپنے باپ کے بازوؤں کا سہارا لے باہر آ رہی تھی۔

بالشبہ یہ ایک بینظیر جوڑا تھا دونوں کے بھڑک دار لباس عروسی نے ان میں وہ شان و شوکت پیدا کر دی تھی کہ ان پر نگاہ ہی نہیں ٹھہرتی تھی دونوں حسین و جمیل تھے اور باوقار اور پر جلال بھی۔

”صاحب آپ مجھ بے چین ہو رہے ہیں حالانکہ اب کہاں ہی ختم ہونے والی ہے۔“ لیکن میں اسے بہر حال اپنے ہی طریقے پر بیان کروں گا کیونکہ اس رات کا ایک ایک واقعہ میرے دل پر نقش ہے اور واقعات کی ترتیب میں کوئی تبدیلی مجھے منظور نہیں۔

آہ..... کیا عجیب نظارہ تھا چاروں طرف مشعلیں جل رہی تھیں مقدس آگ خوشبودار جڑی بوٹیوں کے مستی افروز دھوکے میں نمایاں تھی اور دولہا دلہن اس مقدس رشتے میں باندھے جارہے تھے جسے ہمارے عقیدے کے مطابق موت بھی نہیں توڑ سکتی۔ شادی کی رسوم ختم ہوتے ہی ساز بجنے لگے اور پھر ناگو ناچ شروع ہو گیا ناگو جوانی کے ناچ کو کہتے ہیں اور یہ نوجوان جوڑوں کا ناچ ہے اس کا اختتام رقص عروسی

پر ہوتا ہے جس میں صرف دولہا اور دلہن حصہ لیتے ہیں۔ اور اسے ایک مقدس ناچ سمجھا جاتا ہے ناگو ختم ہونے ہی والا تھا کہ۔

بڑا صاحب بن بلایا مہمان بن کر رقص گاہ میں کھس آیا مگر ناچنے والے اس کی طرف دھیان دیئے بغیر ناچتے رہے اب دوسرے جوڑے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے تاکہ رقص عروسی کے لئے میدان خالی ہو جائے بڑا صاحب لپٹا اور کمار کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنی ہولناک نگاہوں سے شرماتی لپٹا لپٹا کو گھورنے لگا وہ بغیر کچھ کہے اپنی ہولناک آنکھوں سے دیر تک اسے گھورتا رہا دفعتاً وہ گورے بابو کی طرف مڑا اور ان سے بولا۔

”بارات غالباً آج رات ہی واپس چلی جائے گی۔“

”ہاں ان ہی پہاڑیوں میں جہاں تم جانا چاہتے ہو.....“ گورے بابو نے جواب دیا۔

”میں صبح سویرے ہی روانہ ہو جاؤں گا اور جلد سے جلد اپنا کام نپٹا کر واپس آ جاؤں گا اور پھر کچھ دن یہاں تفریح کروں گا بڑے صاحب نے معنی خیز انداز میں کہا اور لپٹا لپٹا کو گھورنے لگا میں گورے بابو کے پیچھے ہی کھڑا تھا میں نے اچانک ان کے جسم میں کچلی محسوس کی اور میں اپنے چاچو کے دستے پر ہاتھ رکھ کر ان کے اور قریب ہو گیا وہ میرے دوست بھی تھے اور محسن بھی اور وہ اس وقت ایسی لڑکی کے باپ تھے جسے ایک بدנית انسان نگاہ بد سے دیکھ رہا تھا کو میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ گورے بابو کے دل میں کیا ہے مگر میں فوری عمل کے لئے بہر حال تیار تھا۔ لیکن اچانک ہی تالیاں بجنے لگیں اور یہ ناگو کے اختتام کا اعلان تھا کسی نے ساز چھیڑا اور پھر ایک ایک کر کے تمام ساز بجتے گئے اور اتنی پر شور اور تیز موسیقی شروع ہو گئی کہ دل سینوں میں زور زور سے دھڑکنے لگے سانسیں تیز ہو گئیں پھر دفعتاً لپٹا نے پورے جوش اور دلولے سے رقص عروسی شروع کر دیا۔ پہلے اس نے اپنے دولہا کی

ہلاکس لیں پھر اس کے گرد ایک چکر لگایا پورے زور سے گھومی اور پھر مکان کی طرح تن گئی اس کا حسن اپنی مثال آپ تھا اور عالم رقص میں تو اس کے انداز واقعی قیامت ڈھار ہے تھے موسیقی تیز ہو گئی اور رقص کی شدت بھی بڑھتی گئی پھر لپٹا نے کمار کو جوش رفاقت سے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس سے لپٹ کر رقص کرنے لگی یہ ایک مقدس رقص تھا اور نہ صرف ناچنے والے بلکہ دیکھنے والے بھی ایک سرور میں جھوم رہے تھے رقص ابھی پورے جوش سے جاری ہی تھا کہ۔

اچانک چاندی کے بہت سے سکوں کی جھکار سنائی دی رقص اچانک رک گیا حیران و ششدر لپٹا کے قدموں میں چاندی کے بہت سے روپے پھھرے پڑے تھے اور پھر لپٹا کے چہرے پر ہندامت کی زردی اس طرح پھیل گئی جیسے اس کا سارا لہو کسی نے چھوڑ لیا ہو کمار کا چہرہ بھی فسے سے سرخ اور پھر سیاہ ہو گیا اور وہ کچلے ہوئے زہریلے سانپ کی طرح ملے کھانے لگا۔

کون تھا وہ خبیث جس نے مقدس دہن لپٹا کو ایک ناچنے والی ایک طوائف سمجھ کر اپنی دولت کی نمائش کی تھی ہر نگاہ میں یہ سوال تھی اور ساری نگاہیں سر جھکائے واپس اپنے کپ کے طرف جاتے ہوئے بڑے صاحب پر جم کر رہ گیا۔

اچانک کمار نے خنجر اپنے کمر بند سے کھینچ لیا اور بڑے صاحب کے پیچھے لپکا مگر گورے بابو نے اچانک اس کی کلائی تھام لی اور سرگوٹی کی اس کی جیب میں پھنسا دیا اس وقت اسے جانے دو البتہ کل صبح وہ شعل کی تلاش میں پہاڑیوں کی طرف جانے والا ہے مگر کمار نے اپنے دوستوں کو سمجھا بچھا کر کوئی ہنگامہ کرنے سے باز رکھا اور وہ لوگ اپنے سینوں میں رہائے انتقام کی آگ کو اپنی پہاڑیوں کی طرف واپس چلے گئے۔

بڑے صاحب کے حکم کے مطابق صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی ہم اپنا اپنا بوجھ اٹھا کر پہاڑیوں کی طرف چل دیئے دن بھر ہم سفر کرتے رہے۔ اور رات

کو آرام کر کے صبح سویرے چل دیئے دوپہر ہو رہی تھی کہ سریل ٹنڈوں پر سوار دو تھانگی دور سے آتے نظر آئے وہ سیدھے ہماری ہی طرف آئے اور بڑے صاحب کو بتایا کہ وہ یہ سن کر آئے ہیں کہ وہ تھیل کی تلاش میں نکلا ہے اور چونکہ انہوں نے ایک جگہ تھیل کے واضح آثار دیکھے ہیں اس لئے وہ بڑے صاحب کی رہنمائی کرنا چاہتے تھے انہوں نے بتایا کہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر گہرائی میں ایک چشمہ ہے جس کی سطح پر روغن کی تہہ سی جی رہتی ہے اور آگ سے چشم زدن میں جل اٹھتی ہے بڑا صاحب یہ سن کر بڑا خوش ہوا اور فوراً انہیں مقول انعام کا لالچ دے کر کیلا ہی ان کے ساتھ چل دیا ہمیں اس نے حکم دیا کہ یہاں پر ہی کیمپ لگالیں اور اس کی واپسی کا انتظار کریں اور پھر جب وہ تینوں ایک پہاڑی کے پیچھے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو رگوا اپنے بھنے ہوئے خون آلود ہونٹ سیڑ کر چلا اٹھا ”خس لم جہاں پاک“ اور پھر ہم نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

میں صاحب ہمارا دہاں رک کر اس کی واپسی کا انتظار کرنا بالکل ہی بے کار اور لا حاصل تھا کیونکہ وہ قبائلی جو اسے لے گئے تھے چمکے قہیلے کے لوگ تھے اور ہم قبائلیوں میں پھرنے کے زمانے سے یہ قانون رائج ہے کہ جو شخص بھی ہماری کسی عورت کی توہین کرے اسے دورا توں سے زیادہ زندہ نہیں رہنا چاہئے نہیں صاحب اس کی موت کے ثبوت کی تلاش بھی لا حاصل ہے بلکہ خطرناک بھی ہو سکتی ہے خواہ یہ ثبوت انشورٹس سمجھتی ہی کو کیوں نہ مطلوب ہوں کیونکہ چمکے قہیلے کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شکار کی لاش پر شہد کا لپ کر کے اسے جنگلی چوہیوں کے بلوں کے قریب ڈال دیتے ہیں اور چونکہ جنگلی چوہے انشورٹس کمپنیوں کے قوانین سے آگاہ نہیں ہیں اس لئے وہ ایسی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہنے دیتے جسے شناخت کے طور پر پیش کیا جاسکے۔

☆☆



# خوفناک ہیلوین

ثناء احمد - حیدر آباد

”میں نے ان کو ان کے انجانم تک پہنچا دیا، اب اپنے اصل قاتل سے بھی بدلہ ضرور لوں گا۔“

مگر ہیلوین کی رات کیونکہ اگلی بار ہیلوین منانے کی باری میری ہے۔“

**امریکہ** میں ہیلوین کی تیاریاں عروج پر

تھیں۔ دکانوں میں بہت زیادہ رش تھا۔ لوگ مختلف قسم کے ماسک اور لباس خریدنے میں مصروف تھے۔ انگریز اس تہوار کو شوق سے مناتے ہیں۔ مختلف قسم کے ماسک اور لباس پہنتے ہیں۔ پارٹیوں میں جاتے ہیں اور بچے گھر گھر جا کر ٹافیاں وصول کرتے ہیں۔ روز بھی شاپنگ کر کے واپس گھر آ رہی تھی کہ اس کا موبائل واہیریت کرنے لگا۔ اس نے اپنا موبائل سائلنٹ پہ لگا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ شاپنگ کے دوران ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے واہیریشن لگا رکھی تھی۔ اس نے فون پک کیا جبکہ دائیں ہاتھ سے گاڑی چلا رہی تھی۔ ہاں گھوریا بولو۔ روز نے فون پک کرتے ہی کہا۔ روز میں تمہارے گھر میں ہوں اور تم کدھر گھوم رہی ہے؟

گھوریا نے پوچھا۔ بس پانچ منٹ تک آ سکی، ڈرائیونگ کر رہی ہوں، روز نے کہا اور فون بند کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ گھر پہنچ چکی تھی۔ روز شاپنگ تم نے بہت کی ہے۔ لگتا ہے اس بار گھر خوب سجاؤ گی کیوں ایسا ہی ہے نا؟ گھوریا نے روز سے پوچھا۔ نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ تو پھر.....؟ گھوریا نے پوچھا۔ اسے میں روز کی مہی چائے لے کر آئی، روز اور گھوریا صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ سامان میں گھر کو کھانے کے لئے نہیں لائی بلکہ اس بار ققام ہاؤس بچے گا۔ روز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے

ساتھ کہا۔

قارم ہاؤس.....؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔ گھوریا نے

حیرت سے کہا۔

میری جان گھوریا اس بار ہم اپنا ہیلوین میری دادی کے قارم ہاؤس میں منائیں گے۔ روز نے کہا تو اس کی امی بھی بولی۔ ”ہاں بیٹا گھوریا روز نے اس بار ہیلوین قارم ہاؤس میں منانے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے بھی سوچا ٹھیک رہے گا۔ جاؤ مزے کرو یہی تو تم لوگوں کی عمر ہے۔“

اوگریت گھوریا خوشی سے بولی۔ چائے کے کپ خالی ہو چکے تھے روز کی امی نے کئی۔ روز کی دادی کا قارم ہاؤس نیویارک شہر سے کچھ دور تھا وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جبکہ روز اپنے والدین کے ساتھ نیویارک میں رہتی تھی اور اس کے سب دوست بھی نیویارک کے ہی رہائے تھے۔ روز کے دوستوں میں گھوریا، سوزی، میکس اور جیک تھے۔ یہ سب دوست کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے جبکہ روز کا منگیتر ہر خوشی روز کے ساتھ انجوائے کرتا تھا۔ ایک سال ہو گیا تھا ان کی منگیتی کو، رات کو ہیلوین تھا اور وہ نے سب سے پہلے اپنے منگیتر کو فون کیا اور سارا پلان بتایا۔ پھر باقی دوستوں کو آگاہ کیا۔ شام تک سب پہنچ چکے تھے۔ ایک بڑی سی دین میں سب دوست اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ دین روز کے منگیتر کو لے گئی تھی اور دین بھی وہی چلا رہا تھا روز اس کے ساتھ آگے بیٹھی ہوئی

تھی، پیچھے گاؤں اور سوزی تھیں جبکہ دین کی آخری سیٹوں پر میکس اور جیک بیٹھے ہوئے تھے۔ دین تیزی سے جاری تھی۔

ویسے روز ہم نے کبھی تمہارا فارم ہاؤس دیکھا نہیں۔ میکس بولا۔

ہاں تو اب جارہے ہو نا، روز بولی۔ مگر کوسجایا ہوا تھا میں نے تو پھر جب پتہ چلا کہ اس بار فارم ہاؤس جانے کا پلان ہے تو میں حیران رہ گیا۔ روز تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اس بار جیک نے کہا۔ سر پرانز دینا چاہتی تھی اور کچھ نہیں روز نے کہا۔

اوہ یہ لڑکی بھی نا..... اب چپ کر کے بیٹھ جاؤ۔ اٹی باتیں ہی کرتے رہتے ہیں۔ سوزی نے کہا تو جیک جو کہ اس کے پیچھے ہی بیٹھا۔ اس کی چوٹیاں چٹنی، آہ..... سوزی ہلکا سا چٹنی..... لڑکے دونوں ہنسنے لگے۔

Idiot، سوزی ہالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ ہیلو دین کا سارا سامان لے لیا؟ کو لے نے روز سے پوچھا؟

ہاں ماسک بھی سب کے لے آئی تھی اور موم بتیاں، کچھ نئے کپڑے، ڈرننگز اور کیک باقی سب چیزیں بھی بروز بولی۔

کچھ شاپنگ میں نے بھی کر لی تھی۔ کو لے مسکرا کر بولا۔

کچھ دیر تک گاڑی چلتی رہی۔ پھر کو لے اونچی آواز میں بولا۔ لو Gays ہم پہنچ گئے۔ دین رک چکی تھی۔ اوہ..... میکس، گلوڑیا بولی۔ سب اترے فارم ہاؤس کی حفاظت اور صاف ستھرائی کے لئے روز کے ڈیڑے ایک سیکورٹی گارڈ رکھا ہوا تھا وہ اس وقت گیٹ کے باہر کھڑا تھا وہ 45 سال کا تھا، اسے زیادہ کالگ نہیں رہا تھا۔ اس نے گیٹ کھولا، کو لے دین کے اندر ہی تھا اس نے دین فارم ہاؤس کے اندر کی۔ باقی سب باہر ہی اتر چکے تھے۔ فارم ہاؤس کا بیڑا تھا۔ کافی بڑا مچھن تھا۔ مچھن میں گھاس لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف سوئمنگ پول تھا۔ ہیلو۔ روز نے چوکیدار سے کہا۔

سب اندر چلے گئے۔ شام ہو رہی تھی۔ واہ بار ماننا پڑے گا مکمل صاف ستھرا ہے یہ مگر تو..... میکس بولا۔ انہوں نے مگر کو خوب سچایا۔ جب گلوڑیا چھت پر گئی تو کچھ حیران رہ گئی۔ وہ بھانگی ہوئی نیچے آئی۔ روز روز..... وہ آوازیں دیتی ہوئی نیچے آئی۔ کیا ہوا ہے روز نے کہا..... وہ ادھر سامنے والا مگر..... وہ بولتے بولتے رک گئی۔

کیا؟ روز نے بولا۔ چلو میرے ساتھ گلوڑیا نے کہا اور اسے پکڑ کر لے گئی۔ جب دونوں اوپر گئیں تو روز بھی تجسس میں پڑ گئی۔ اس مگر کو جیسے کسی آگ لگی تھی۔ روز نے حیرت سے کہا..... ہاں وہی تو گلوڑیا بولی۔

حیرت ہے آتے ہوئے ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ روز بولی۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ کچھ آگے ہے، گلوڑیا نے کہا۔ آؤ چوکیدار سے پتہ کرتے ہیں۔ روز بولی۔

وہ نیچے آئیں..... چوکیدار سے روز نے پوچھا۔ اس مگر کو کیا ہوا تھا؟

سب بیٹھے ہوئے تھے چوکیدار نے بولنا شروع کیا۔

وہ جو مگر آپ نے دیکھا ہے نا وہ ایک قصاب کا مگر ہے اس کا نام ولیم تھا۔

وہ مگر بہت پہلے آگ کی پیٹ میں آ گیا تھا۔ اس مگر کو آگ پولیس والوں نے لگائی تھی۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ایک خوب صورت مگر تھا اس قصبے کا سب سے خوب صورت مگر..... چوکیدار کچھ خاموش ہوا پھر بولا۔ جب سب لوگ وہاں پہنچے تو پورا مگر آگ کی پیٹ میں تھا۔ ولیم کی چیخوں کی آوازیں سب کو سنانی دے رہی تھیں۔

لیکن پولیس نے آخر کیوں ولیم کو جلا یا؟ کو لے نے پوچھا۔

پولیس کے مطابق ولیم باگل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی اور دو بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ جب پولیس وہاں

پہنچی تو اس نے پولیس والوں پر بھی فائرنگ شروع کر دی اور مجبوراً پولیس والوں کو اس کے مگر کو آگ لگانا پڑی..... جب ہم وہاں پہنچے تو پورا مگر جل رہا تھا۔

پر ایسا کیا ہوا کہ ولیم نے اپنے بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ اب کی بار روز نے پوچھا۔ لوگوں کے مطابق ایسا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ پولیس والوں نے جھوٹی کہانی بنائی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پولیس والوں نے خود ولیم کے بیوی اور بچوں کو مارا تھا۔ ان کی لاشیں سڑک پر پڑی ہوئی تھیں۔ جب ہم نے دیکھا تھا..... چوکیدار نے کہا۔

ہم سے کیا مراد ہے تمہاری؟ اور کون تھا تمہارے ساتھ؟ کو لے نے پوچھا۔

میں اور اسٹن صاحب..... چوکیدار نے کہا۔ انگل؟ کو لے حیرانی سے بولا۔ جی ہاں چوکیدار نے کہا۔

ہاں مجھے یاد ہے پچھلی ہیلو دین پ ڈیڈی رات کے وقت ادھر آ گئے تھے۔ کیونکہ دادی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ روز نے کہا۔

اچھا تو یہ سارا واقعہ پچھلی ہیلو دین ہے ہوا تھا؟ گلوڑیا اس بار بولی۔

ہاں..... چوکیدار نے کہا۔ اگر لوگوں کی بات سچ ہے تو تم اس وقت کہاں تھے۔ جب یہ واقعہ ہوا؟ کو لے نے پوچھا۔

تب میں شہر گیا ہوا تھا جب واپس آیا تو آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے کار اندر پارک کی اسٹن صاحب بھی اسی وقت باہر نکلے تھے اور جب ہم وہاں پہنچے تو اور لوگ بھی تھے۔ چوکیدار نے کہا پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔

پولیس نے ایسا کیوں کیا؟ روز نے پوچھا۔ ولیم کے ساتھ کسی کی سخت دشمنی تھی اور اسی دشمنی نے پولیس کو بھاری رقم دے کر ایسا کروایا تھا۔ چوکیدار نے کہا۔

اور وہ شخص کون تھا؟ کو لے نے پوچھا تو میکس کھڑا ہو کر بول پڑا۔ دفع کرو یا۔ ہمیں کیا لیتا دینا؟ تم

لوگ کیا اس ٹاپک کو پکڑ کے بیٹھ گئے ہو وہ جو بھی تھا مریچکا۔ اور ہم گڑھے مردے اکھاڑ رہے ہیں۔ وہ مرا نہیں ہے۔

میکس کی بات کی تردید کرتے ہوئے چوکیدار بول پڑا تو سب حیران رہ گئے۔

کیا؟ روز نے پوچھا؟

ہاں..... جس کسی نے ولیم اور اس کے مگر والوں کے ساتھ ایسا کیا تھا اس کا مجھے تو پتہ نہیں کہ وہ کون تھا البتہ ولیم مرانیں ہے وہ بچ گیا تھا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ مریچکا ہے پر جب دو ہفتوں بعد ان پولیس والوں کے قتل ہو گئے تھے جنہوں نے آگ والی کارروائی کی تھی تب ایک پولیس والے کے جسم پر رکھے ہوئے پیپر پر جو کچھ لکھا تھا وہ پڑھ کر سب کو اندازہ ہو گیا کہ ولیم زندہ ہے۔

ایسا کیا لکھا تھا اس پر؟ کو لے نے کہا۔

”میں نے ان کو ان کے انجام تک پہنچا دیا، اب اپنے اصل قاتل سے بھی بدلہ ضرور لوں گا۔ مگر ہیلو دین کی رات کیونکہ اگلی بار ہیلو دین منانے کی باری میری ہے۔“ اور اس کے نیچے اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ چوکیدار بولا۔

یعنی وہ اگلی ہیلو دین آج رات نہ ہے.....؟ گلوڑیا بولی۔

ہاں، کیونکہ ہیلو دین کی رات ولیم کا سب کچھ تباہ ہوا تھا۔ تو اس نے بھی اگلی ہیلو دین یہ اپنے اصلی دشمن کا سب کچھ تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چوکیدار نے بتایا۔

پرانے شریف کے قتل کے بعد یہاں سے شریف کا تبارد ہو گیا تھا۔ پولیس والوں کو قتل کرنے کے بعد ولیم اچانک غائب ہو گیا اور نیا شریف جس کا نام بل ہے ولیم کو تلاش نہ کر سکا۔ اور مجھے نہیں لگتا کہ آج رات کوئی ولیم کے محلے ہوئے مگر کے باہر پہرہ دے گا۔ اسے پکڑنے کے لئے، چوکیدار نے ساری تفصیل بتائی۔

”اور ولیم کیا جج میں آج رات آئے گا؟“ روز نے تجسس میں پوچھا۔

مجھے نہیں پتہ میں نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا بتا دیا۔ چونکہ میرے کہنا۔

اور لوگوں کو کون بتاتا ہے؟ کوئلے نے پوچھا۔ یہ سب محسن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سورن مکمل طور پر ڈوبنے کو تھا عسٹری ہوا چل رہی تھی۔

لوگوں کو وہ بوڑھی عورت بتاتی ہے کچھ اس پر یقین کر لیتے ہیں اور کچھ نہیں۔

اس بوڑھی کا گھریا نکل ولیم کے گھر کے سامنے ہے چھوٹا سا گھر ہے۔۔۔۔۔ اسی نے لوگوں سے کہا تھا کہ پولیس والوں نے خود ولیم کا خاندان ختم کیا۔ چونکہ اربابوں کا گھریا۔

خیر۔۔۔۔۔ تم اب باہر جاؤ۔ رات ہونے والی ہے۔ ہم نے بھی تیاری کرنی ہے۔ کوئلے نے کہا۔

چونکہ اراٹھے ہوئے بولا۔ کسی چیز کی مدد چاہئے تو بلا لیجئے گا۔ اس قصبے سے کچھ آگے ایک پارک ہے۔۔۔۔۔ یہاں کے لوگ ہمیشہ ہیلو وین وہیں جا کر مناتے ہیں۔ اور چونکہ اراٹھے کر چلا گیا۔

اف تو ہے۔۔۔۔۔ سوزی بولتے ہوئے اٹھی۔ حیرت ہے ڈیڈی نے بھی بتایا نہیں اس بارے میں۔ روز بولی۔

دفع کرو۔۔۔۔۔ ہم یہاں سلیم بیٹ کرنے آئے ہیں، اب اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ کوئلے نے بھی اٹھے ہوئے کہا۔ وہ سب اندر جا رہے تھے۔ رات ہو گئی تھی۔

سب نے مختلف مارک پہنے ہوئے تھے۔ کیا خیال ہے ہمیں اسی پارک میں جانا چاہئے بہت مزہ آئے گا۔ میکس نے رائے دی۔

ہاں کیوں نہیں کوئلے نے کہا۔ Happy Helloven۔۔۔۔۔ سب نے کہا۔

روز باہر آگئی محسن میں۔۔۔۔۔ گھوڑیا بھی اس کے ساتھ تھی۔

پڑوسی ہونے کے ناطے ہمارا فرض ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھی ہیلو وین ڈس کریں۔ روز نے کہا اور کچھ

مکھوم بھی لیس کے۔۔۔۔۔

ہاں چلو گھوڑیا بولی اور وہ باہر نکل گئی۔ آؤ پہلے اسی بوڑھی کے گھر چلتے ہیں۔ روز بولی۔

ارے وہ منحوس ہے ادھر نہیں جائیں گے۔ گھوڑیا نے کہا تو روز بولی۔ ”ایسا نہیں کہتے چلو۔“

نہیں تم جاؤ اکیلی۔ میں واپس جا رہی ہوں اور گھوڑیا واپس جانے لگی۔

روز اکیلے ہی آگے بڑھ گئی۔۔۔۔۔ اسے اصل میں کچھ تجسس بھی تھا جس کی وجہ سے وہ بوڑھی کے گھر کی طرف جا رہی تھی اس نے دروازے پر دستک دی اور مرکز ولیم کے تاجہ حال گھر کو دیکھا۔

یہ بھی کافی بڑا گھر ہے اور یقیناً اپنے وقت میں بہت خوب صورت ہی رہا ہوگا اس نے بڑبڑایا۔ روز نے مارک پہنا ہوا تھا گولڈن رنگ کا بہت خوب صورت مارک تھا جبکہ اس کے ہاتھ دو دستوں نے خوفناک مارک پہنے تھے۔ اسے میں دروازہ کھلا۔ روز نے مارک اوپر کیا۔۔۔۔۔ Happy helloven اس نے بوڑھی سے کہا جو دروازے کو پکڑے کھڑی تھی۔

تم کون ہو؟ وہ بولی۔

میں روز ہوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ اس فارم ہاؤس میں آئی ہوں جو ساتھ ہی ہے۔ بوڑھی نے باہر نکل کر فارم ہاؤس پر نظر ڈالی۔

”تم لوگ کیوں آئے ہو یہاں؟ بہتر ہے تم لوگ چلے جاؤ اس بار ہیلو وین منانے کی باری اس کی ہے۔“ بوڑھی روز کو قدرے غصے سے دیکھتے ہوئے بولی اور اندر چلی گئی۔ وہم سے دروازہ بند کر دیا۔

روز کو تب ایک جھٹکا لگا۔ گھوڑیا بھی یہ توجہ میں منحوس ہے۔ روز بولتے ہوئے مڑی ہی تھی تب اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ ولیم کے گھر سامنے کی دیوار گری ہوئی تھی اور اندر محسن میں شاید ولیم ہی کھڑا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے صرف انسانی جسم نظر آ رہا تھا۔ یعنی سائے کی طرح۔۔۔۔۔ روز گھبرا گئی اور واپس فارم ہاؤس کی طرف آنے لگی۔ وہ جیسے ہی فارم ہاؤس میں داخل ہوئی سب

وین میں بیٹھ رہے تھے کوئلے جبکہ باہر آنے لگا تھا۔ کہاں رہ گئی تھی تم۔ گھوڑیا نے بتایا کہ تم بوڑھی کے گھر گئی تھی۔ کوئلے نے کہا۔

ہاں دیکھو وہ اکیلی رہتی ہے پڑوسن بھی ہے سوچا ہیلو وین ڈس کر آؤں، وہ میری دادی کی جگہ کی ہیں دیے بھی دادی کا تو پچھلی ہیلو وین کے دوسرے دن ہی انتقال ہو گیا تھا۔ لیکن گھوڑیا ٹھیک کہہ رہی تھی تو وہ پاگل ہی لگتی ہے۔ بولی۔ ”بہتر ہے یہاں سے چلے جاؤ۔ ہیلو وین منانے کی باری اس کی ہے۔“ روز بتاتی جا رہی تھی۔

میں نے تو پہلے ہی کہا تھا نہ جاؤ۔ گھوڑیا وین کے اندر سے بولی۔

چلو بھی کوئلے کیا کھڑے ہو گئے ہو؟ چلو روز بیٹھو تم بھی۔۔۔۔۔ میکس نے کہا۔

چلو۔۔۔۔۔ سوچو مت۔ کوئلے نے روز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اندر بیٹھے۔۔۔۔۔ کوئلے نے وین اشارت کی اور وین مرکز پر آگئی۔ چونکہ اراٹھے کیٹ بند کیا اور رائٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔ جب میں مڑی تو ولیم تھا شاید محسن میں کھڑا تھا۔ روز نے کہا تو جبکہ زور سے ہٹا۔ تم پر بوڑھی کی باتوں کا اثر ہو گیا ہے۔ جبکہ بولا۔ وہ شراب کی بوتل پی رہا تھا۔

کوئلے نے یکدم وین روکی۔ وہ رہا دیکھا۔ روز نے اشارہ کیا۔ جبکہ نے منہ باہر نکالا۔۔۔۔۔ ہائے ولیم کیسے ہو؟ Happy helioveen یہ میری طرف سے جبکہ نے کہا اور شراب کی بوتل چھین کر جو ولیم کے گھر کی ٹوٹی دیوار پر لگتے ہی ٹوٹ گئی۔

پاگل ہو گئے ہو؟ روز گھبرا کر بولی۔ اسے چڑھ گئی ہے۔ میکس نے غصے سے کہا۔

تم نے وین کیوں روکی چلو۔۔۔۔۔ گھوڑیا پیچھے سے بولی۔ اسے میں بوڑھی کے گھر کا دروازہ کھلا۔ ”جاؤ یہاں سے شرابی بچو جاؤ۔“ وہ غصے سے بولی اور پتھر اٹھا لیا۔

اوکے اوکے کوئلے جلدی سے بولا اور وین بھاگادی۔

یہ بڑھیا توجہ میں پاگل ہے گھوڑیا نے کہا۔ کوئلے نے لمبا سانس لیا۔۔۔۔۔ ویسے جبکہ کی بھی غلطی ہے۔ سوزی اب کی بار بولی۔

دیے یہ ہمارے خلاف کیوں ہے؟ روز نے پوچھا۔

کون بڑھیا؟ پاگل ہے سب کے ہی خلاف ہوگی۔ کوئلے نے کہا۔

نہیں یار وہ پہلے بھی غصے میں تھی بولی۔ ہم لوگ یہاں آئے ہی کیوں؟ جیسے ہم نے ولیم کو مارا ہو۔ روز بولی۔ وہ مرانٹس ہے زندہ ہے سالہ۔۔۔۔۔ میکس بولا۔

ہاں جو بھی ہے۔ روز نے کہا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

دیے تمہارے پاپا پہلے ادھر فارم ہاؤس میں ہی رہتے تھے نا؟ گھوڑیا نے پوچھا؟

ہاں اور ہیلو وین منانے گھر آئے تھے پر شام کو آئے تھے اور رات کو پھر واپس لوٹ گئے جب دادی بیمار تھی۔ پھر دادی کے انتقال کے بعد وہ کچھ ہفتے ادھر ہی رہے اور بعد میں نیویارک واپس آ گئے۔۔۔۔۔ جبکہ میں می کے ساتھ بہت پہلے یہاں آئی تھی بھی۔ بھی۔۔۔۔۔

می تو نیویارک ہی رہنا پسند کرتی تھیں۔۔۔۔۔ ان کو یہ فارم ہاؤس اتنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ جبکہ ڈیڈ بولتے کہ وہ انہیں اس قصبے کا سب سے اچھا گھر لے کر دیں گے جب تو انہیں آنا ہی پڑے گا۔ پردادی کے انتقال کے بعد ڈیڈ بھی ہمارے ساتھ نیویارک ہی میں رہنا شروع ہو گئے۔

بس کچھ دن یہاں رہے تھے۔ دادی کے انتقال کے بعد حالانکہ وہ نیویارک میں کام کرتے ہیں۔ لیکن ان کو اس جگہ سے کافی لگاؤ ہے۔ روز بولی تھی۔

ہے نہیں تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ جب سے تمہاری دادی کا انتقال ہوا اس کے بعد وہ یہاں شاید آئے بھی نہ ہوں گے۔ میکس بولا۔

ہاں صحیح کہا تم نے۔ روز نے کہا۔

لوٹنے گئے۔ کوئلے بولا۔

سب گاڑی سے اترے مارک پہنے۔ جبکہ



جھول رہا تھا۔ میکس نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔ پارک بہت بڑا نہ تھا۔ پر کافی رش تھا۔ جھولے گئے ہوئے تھے۔ چیزوں کے اٹھال گئے ہوئے وہ اندر داخل ہوئے۔ جیتا تم ٹھیک ہو؟ بوڑھی نے پاس آ کر پوچھا۔ مگر ولیم جواب دیے بغیر روز کے فارم ہاؤس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے چہرے پر بکرے کا ماسک پہنا ہوا تھا۔ جس کے اوپر دو سینک بھی بنے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی جھری تھی۔ ”بہت برا ہونے والا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا۔“

”واپس چلے جاؤ۔“ بوڑھی بوڑھائی۔ سب اندر شور و غل میں مشغول تھے مگر روز ایک سائیز پر کھڑی تھی اس نے ماسک پہنا ہوا تھا۔ کولے پاس آیا۔

کیا ہوا؟ وہ بولا۔  
کچھ نہیں۔ روز نے کہا۔  
ابھی تک جیک کی حرکت کی وجہ سے پریشان ہو؟  
کولے نے پوچھا۔  
ہاں وہ نہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ روز بولی۔  
وہ اس لئے کہ جیک غلط حرکت کی تھی۔  
کولے نے وضاحت کی۔

مجھے کچھ نہیں لگ رہی۔ وہ ہمارے پیچھے ہی نہ پڑ جائے۔ وہ بوڑھی کچھ تو جانتی ہے۔ روز نے آشفاق کیا۔ تم بھی ناروڑ۔ کیوں پیچھے پڑ گئے؟ صرف ایک بوتل جینے کی وجہ سے؟ اور بوڑھی۔ وہ تو بے ہی باگل۔ چلویشن نہ لو۔ کولے بولا تو روز ہلکا سا ہانسی مسکرائی۔

☆.....☆.....☆  
چوکیدار کھڑا تھا اس نے بکرے والے ماسک پہنے ہوئے فیس کو دیکھ لیا تھا جو آگے بڑھ رہا تھا۔ ولیم نے بڑی جھری سامنے کی تو چوکیدار ڈر گیا۔ کون ہو تم؟ چوکیدار نے پوچھا۔ اور رائفل سیدھی کر لی۔  
ولیم نے جھری زور سے جھنگی چوکیدار کی بائیں آنکھ میں گھسائی۔  
چوکیدار دوسرے ہی لمحے زمین پر جا گر۔ ولیم

نے گیت کھولا اور اندر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ جیک جب کچھ سنبھل چکا تو بولا۔  
تو کس نے کہا تھا اتنی پینے کو۔ میکس نے کہا۔  
میں باہر کا چکر لگا لوں۔ جیک بولا اور باہر نکل گیا۔ گوریلا اور سوزی سب کو ہیلوین ویش کر رہی تھی۔ ولیم نے پورے فارم ہاؤس کو آگ لگا دی تھی پورا فارم ہاؤس آگ میں جل رہا تھا۔

بوڑھی باہر لگی۔ ولیم اب پارک کی طرف جا رہا تھا وہ جیسے ہی بوڑھی کے گھر کے پاس پہنچا تو بوڑھی اسے پکڑتے ہوئے بولی۔ ایسا مت کرو۔ جو اصل مجرم ہے اسے سزا دو ان کو چھوڑ دو۔ اس نے بوڑھی کو دیکھا۔ وہ ماسک اس پر بہت بھیانک لگ رہا تھا اس کے ہاتھ جلے ہوئے تھے۔ وہ خوفناک سی آواز میں بولا۔ اگر مجھ سے دشمنی تھی تو مجھے مار تے میری بیوی بچوں کا کیا قصور تھا؟ ان سب کے بعد اصلی مجرم کی بھی باری آئے گی۔ یہ بھی تو اسی کے ہی گئے ہیں۔ وہ بولا۔

☆.....☆.....☆

شیرف آپ کو نہیں لگتا کہ ولیم اس ہیلوین کوئی ہنگامہ کرے گا؟ ایک پولیس والے نے پوچھا۔  
بہت بہبود سوال ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں لگتا کہ جو پولیس والے لڑے ہوئے تھے وہ ولیم نے کئے تھے۔ وہ تو ہمیں گمراہ کرنے کے لئے ایسا ڈرامہ کیا ہوگا کسی نے۔ شیرف نے کہا۔

ارے ہاں.....! کچھ نہیں جاؤ وہ فائل تو لاؤ دیکھو ذرا۔ وہ عورت گمشدگی کی کوئی رپورٹ لکھوا کر گئی تھی دن کو۔ شیرف نے سنی ان سی کر کے اپنا حکم دیا۔

☆.....☆.....☆

ارے جیک کہاں ہے؟ کولے نے میکس سے پوچھا۔  
طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی رہی۔ باہر گیا

ہے۔ میکس بولا۔

روز گوریلا اور سوزی کی طرف چلی گئی۔ آؤ اسٹال سے کچھ خریدتے ہیں۔ سوزی نے کہا۔  
نہیں پہلے ہی جھولے میں بیٹھے ہیں گوریلا بولی۔

ہاں ٹھیک ہے روز نے کہا۔  
میکس اور کولے کو بھی بلا لاتے ہیں۔ سوزی بولی۔

نہیں رہنے دو۔۔۔۔۔ ہم لڑکیوں میں ان کا کیا کام؟ گوریلا نے ہنس کر کہا۔

جیک سر کو پکڑے ہوئے باہر آ رہا تھا۔ یعنی وہ کافی آگے نکل آیا تھا ان کی وین کچھ آگے پارک کی ہوئی تھی۔ وہ وین کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر گزری۔

اتنے میں اسے ایک بکرے کا ماسک پہنے ہوئے آدمی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ جلے ہوئے تھے۔ اور ایک ہاتھ میں جھری اور دوسرے میں نوکا تھا۔ کچھ اور 2 یا تین گاڑیاں فاصلے سے پارک کی ہوئی تھیں۔ جیک اکیلا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے ولیم کی طرف بوتل جھنگی تھی۔ یہ کون ہے؟ ولیم جیک کے پاس آ کر رک گیا۔

ہائے۔۔۔۔۔ ہیلوین۔ جیک نے کہا۔  
جیک سمجھ رہا تھا وہ آگے نکل جائے گا پر وہ کھڑا رہا۔ تم مجھے گھر کیوں رہے ہو؟ تم نے تو صحیح خوفناک بن کر ہیلوین کی تیاری کی ہے۔  
اتنے میں جیک کی نظر ولیم کے ہاتھ پر پڑی۔  
جلے ہوئے ہاتھ۔ جیک بولا۔

ارے قصاب کے بچے ہاتھوں کو کیا کیا؟ کہیں آگ میں ڈال کر۔۔۔۔۔ جیک بولتے بولتے رک گیا۔  
قصاب سے فوراً اس کے ذہن میں ولیم کی یاد آ گئی۔ جلے ہوئے ہاتھ کیوں ہیں وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا۔

اوہ گاؤ وہ بولا۔ Happy halloween

۔۔۔۔۔ ولیم نے کہا اور جھری پیٹ میں دے ماری آ۔ جیک کی چیخ نکل گئی وہ گمراہ رہا تھا وہ مڑا کہ ولیم نے نوکا اس کے سر پر دے مارا۔  
تھیں نہیں لگتا کہ کافی دیر ہو گئی جیک کا یہ نہیں

کہ واپس کیوں نہیں آیا۔ کولے بولا۔

ہاں میں دیکھ کر آتا ہوں۔ میکس بولا۔ ”میں بھی چلوں؟“

نہیں تم انجوائے کرو۔ میں بس 5 منٹ میں اسے لے کر آیا۔ میکس نے کہا اور باہر کی طرف جانے لگا۔ میکس وین تک آیا اسے جیک کہاں چلا گیا اتنے میں میکس کی نظر زمین پر پڑی خون۔۔۔۔۔ وہ ڈرا ہوا بولا اس نے وین کا پیچھے والا دروازہ پیچھے کھسکاتے ہوئے کھولا۔

آہ وہ ڈر کے مارے چیخ پڑا۔ اتنے میں پیچھے سے زور کی چیخنے کی آواز آئی۔

ولیم بھاگتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ او شٹ۔۔۔۔۔ میکس بولا اور وین میں گھس گیا۔ اور وین کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا وہ فوراً آگے بیٹھ گیا سیٹ پھلا گئے ہوئے۔

شٹ گاڑی کی چابیاں تو کولے کے پاس ہیں۔  
وہ خود سے مخاطب ہوا۔

ولیم غائب ہو گیا تھا۔ یہ کہاں چلا گیا؟ مجھے کولے کو بتانا ہوگا۔

جیک نے موبائل نکالا۔ دوسری طرف سے کولے نے موبائل اٹھایا۔  
لڑکیاں واپس کولے کے پاس آ گئی تھیں۔  
کولے میں خطرے میں ہوں۔ ولیم نے یہاں جیک کوئل کر دیا ہے۔ میکس نے کہا۔

کیا؟ کولے حیرانی سے بولا۔ اتنے میں میکس کی چیخ سنائی دیں۔

میکس میکس۔۔۔۔۔ پھر ساتھ ہی کولے کو عجیب سی آواز سنائی دی۔ Happy halloween اور رابطہ منقطع ہو گیا۔ او میرے خدا۔۔۔۔۔ کولے بولا۔

کیا ہوا کولے روز نے پوچھا۔ تو کولے نے ساری بات بتائی۔  
تو مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ ولیم ہمارے ساتھ کچھ کرے گا۔ روز نے خدشہ ظاہر کیا۔

پہم نے اس کا کیا گاڑا ہے؟ کوئلے نے پوچھا۔  
بچ میں پاگل ہو گیا ہے اور وہ بڑھیا بھی۔ گھوریا  
بول رہی تھی کہ روز نے ٹوکا۔

”بڑھیا ٹھیک کہہ رہی تھی یہ ولیم دشمن ہے ہمارا  
ہمیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“  
پروہ ہمارا دشمن کیوں ہے؟ سوزی نے ٹک آ کر  
پوچھا؟

یہ وہی بڑھیا بتائے گی۔ روز نے کہا۔  
ہمیں شریف کو اطلاع کرنی ہوگی۔ گھوریا نے  
تجویز پیش کی۔

ہاں چلو کوئلے بولا اور سب نکل پڑے۔ باہر  
آتے ہوئے سوزی نے خدشہ ظاہر کیا۔ اگر وہ سامنے  
ہی ہوا تو ہم وین میں کیسے نہیں گے۔ جب وہ ہاں پہنچے  
تو کوئلے نے روز کو اشارہ کیا اور سوزی اور گھوریا ایک کار  
کے پیچھے چھپ گئیں۔ ولیم دین کے پاس کھڑا تھا۔ کوئلے  
نے وین کی چابیاں روز کو دیں۔

مگر تم..... روز بولتے بولتے چپ ہو گئی..... تم  
فکرت کرو..... سیدھے پولیس کی طرف جانا۔ پھر اس  
کے بعد فارم ہاؤس میں..... دروازہ لاک کر دینا اندر سے  
..... اوکے..... میری فکرت کرنا مجھے کچھ نہیں ہوگا.....  
اور پھر کوئلے چلایا۔ اوپر کے مندر والے۔

کوئلے یہ سب باتیں کار کی ڈگی کے پیچھے چھپ  
کر کر رہا تھا۔ مگر پھر اٹھا اور تھوڑا آگے آ کر روز سے چلایا  
تو ولیم اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔ کوئلے پارک کی طرف  
دوبارہ بھاگ پڑا۔ ولیم بھی پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس نے  
لڑکیوں کو نہ دیکھا۔ بھاگ کر روز نے کھڑے ہوتے ہوئے  
کہا۔ تو گھوریا اور سوزی نے بھی دوڑ لگا دی۔ روز نے  
آگے والا دروازہ کھولا۔ سوزی اور گھوریا نے پیچھے والا  
دروازہ کھولا تو ان دونوں کی چٹیں نکل گئیں۔

چیک اور سیس کی لائیں پڑی ہوئی تھیں۔ گھوریا  
آگے چلی گئی اور آگے روز کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سوزی بچھلی  
سیٹوں پر دروازہ ہو گئی..... وین تیزی سے چل پڑی۔

☆.....☆.....☆

کوئلے پارک کے اندر داخل ہوا اس کا ماسک  
کب کا اتر چکا تھا۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ ولیم بھی پارک میں  
انٹر ہوا۔ کوئلے نے دیکھا کچھ دور جھولوں کی طرف ایک  
پولیس والا کھڑا تھا۔

شاید یہ ابھی آیا ہو۔ ادھر۔ کوئلے نے سوچا وہ  
بھاگتا اس کے پاس گیا اور بتایا کہ اس کے پیچھے قاتل لگا  
ہوا ہے۔ ولیم پولیس والے کی طرف بھاگتا آیا۔ ”رکو“  
پولیس والے نے پھل سامنے کی طرف کرتے ہوئے کہا  
کہ اچانک ولیم نے دوسری طرف دوڑ لگا دی اور جھوم میں  
گم ہو گیا۔ سب نے ماسک پہنے ہوئے تھے۔ وہ غائب  
ہو گیا تھا۔ ”تم ڈرو مت“ پولیس والے نے کہا اور آگے  
گیا۔

ولیم اسٹال کی طرف بڑھ گیا تھا اس نے فوراً ایک  
ماسک اتار لیا..... اوئے سیٹے تو دو دکان والا بولا۔ ولیم  
تیزی سے نکل گیا اور رش میں گم ہو گیا اس نے ایک سائیڈ  
پر جا کر بکرے والا ماسک اتارا اور آدھے جلمے جلمے ہوئے  
چہرے پر دوسرا ماسک پہن لیا۔ یہ کسی بھوت کا ماسک بنا  
ہوا تھا سارا سفید صرف آنکھوں اور ہونٹ کے گرد سیاہ  
لائیں لگی ہوئی تھیں..... سب جگہ دیکھ لیا..... مگر پتہ نہیں  
کہاں چلا گیا۔ اس پولیس والے نے کہا کہ کھرچ کی  
آواز آئی اور پولیس والا جھٹکے کی طرح مل کر رہ گیا۔ اس  
کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

کیا ہوا؟ کوئلے نے پوچھا کہ پولیس والا دم  
سے نیچے مگر اس کی کمر میں چھری تھسی ہوئی تھی۔ جو ولیم  
نے دور سے دیکھی تھی۔

اوٹ کوئلے بولا۔ ولیم بھاگتا آ رہا تھا۔ سب  
لوگوں میں جھگڑ رچ گئی تھی سب بھاگتے گئے کوئلے نے  
پولیس والے کے ہاتھ سے پھل لیا اور بھاگ نکلا۔ اتنی  
رش میں ولیم اسے ڈھونڈتا ہی رہا اور وہ پارک سے باہر  
نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

وین تیزی سے پولیس اسٹیشن کے سامنے رکی۔  
تینوں لڑکیاں باہر نکلیں اور اندر شریف کو شروع سے آخر

تک سب سناؤ والا۔ کچھ دیر میں پولیس کی دو کاریں وین  
کے آگے چل رہی تھیں۔

وین گھوریا چلا رہی تھی۔ کیونکہ روز دین سے اتر  
گئی تھی۔ وہ بوڑھی عورت کے گھر جانے والی تھی۔

گھوریا کے ساتھ سوزی بیٹھی ہوئی تھی۔ تہا رے  
بال سے ہمیں فارم ہاؤس جانا چاہئے تھا۔ سوزی بولی۔  
نہیں..... جب تک میں ولیم کو اپنی آنکھوں کے  
سامنے مڑتا نہیں دیکھوں گی۔ مجھے یقین نہیں ملے گا۔ گھوریا

ولی۔  
ولیے بھی فارم ہاؤس میں اکیلے رہنا ہمارے  
لئے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ گھوریا پھر بولی۔

پولیس کی کاریں پارک کی طرف آ رہی تھیں اور  
دوریا کی وین بھی پیچھے تھی۔

اچانک پولیس کی کاریں رکیں انہوں نے بھی  
وین روکی..... کوئلے آ رہا ہے گھوریا بولی اور بھی لوگ  
لگ رہے تھے..... سب نے ماسک اتار دیے  
تھے..... جبکہ ولیم ماسک پہنے ہوئے تھا۔

☆.....☆.....☆

بوڑھی نے دروازہ کھولا تو روز گھبرائی ہوئی اندر  
کی؟ تم؟..... بوڑھی عورت بولی۔

چلیز مجھے بتائیں وہ صرف ہمارے پیچھے ہی  
ہوں پڑا ہوا ہے؟ آپ نے پہلے بھی مجھے یہاں سے  
لے کر کہا تھا۔ روز نے کہا تو بوڑھی بول پڑی۔

ولیم اپنی بیوی بچوں سے بہت پیار کرتا تھا وہ ان  
کی کمری نہیں سکھاتا تھا اس بیویوں کی رات میں چھت پر  
ی جب میں نے دیکھا کہ کچھ پولیس والے آئے انہوں  
نے دستک دی تو ولیم نے دروازہ کھولا۔ انہوں نے ولیم کو  
بڑا لیا اور اندر کھس گئے..... انہوں نے ولیم کے منہ پر  
ب لگا دی اور اسے باندھ دیا۔ پھر اندر فائرنگ کی  
لازیں آئیں اور ولیم کی بیوی اور دونوں بچوں کی لائیں  
اس والے گھمٹے ہوئے آئے.....

ولیم چیخ بھی نہیں سکھاتا تھا۔ پھر انہوں نے ولیم کو  
ر کے اندر پھینکا اور آگ لگا دی۔ جب انہوں نے

ولیم کو اندر پھینکا تب اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے تھے  
کیونکہ وہ اسے گھر کے اندر بھاگتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔  
یعنی چھٹنا چلانا اور تگ و دو کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے  
تھے۔ مگر ان کی یہی سب سے بڑی غلطی تھی۔ ولیم کو آگ  
تو لگ گئی تھی مگر اس نے گھر کے پچھلے دروازے سے  
نکل کر اپنی جان بچائی تھی کیونکہ اس گھر کے پیچھے ایک  
ندی ہے ولیم نے اس میں چھٹنا لگا لی تھی۔

جب سب لوگ تماشا دیکھ کر چلے گئے تو میں نے  
خود اس ندی کے قریب جا کر ولیم کو دیکھا تھا۔ وہ آدھا جلا ہوا  
تھا۔ میں اسے گھر لے آئی تھی۔ مگر وہ اس حد تک خونناک  
ثابت ہو سکتا ہے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ بوڑھی بولی۔

یہ سب کارنامہ پولیس والوں نے کس کے کہنے  
پر کیا تھا؟ روز نے دھکی ہو کر پوچھا۔

ایک شخص ولیم کا گھر خریدنا چاہتا تھا کیونکہ کوئی  
شک نہیں کہ ولیم کا گھر اس قصبے کا سب سے خوب صورت  
اور بڑا گھر تھا..... مگر اب تو یہ مکمل تباہ ہو چکا ہے۔ اگرچہ  
ولیم ایک قصاب تھا پر بہت مہیر تھا۔ پر دل کا بہت اچھا تھا۔  
سب لوگ اس کے عالی شان بنگلہ نما گھر کی تعریف کرتے  
تھے۔

ایک دن میں نے ولیم کو کسی کے ساتھ لڑتے  
دیکھا۔ وہ شاید ولیم کا گھر خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن ولیم کسی  
صورت اپنا گھر بیچنے کو تیار نہ تھا۔ ولیم نے اس آدمی کا  
گر بیان پکڑ لیا۔ اس نے اپنا گر بیان چھڑوایا اور انگلی  
دکھاتے ہوئے چلا گیا۔ جیسے وہ ولیم کو وارنٹک دے رہا  
تھا۔ پھر اسی شام کو اس آدمی نے کچھ پولیس اہلکاروں کو  
ساتھ لیا ہوا تھا۔ اور دوبارہ ولیم کی ان کے ساتھ بحث  
ہوئی اور پھر اسی رات کو ولیم کے گھر آگ لگ گئی تھی.....  
وہ بیویوں کا دن تھا۔ جب ولیم کا اس آدمی کے ساتھ  
معمولی جھگڑا ہوا تھا اور رات کو اتنا بڑا واقعہ ہو گیا.....  
بوڑھی خاموش ہو گئی۔

پر اس جھگڑے کا ہم سے کیا تعلق؟ روز بولی۔  
تعلق ہے۔ کیا تم جانتا نہیں چاہو گی کہ وہ آدمی  
کون ہے؟ بوڑھی نے کہا۔

لحد بہ لحد بدلتے حالات و واقعات، سسپنس اور خوف میں ڈوبی روداد جو پڑھنے والوں کو اپنی عمر میں جکڑے رکھے گی۔

”یار! وہ جو کہا جاتا ہے ناں کہ تلاش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ تو ہم اگر انہیں سچے دل سے تلاش کریں گے تو وہ ہمیں کیوں نہیں مل سکتے۔ واقعی یہ بات بالکل صحیح تھی۔ یہ مقولہ بالکل سچ تھا۔ کہ سچے دل سے تلاش کیا جائے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ پروفیسر شیرازی تو اس زمین کی ایک عام سی مخلوق تھی۔ ہمیں ایک بہت ہی بڑے میڈیکل سنٹر سے نکلنے نظر آگئے۔ پیسا کھینوں کے سہارے چل رہے تھے۔ غالباً مصنوعی ٹانگیں لگوائیں تھیں۔ فالج نے جسم کا نچلا حصہ مفلوج کیا تھا۔ لیکن اس وقت کافی بہتر حالت میں نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں اور ہم نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ ان کا بس نہیں چلا تھا ورنہ ہم دونوں کو اٹھا کر اپنے سینے میں سجا لیتے۔“

”اوئے..... تم..... اوئے تم!.....“ وہ اپنی پسندیدہ بات کو ہمیشہ تین مرتبہ کہتے تھے۔ پھر وہ ہمیں کہاں پھوڑتے، اپنے ساتھ لے گئے جس عمارت میں پہنچے وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ بہت ہی عالی شان، بہت ہی شاندار، وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ ”یہ میری کونٹی ہے۔“

”پروفیسر..... آپ اتنے دولت مند کب سے تھے؟“

”یار یہاں آکر بنا ہوں۔“

”کیسے؟ کیا مطلب؟“

”اچھا مجھ سے انٹرویو لینے کی بجائے تم لوگ یہ بتاؤ..... کہ تم کب واپس آئے۔“

”صرف چار دن پہلے۔“

”کس پروگرام کے تحت آئے ہو؟“

”نہیں سر ہمارے پروگرام اب ہوتے ہی نہیں ہیں۔“

”یہاں آنے کا مقصد بتاؤ۔“

”کچھ نہیں۔ بس دل چاہا کہ اپنی سرزمین، اپنی مٹی کی خوشبو سونگھوں، تو چلے آئے یہاں پر۔“

”کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

”اصل میں پروفیسر شیرازی آپ بتنا ہم لوگوں کے بارے میں جانتے ہیں اتنا بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا۔ میرا مطلب صرف اتنا سا تھا کہ ہم یہاں جو کچھ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ وہ کم از کم جرم نہیں ہے۔“

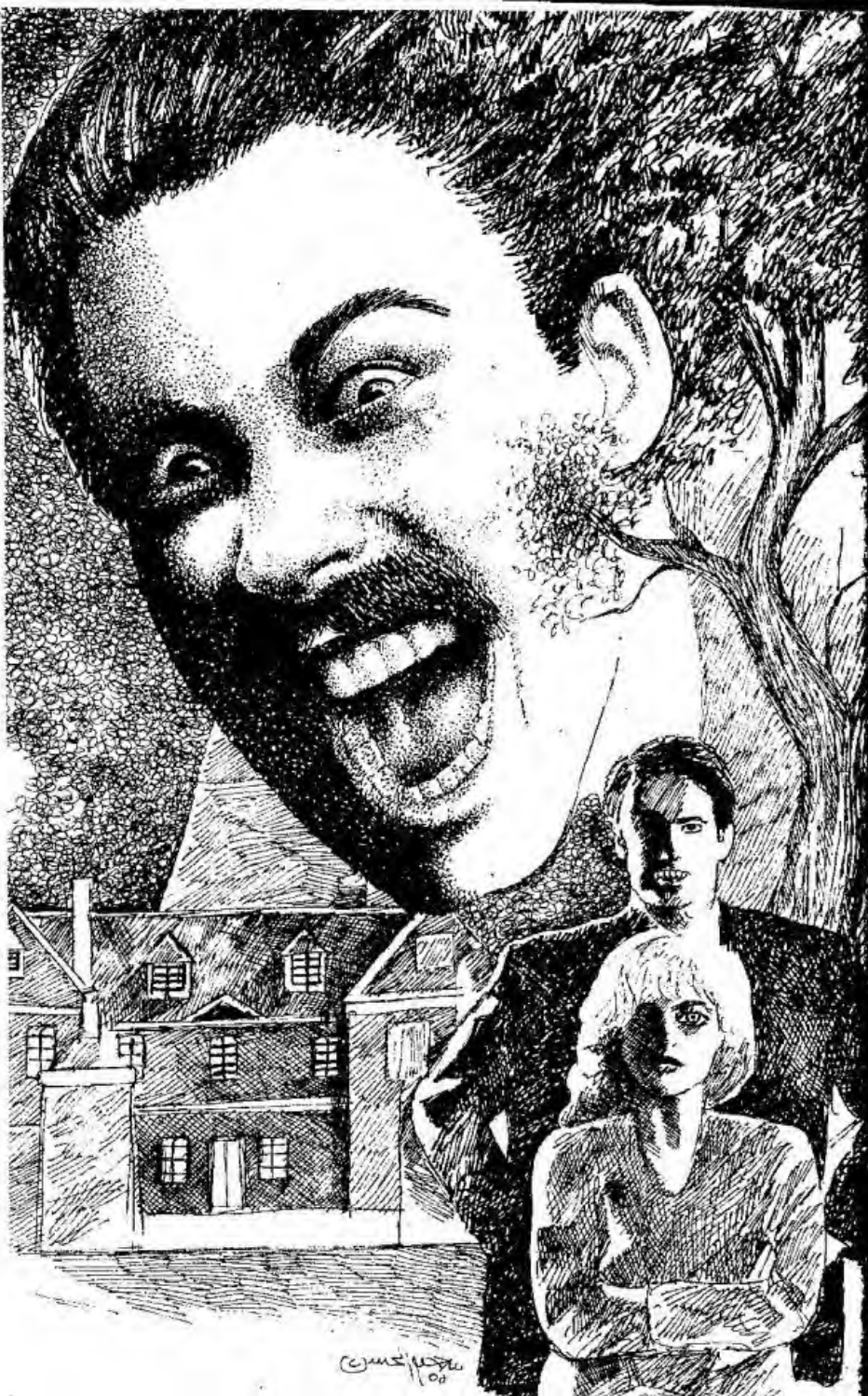
”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آئے تو تھے۔ دوسرا خیال ذہن میں لیکر مگر یہاں آنے کے بعد دل نے کہا کہ اپنی سرزمین پر جرم نہیں کرنا چاہیے بس ایسے ہی کام کیا جائے۔“

”گڈ..... ویری گڈ..... ٹھیک..... تو پھر میں تمہیں ایک آفر کرتا ہوں۔“

”جی.....“

”دیکھو..... میں نے ایک چھوٹی سی





آرگنائزیشن بنائی ہے۔ ایک تنظیم سمجھ لو۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں بذات خود کچھ نہیں کر رہا۔ کچھ لوگوں سے میرا رابطہ ہے۔ مجھے چھوٹے موٹے ایسے کام مل جاتے ہیں۔ جن میں میرے ٹریڈ کئے ہوئے چند افراد کو شل کرتے ہیں۔ اور ان کی تکمیل کر ڈالتے ہیں۔ مجھے انکا معاوضہ مل جاتا ہے۔

”کس طرح کے کام؟“

”جرم کے خلاف۔ جرم کے حق میں نہ کہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی مشکل کا شکار ہو گیا ہے۔ میں اس کی مدد کرتا ہوں۔ میرا مطلب ہے۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ۔ اور اس کا بھرپور معاوضہ لیتا ہوں۔“

”یہ تو پرائیویٹ جاسوسی کا ادارہ ہو گیا۔“

”کچلی بات تو یہ کہ ہمارے ملک میں پرائیویٹ جاسوسی کے لائسنس جاری نہیں ہوتے یا ان کا کوئی رواج نہیں ہے۔ مختلف طریقوں سے کچھ لوگ یہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن مشکلات کا شکار ہیں۔ کیوں کہ لوگ جانتے ہی نہیں ہیں۔ البتہ میرے کچھ کلائنٹ ایسے ہیں۔ جن سے مجھے آمدنی بھی ہوجاتی ہے اور وہ میرے لئے کام بھی مہیا کرتے ہیں۔“ ناظم پاشا نے میرے طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

”یارا ایک بات کہوں۔ بات بڑی زبردست ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہمارے حق میں..... پھر میں نے ناظم پاشا سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد پروفیسر شیرازی سے کہا۔

”ہمارے لئے بتائیے پروفیسر! کہ ہمارے پاس آپ کے لئے کوئی گنجائش کھل سکتی ہے۔“

”گنجائش ہی گنجائش ہے۔ میں ان چند ہامعقول لوگوں سے تمہاری ملاقات کراؤں گا جو قطعی وقتی طور پر اس قابل نہیں ہیں کہ میرے معیار کے مطابق کام کریں۔ لیکن بہر حال میں کسی نہ کسی طرح ان سے کام چلا رہا ہوں۔ البتہ میں تم دونوں پر مکمل بھروسہ کر سکتا ہوں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے تو غلط نہیں ہوگا میری ایک

دعا پوری ہوگئی ہے۔ کہ مجھے کچھ ایسے لوگ مل جائیں جو میرے مرضی کے مطابق ہوں اور وہ تم لوگ ہو۔“

”ویری گڈ..... پھر تو یوں سمجھ لیجئے کہ میں خوشی سے یہ کام کرنے کیلئے تیار ہوں۔“

”بس تو تم لوگ بھی یہ سمجھ لو کہ آج سے تم ہمارے کارکن بن گئے۔ کہاں قیام ہے؟ میں نے اپنے ہوٹل کا نام بتادیا۔ تو پروفیسر شیرازی نے کہا۔

”نیوے لائن..... نیوے لائن کے فلیٹ نمبر چھپیس، ستائیس، خوبصورت فلیٹ ہیں۔ آئے سائے ہیں۔ ان میں ایک تمہارے لئے اور دوسرا ناظم پاشا کے لئے۔ ہر طرح کی ضرورت کی تمام چیزیں تمہیں وہاں ملیں گی۔ آرام سے وہاں رہو۔ ٹیلی فون اور دوسری تمام چیزیں وہاں موجود ہیں۔ میں اپنا ایک آدمی تمہارے ساتھ کر دوں گا۔ وہ تمہیں ہر طرح کی سہولیات فراہم کر دے گا۔ کیا کہتے ہو؟“

”ہم دونوں اگر ایک ہی فلیٹ میں رہیں تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔“

”یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ ہر شخص کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ ہر شخص کی ایک منزل ہوتی ہے۔ ہر شخص کی کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اور پھر ایک دوسرے کا اچھا سا شہمی بننے کے لئے ضروری ہے کہ تھوڑا سا فاصلہ رکھا جائے۔“

”ٹھیک ہے پروفیسر! اور اس طرح ہم پروفیسر کے ساتھیوں میں شامل ہو گئے۔ ملازمت کا تو خیر کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پروفیسر نے ہمیں دنیا کی تمام سہولتیں مہیا کر دیں تھیں۔ ہمارے پاس اپنی اپنی الگ کار بھی تھی۔ اور اس کے علاوہ پروفیسر نے ہمارے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم بھی جمع کرا دی تھی۔ ہمیں اُمید نہیں تھی کہ وطن میں ہماری اس طرح بڑی برائی ہوگی اور ہماری مشکلات کا حل اس طرح ہمارے پاس موجود ہوگا۔ پروفیسر ہمیں باقاعدہ تربیت دینے لگا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہمیں کیا کیا کچھ کرنا ہے اور ہم بہر حال اس کے ساتھ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے کام کرنے

لگے۔ پروفیسر اعلیٰ ترین شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے یہاں بڑے تعلقات ہو چکے تھے۔ اور نجانے کس کس سے رابطہ قائم کر کے وہ اپنے کام سرانجام دے رہا تھا۔ درحقیقت اس دوران اپنے وطن کو جاننے کا موقع بھی ملا تھا۔ اور ہم نے بہت سی باتیں جان لی تھیں۔ ابتدائی معاملات طے ہونے کے بعد۔ پروفیسر شیرازی نے ہمیں اپنے بارے میں بتایا تھا۔

”میں نے یہاں آنے کے بعد بہت کچھ کیا ہے۔ حکومت کے ایسے بہت بڑے ارکان جو اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہیں اور جن کے بارے میں یہ کل کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ بادشاہ گر ہوتے ہیں۔ مجھے ان کی سرپرستی حاصل ہے۔ اب میں ان گدھے ساتھیوں کے ذریعے کئی ایسے کام کر چکا ہوں جس سے انہیں بڑے فائدے پہنچتے ہیں۔ بہت سے ملکی معاملات میں یعنی غیر ملکی سازشوں کے سلسلے میں بھی میں نے کام کیا ہے اور مجھے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ تم لوگ یوں سمجھو کہ بہت ہی کچھ کی کے ساتھ اپنا فرض پورا کر سکتے ہو۔ میں اس سلسلے میں بہت جلد ایک منصوبہ ترتیب دے رہا ہوں۔ جس میں تمہیں کام کرنا ہوگا۔“

”مثلاً؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ راج گڑھ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ بہت ہی اعلیٰ درجے کی ریاست ہے۔ راج گڑھ کی ریاست کی رانی، راجا، رانیوں کا دور تو خیر ختم ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں۔ جو راجا اور رانیوں کی طرح ہی زندگی گزارتے ہیں۔ میں تم سے راج گڑھ کی مہارانی کا بعد میں تعارف کراؤں گا۔ فی الحال تم یہ سمجھ لو کہ تمہیں وقتی طور پر اس کیلئے تیار ہونا ہے۔ کہ ہم راج گڑھ میں ایک بڑے کام کا آغاز کر رہے ہیں۔“

”بڑا کام.....“

”ہاں ابھی تک مجھے جتنی تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ان کے تحت میں اسے بہت بڑا کام کہہ سکتا ہوں۔“

”گڈ.....“

”پروگرام کیا ہوگا۔“

”سب سے پہلے تمہیں راج گڑھ جانا ہوگا۔“

”تہا۔“

”ہاں..... کبھی اس بات اس بات پر غور نہ کرنا کہ ناظم پاشا تمہارے ساتھ ہے یا نہیں یا ناظم پاشا کے کبھی اس مسئلے میں نہیں سوچنا چاہیے کہ تم اس کے ساتھ ہو یا نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ضرورت کے تحت سارے کام کئے جائیں گے اور ضرورت کے وقت ایک ایک مہرہ آگے بڑھایا جائے گا۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“

”راج گڑھ میں تم بڑے آرام کے ساتھ جاؤ گے اور جہاں تک میرے علم میں ہے۔ میری جان میں تم سے کہہ رہا ہوں ناظر سلطان! کوشش کرنا کہ شراب تم تک نہ پہنچے۔ کیوں کہ شراب کے چند پیگ ہی تمہیں ساتوں آسمانوں کی سیر کرا دیتے ہیں۔ کیا سمجھے؟“ ایسے کئی واقعات خود پروفیسر شیرازی کے علم میں تھے۔ جب میں نے شراب پی لی اور اس کے بعد نجانے کیا کیا بن گیا تھا۔ ایک بار تو خود پروفیسر شیرازی سمجھتے سمجھتے رہ گیا۔

انگلینڈ کے ایک شاہی خاندان کی تقریب میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور میں اس تقریب میں میں نے بہت ہی پرانی شراب کے صرف تین پیگ لئے تھے اور اس کے بعد میں نے ڈیوک اڈیمبر اکو پیچ کر دیا تھا کہ اصل ڈیوک اڈیمبر امیں ہوں۔ بڑی مشکل پیش آگئی تھی اور بڑی مشکل سے مجھے قابو میں کیا گیا تھا۔ یہ پروفیسر کے تعلقات اور شخصیت تھے، جس نے بہت بڑے حادثے سے بچایا تھا۔ ورنہ شاید عمر بھر کی جیل میں سزا پڑتا۔

بہر حال راج گڑھ روانگی ہوئی۔ ایک مسافر بردار طیارے نے ہمیں یعنی مجھے راج گڑھ انرپورٹ پر اتار دیا۔ میں راج گڑھ کشم ہاؤس میں داخل ہوا۔ بہت ہی مختصر سامان میرے ساتھ تھا۔ جس میں ایک سوٹ کیکس اور ایک بریف کیس شامل تھا۔ بریف کیس مکمل

طور پر قابل اعتراض تھا۔ لیکن اسے کھولنے والے خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس کی کیا اہمیت ہے۔ تاہم اس سے قبل ہی دو خوش پوش آدمی اس عمارت میں میرے نزدیک پہنچ گئے۔ اور انہوں نے دو سفید کارڈ نکال کر میرے سامنے کر دیئے۔ میں نے گردن ہلائی۔ ویسا ہی سفید کارڈ میرے پاس موجود تھا۔ جس کے بارے میں پروفیسر شیرازی نے مجھے تفصیل بتادی تھی۔

”آپ کا سامان جناب ا“ ان میں سے ایک نے پوچھا اور میں نے سامان کی طرف اشارہ کر دیا۔ میرا سامان ابھی کنویز بیلٹ پر نہیں پہنچا تھا۔ ان دونوں نے آگے بڑھ کر میرا سوٹ کیس اور بریف کیس اٹھالیا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر کی طرف چل پڑے۔ کسم افسران نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے میں ٹیٹ گیسٹ تھا۔ ان پورٹ کے باہر ایک لمبی، سیاہ، شاندار مرسلہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے باوردی ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا اور میں اس کے اندر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں افراد میرے دونوں سمت بیٹھ گئے۔ میں باہر نکلا تو ڈرائیور نے لگا۔ درحقیقت راج گڑھ تو واقعی کوئی قدیم راج دھانی معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ شہر انتہائی جدید تھا۔ خوبصورت عمارتوں اور ہریالی کا شہر۔ کارجن سڑکوں پر تھی دونوں سمت میں بڑے خوبصورت باغات لہرا رہے تھے۔

بہر حال ایسے سرسبز علاقے بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میں خاموشی سے ان جگہوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ہم جس عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کسی ایسے علاقے کی عمارت ہے جو بس ایک گیر مصروف سی ریاست کا علاقہ ہو۔ عمارت و محصور میں منقسم تھی۔ باہر ایک بہت وسیع لان تھا اور عمارت کے چاروں طرف درختوں کے جھنڈ لہرا رہے تھے۔ مخصوص طرز کے سفید پتھروں کی روش سے گزر کر کار پورچ میں پہنچ کر رک گئی۔ یہاں چار آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے دروازہ کھولا اور ہم نیچے اتر آئے۔

کھڑے ہوئے لوگ مہمان خانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مجھے گیسٹ ونگ کی طرف لے گئے۔ عظیم الشان گیسٹ ونگ کے کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ کچھ اور لوگ بھی یہاں گیسٹ ونگ کے کمرے میں موجود تھے۔ میرا کمرہ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دو ملازموں نے میرا سامان نکال کر الماریوں میں سجایا اور اپنی خدمات پیش کر دیں۔

”جناب عالی جو بھی ضرورت ہو ہم دونوں آپ کی خدمت کیلئے حاضر ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ پروفیسر شیرازی نے جو مختصر تفصیلات مجھے بتائی تھیں۔ اس کے بارے میں مختصر تفصیل یہی کہہ دیا تھا کہ بے شک ختم ہو گئی ہیں۔ لیکن اب بھی ہمارے وطن میں ایسے ایسے اعلیٰ پائے کے جاگیردار موجود ہیں۔ جو راجاؤں، اور رانوں جیسی حیثیت ہی رکھتے ہیں۔ رانی ہما خانم راج گڑھ کی حکمران تھیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ راج گڑھ ہی نہیں بلکہ آس پاس کے ستائیس گاؤں اور ان کے قرب و جوار میں پھیلی ہوئی زمینیں، رانی صاحبہ کی ملکیت ہیں۔ ہما خانم کے شوہر راجہ گل نواز دنیا سے جا چکے ہیں۔ اور گل نواز کا خاندان راج گڑھ میں پھیلا ہوا ہے۔ بہر حال میرے ذہن میں رانی صاحبہ کا ایک تصور تھا۔ ہما خانم ہی نے کسی خاص مسئلے میں پروفیسر شیرازی سے رابطہ قائم کیا تھا۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر شیرازی نے کہا تھا۔ کہ وقت سے پہلے تمہیں کچھ بتانا تمہاری تو ہیں ہے۔ تم راج گڑھ چلے جاؤ۔ رانی ہما خانم خود تم سے رابطہ قائم کر کے تمہیں تفصیل بتائیں گیں۔ تمہیں وہاں صورتحال پر نگاہ رکھنی ہے۔ بہر حال اس کیلئے انہوں نے کچھ وقت بھی دیا تھا۔ مجھے اور اس گیسٹ ہاؤس میں آکر صرف یہاں کے معمولات سے متاثر ہو کر عیش و عشرت میں وقت گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر چچی بات یہ ہے کہ پہلی بار اس تمام عرصے میں ناظم پاشا مجھ سے الگ ہوا تھا۔ یہ بھی ایک عجوبہ تھی۔ کیونکہ ناظم پاشا کو کسی اور کام میں مصروف کیا

گیا تھا اور ہم لوگوں نے یہ بات، بہر طور اپنے طور پر طے کر لی تھی کہ ہم پروفیسر شیرازی سے بھرپور تعاون کریں گے اور اس کی ضرورت کے مطابق ہی تمام کام پر عمل کریں گے۔ شام کا کھانا گیسٹ ہاؤس کے ایک بہت ہی وسیع ہال میں لگایا گیا۔ یہاں گیسٹ ہاؤس میں عشاء ہوئے دوسرے مہمان بھی موجود تھے۔ جب لوگوں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ یہ سب بڑے سے بڑے لوگ تھے۔ میرا تعارف نادر سلطان کی حیثیت سے ہی کرایا گیا۔ ظاہر ہے نادر سلطان پورے ملک میں کوئی ایک تو تھا نہیں۔ یا اسے کسی حیدر سلطان کا بیٹا تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ان تمام لوگوں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ اور ان میں جو شخص مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس کا نام شاہ زیب تھا۔ تفصیلی تعارف پر مجھے معلوم ہوا کہ شاہ زیب ایڈووکیٹ ہے اور ریاست کے قانونی امور کی نگرانی کرتا ہے۔

چنانچہ رات کو دیر تک میں شاہ زیب کے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر ہم آرام کے لئے اٹھ گئے۔ دوسری صبح ناشتہ بھی ہم نے یکجا کیا۔ لیکن مہمانوں میں میں نے ایک ایسی شخصیت کو دیکھا جو میرے لئے باعث دلچسپی تھیں۔ یہ ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ بڑے عجیب و غریب لباس میں اور سب سے الگ تھلک، رات کے کھانے پر بھی وہ موجود تھیں اور اس وقت بھی۔ لیکن جب اس کا نام میرے سامنے لیا گیا تو میں نے خاص طور سے اسے دیکھا۔ اس کا نام میڈم زردانہ تھا۔

”یہ خاتون کیا زندگی کے آخری ایام یہاں گزارنے آئی ہیں۔“ میں نے جبکہ کر شاہ زیب سے کہا اور شاہ زیب مسکرایا۔

”بہت ہی زبردست عورت ہیں۔ نہانے اس نے اتنی تعلیم کیوں حاصل کی ہے۔ یوں کچھ نیچے آپ مسٹر نادر سلطان! کہ یہ بہت ہی قابل عورت ہے۔ غیر شادی شدہ ہے اور ماہر طبقات الارض ہے۔ رانی صاحبہ نے کسی خاص ہم کے لئے انہیں طلب کیا ہے۔“ شاہ زیب نے مجھے بتایا۔

”ماہر طبقات الارض اور کنواری اور پھر اس قدر تعلیم یافتہ لیکن اپنی شکل و صورت اور چلنے سے تو یہ مگر کن معلوم ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ماہر طبقات الارض میں خصوصی شے یعنی قبرستان سے تعلق رکھتی ہیں۔“ شاہ زیب مسکراتا رہا۔ ریاست کے اصول کچھ بھی تھے۔ لیکن میں اپنی فطرت میں بہر حال آزاد تھا۔ فرصت کے لحاظ مجھے زندگی کے سب سے ٹھن لحات معلوم ہوتے تھے۔ اور سب سے بڑی مشکل میرے لئے یہ پیدا ہو گئی تھی کہ ناظم پاشا کو مجھ سے عارضی طور پر الگ کر دیا گیا تھا۔

بہر حال دوپہر کے کھانے کے بعد جب سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو میں نے خاتون زردانہ کے کمرے کا رخ کیا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ بالکل بیکار بیٹھنا میری فطرت کے خلاف تھا۔ اور ان کے دروازے تک پہنچ کر میں بہت سے منصوبے اپنے دل میں ترتیب دے لئے تھے۔ جب میں نے دروازے پر دستک دی تو چند لحات بعد دروازہ کھل گیا۔ زردانہ صاحبہ ایک خوبصورت کاؤن بدن پر ڈالے ہوئے تھیں اور انہوں نے مجھے دروازے پر دیکھ کر ناک پر چشمہ درست کیا اور دروازے پر ہی کھڑے کھڑے مجھ سے بولیں۔

”جی فرمائیے۔ کیا تکلیف ہے۔“

”پیٹ کے درد کا شکار ہوں اور اندر آنا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ظاہر ہے میرے اس غیر متوقع جواب سے انہیں حیرت ہوئی ہوگی۔ ان کا چشمہ ناک سے گر پڑا۔ جسے انہوں نے بڑی پھرتی سے درست کیا اور جلدی سے بولیں۔

”مذاق فرمانے آئے ہیں آپ؟“

”ظاہر ہے اس عمر میں آپ سے عشق فرمانے نہیں آسکتا۔ براہ کرم مجھے اندر آنے دیں۔“ میں نے ترکی یہ ترکی کہا۔ اور زردانہ خانم جلدی سے ایک طرف سرک گئیں۔ ان کے تصور میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ ان کی عمر اور مرتبے کو نظر انداز کر کے کوئی ان سے اس طرح بھی پیش آسکتا ہے۔ میرا یہ انداز ان کے لئے

اجنبی تھا۔ وہ متحیرانہ انداز میں پلیٹیں اور پھر پلیٹیں۔  
”لیکن آپ کے پیٹ کے درد کا میرے کمرے سے کیا تعلق ہے۔“

”جدا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔“ میں نے کمر پر دوڑوں ہاتھ رکھ رکھا۔  
”سنئے میں آپ کو بدتمیزی کا حق نہیں دے سکتی۔ میں رانی صاحبہ سے شکایت کروں گی آپ کی۔ میں ان کی مہمان ہوں اور مجھے ان کے کام کیلئے یہاں آنا پڑا ہے۔ ورنہ۔ ورنہ۔ ورنہ۔“

”میں آپ سے معافی مانگ لوں گا۔ لیکن براہ کرم یہ بتا دیجئے کہ آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔ میرے پیٹ کا درد ٹھیک نہیں ہوگا۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔  
”دیکھئے میں بہت نرم دل ہوں۔ نرم طبیعت ہوں۔ میں نہیں چاہتی کی میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچے لیکن آپ جس طرح میرے ساتھ بدتمیزی کر رہے ہیں۔ اور جس طرح میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ شاید میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتی۔ کیا کسی کے کمرے میں اس طرح کھس آنا اور اس طرح پریشان کرنا شرافت ہے۔“  
”بالکل نہیں میڈم۔ لیکن آپ ہی بتائیے کہ اگر کسی کے پیٹ میں درد ہو تو وہ کس طرح اپنے آپ پر قابو پاسکتا ہے۔“

”براہ کرم میرے کمرے سے نکل جائیے ورنہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“  
”مجھے صرف ایک بات بتا دیجئے میں چلا جاؤں گا۔“

”جی فرمائیے، آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟“ میں نے ٹھگائیے ہوئے لہجے میں کہا۔  
”دیکھئے نکل جائے یہاں سے ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔“ اس بار مختصرہ زردانہ اپنا صبر کھو بیٹھیں اور حلق پھاڑ کر چیخیں۔

”ٹھیک ہے میں واپس چلا جاتا ہوں۔ آپ مجھے نکال دیں۔ لیکن کان کھول کر سن لو میں آپ کو

کنواری نہیں رہنے دوں گا۔ میری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔ میری زندگی کی طرح بیماری زردانہ۔ میری زندگی میں یہ ناممکن ہے کہ آپ اس دنیا کی رنگینیوں سے دور رہ کر دنیا چھوڑ دیں۔ میں آپ کو کھر دیوں گی موت مرنے نہیں دوں گا۔“ زردانہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس کی دونوں مٹھیاں غصے سے پھینچ گئیں۔ بہر حال اس سے زیادہ مناسب نہیں تھا۔  
چنانچہ میں واپس پلٹ گیا۔

رانی صاحبہ کی طرف سے یہاں آنے والے مہمالوں کو ہر طرح کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔ چنانچہ ایک دلچسپ تجربہ ہوا۔ ایک نوکیلی موشچوں والا پہلوان ہاتھپ کا آدی میرے سامنے پہنچا اور اس نے گردن خم کر کے کہا۔

”جناب عالی! اگر سیر و سیاحت کیلئے باہر نکلتا ہوں تو میں حاضر ہوں۔“

”تم سے زیادہ خوبصورت آدمی یہاں اور کوئی نہیں ہے۔“ میں نے سوال کیا اور وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

”پپ۔۔۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میں سانسیں ہوں۔ سیر و سیاحت کے لئے کھیاں موجود ہیں۔ مم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ وہ بری طرح بوکھلا گیا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔ یہ ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ دل تو چاہا کہ زردانہ بیگم کو اپنی اس سیاحت میں مدعو کروں۔ لیکن ابھی ذرا جو کہ چکا تھا اس کا رد عمل دیکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ احتیاط کی۔ اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ پھر میں نے اس حسین شہر کے کچھ اور حسین مناظر دیکھے اور کافی دیر تک اس کے لوحات کی سیر کرتا رہا۔ اس دوران ذہن میں کچھ نئے منصوبے ترتیب پاتے رہتے۔ آخر کار کافی دیر تک سیر و سیاحت کرنے کے بعد واپس رانی ہما خاتم کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔

اور تھوڑی دیر کے بعد مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ وہاں موجود ملازموں نے اطلاع دی کہ رات کا

کھانا رانی صاحبہ کے ساتھ کھایا جائے گا۔ پروفیسر شیرازی نے رانی ہما خاتم کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا۔ اس نے میرے دل میں ایک تجسس سا پیدا کر دیا تھا کہ دیکھو یہ رانی صاحبہ ہیں کیا چیز۔ لیکن بہر حال اتنا بھی نہیں کہ میں انہیں دیکھنے کے لئے بے چین ہو جاتا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ رانی صاحبہ کو ہر حالت میں خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کرنا تھا۔

رات کو تمام مہمان اندرونی عمارت کی طرف چل پڑے۔ میں نے بھی ایک خوبصورت ڈنر سوٹ زیب تن کیا تھا۔ ایسی دھڑکیوں کے آداب مجھ سے زیادہ کس کو آسکتے تھے۔ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے میں نے بھرپور کوشش کی تھی۔ بہر حال میں ہال میں داخل ہوا۔ جہاں رانی صاحبہ مہمالوں کے استقبال کیلئے موجود تھیں اور درحقیقت مجھے میری کاوشوں کا صلہ مل گیا۔ یعنی میری طرف دیکھنے والی آنکھیں پُر شوق تھیں اور حسیں سے بھرپور تھیں۔ خود رانی صاحبہ نے مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا اور میں نے ان کی نگاہوں میں پسندیدگی کے جذبات پائے تھے۔ وہ بلاشبہ رانی ہی لگتی تھیں۔ بلند و بالا قد و قامت کی مالک انتہائی جاذب نگاہ عمر انٹھائیاں یا تیس کے درمیان ہو گی۔ لیکن جسمانی موزونیت اور رکھ رکھاؤ قابل دید تھا۔ انہوں نے دو لباس سے اور نہ ہی میک اپ سے اپنی عمر کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ چہرے کے تاثرات اور نہ اداؤں سے الہیز پن ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک پروقار مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے گردن خم کی اور نزدیک کھڑی ہوئی اپنی بیکٹری سے پوچھا۔

”ان کی تعریف۔“

”نادر سلطان۔ معرفت پروفیسر شیرازی۔“ رانی صاحبہ نے گردن خم کی لیکن میرے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا تھا۔ وہ کوئچہارا اور باٹ دار آواز مجھے یاد آگئی تھی۔ جو میں نے اس جگہ سنی تھی جہاں وہ خیمے لگے ہوئے تھے۔ اور جہاں مجھے اور ناظم پاشا کو ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آیا تھا۔ اسی آواز میں ایک ایسی کھٹک

اور گرج کی تھی کہ دونوں کی آمیزش بہت ہی خوبصورت لگتی تھی۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ رانی صاحبہ کو دیکھ کر میرے بند ذہن کا خاکہ اچانک ہی کھلا تھا۔ اور میں یہ ہی سوچ رہا تھا کہ یقینی طور پر پروفیسر شیرازی کسی خاص ہی راستے پر چل پڑا ہے۔ بہر حال مہمالوں کے استقبال کے بعد رانی صاحبہ بھی کھانے کی میز پر آ گئیں۔ کھانے کی میز اسٹنڈے شاندار کھانوں سے سجی ہوئی تھی کہ دیکھ کر خود بخود ہی ہموک لگنے لگتی تھی۔  
پھر کھانے کا دور شروع ہو گیا۔

”ہم جانتے ہیں کہ آپ سب حضرات ہماری خواہش پر یہاں تشریف لائے ہیں۔ لیکن ہم معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو میری مصروفیت کے باعث انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ کل ہم آپ سے ضرورت کی بات کریں گے تاکہ وہ ریکی کام ہو جائے۔ جس کیلئے آپ کو زحمت کرنا پڑی ہے۔ اور اس کے بعد آپ جب تک پسند فرمائیں یہاں قیام فرمائیں۔ مہمان خانہ آباد کچھ کر ہمیں دلی مسرت ہوئی ہے۔ کھانے کے بعد رانی صاحبہ نے مختصر اظہار اس کے بعد یہ نشست برداشت ہو گئی۔ مہمان خانے سے واپس آتے ہوئے میرے ذہن میں نجانے کیا کیا خیالات رقصاں تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اس پر اسرار اور خطرناک ماحول میں جبکہ کل دغارت گری کا دور دورہ تھا۔ رانی صاحبہ کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ کیا مجھے اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ صرف آواز سے صورتحال کا جائزہ لینے اور اس پر کوئی بھروسہ کر لینا ذرا عجیب سی بات ہوتی ہے۔ بہر حال میں انہیں سوچوں میں کم تھا کہ شاہ

زیب میرے پاس پہنچ گیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ مائی ڈیئر نادر سلطان آؤ۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے شجیں لگائیں گے۔ آؤ۔“ میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔ شاہ زیب نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد الماری سے ایک بوتل نکالی اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”یہ رانی صاحبہ انتہائی سنجیدہ ہیں۔ ایک بار بھی پینے کے لئے نہیں لی۔ کیا تم بھی اس کا شوق رکھتے ہو یا نہیں؟“



”نہیں شاہ زیب! ہرگز نہیں۔ شراب دیکھ کر ہی میرے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔“

”یار ایسا مت کہو۔ میں تو بڑی امید کے ساتھ تمہیں یہاں لایا تھا۔ اور تو کوئی اس قابل نہیں ہے کہ اسے اس میں شامل کیا جائے۔“

”ایک بہت ہی اہم شخصیت کو تم بھول رہے ہو شاہ زیب۔“

ہوئی۔ اور میں کشمکش کا شکار ہو گیا۔ پھر وہ منحوس شے مجھے اپنے قریب پہنچ لائی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ میرے سامنے آئی ہو اور میں اسے نظر انداز کر سکا ہوں۔ ایک ماضی تھا اس کا بھی۔ بہر حال میں شاہ زیب کے نزدیک پہنچ گیا اور چھوٹی چھوٹی چسکیاں لگتی شروع کر دیں۔ میں نے شاہ زیب سے درخواست کی تھی کہ مجھے دو تین پیگ سے زیادہ نہ دے اور اس کے بعد مجھے میرے کمرے میں پہنچا دے اور شاہ زیب کے وعدہ کر لیا تھا۔ بذات خود وہ مضبوط پینے والا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن تین پیگ کے بعد وہ رک گیا۔ البتہ میں تین پیگ پینے کے بعد ہی عجیب و غریب باتیں سوچنے لگا تھا۔ یہ رانی صاحبہ سو فیصدی وہی عورت تھی جسے میں نے پاپر کی دنیا میں دیکھا تھا۔ پتہ نہیں رانی وہاں کیا کر رہی تھی۔ شاہ زیب میرے صورت دیکھتا رہا۔ اس نے مجھ سے بات چیت کی۔ اور شاید میرے الفاظ میں کچھ گربذخوس کر کے اس نے پتہ باندھ کر دیا اور بولا۔

میں میں نے سوچا کہ رانی صاحبہ نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ کیا میں انتقامی عام انسان ہوں کہ مجھے بھی دوسرے عام لوگوں کے ساتھ ٹھہرایا جائے۔ یہ تو جین ہے۔ سراسر تو جین۔ بہتر یہ ہے کہ مجھے یہ مہمان خانہ چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن پھر پروڈیوسر شرازی۔

”ہوں..... ایسی تھی..... اس کی کیا سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو معذرت کہیں گا۔“ میں نے فناء میں گھونسا چلایا اور میری نگاہ ایک دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ جس کے اندر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ”واہ..... یہ کمرہ تو مس زردانہ کا ہے۔“ میں نے سوچا اور بڑے مست انداز میں آگے بڑھ کر مس زردانہ کے دروازے پر دستک دینے لگا۔“

”محبت عمر کا فریق نہیں دیکھتی۔ مس زردانہ.....  
جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے مجھے اندازہ ہوتا جا رہا  
ہے کہ میں آپ کو چاہنے لگا ہوں۔ مس زردانہ! خدا کے  
واسطے میرا دل نہ توڑیے“ میں نے بڑی عاجزی سے کہا  
اور زردانہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔  
”میکٹ آؤٹ.....“ میں کہتی ہوں نکل جاؤ۔ تم  
اپنی شاندار شخصیت کے باوجود ایک گھٹیا انسان معلوم  
ہوتے ہو۔ نکل جاؤ۔“

”مجھے بیمار کر دو..... مجھے چومو.....“ یہ الفاظ کہہ کر اس نے مجھے شاید آزمائش میں ڈالا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مذاق کا بھرم یہاں آ کر ٹوٹ جائے گا۔ لیکن بہت جلد کو معلوم نہیں تھا کہ میرے ذہن پر اس وقت کے شراب حاوی ہے۔ میں نے وہی کیا جو اس نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ اپنی ذہانت کا شکار ہو گئی اور میری اس حرکت نے اسے پاگل کر دیا۔ وہ بے تحاشہ مجھے پیٹنے لگی۔ رات کا وقت تھا۔ مہمان خانے کے ملازمین بھی مہمانوں سے خفیہ ضرورت پوچھنے کے بعد سو نہ چلے گئے۔

خوفناک کہانیاں [172] اپریل 2018ء

تھے۔ درندہ ایک اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ بمشکل تمام اس نے مجھے اپنے کمرے سے باہر نکالا تھا۔ لیکن میرے ذہن پر اس کا بھوت سوار تھا۔ نجانے کب تک میں اس کے دروازے پر کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ اور پھر مایوس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میرے ذہن میں نجانے کیا کیا خیال آ رہے تھے اور پھر اسی طرح آنسو بہاتے بہاتے میں سو گیا۔ دوسری صبح جب جاگا تو رات کا واقعات ذہن میں موجود تھے۔ ایک دم ہی مجھے احساس ہوا کہ شراب رات کو اپنے گل کھلا چکی ہے۔ دوسرے لمحے اٹھ کر غسل خانے کی طرف بھاگا۔ بری طرح مسل کرسل کر ہونٹ دھوئے۔ کچھ شاہ زیب کی ایسی تھیں۔ منع کیا تھا میں نے کہ مجھے شراب نہ پلائے۔ لیکن جو کچھ ہو بہت برا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ زردانہ سے رات کی حرکت کی معافی مانگوں گا۔

لیکن ناشتے کے کمرے میں سب موجود تھے۔ مگر وہ نظر نہیں آئی۔

”زردانہ کہاں ہے.....؟“ میں نے شاہ زیب سے پوچھا۔

”سنا ہے صبح ہی صبح چلی گئیں۔“

”سامان سمیت۔“

”ہاں..... ملازموں نے بتایا کہ ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔“

”اوہ..... میرے خدا۔“ میں نے آنسوؤں سے گردن ہلائی۔

”کیوں کوئی خاص بات ہوئی کیا؟“ شاہ زیب نے پوچھا۔

”نہیں بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ روتی تھی پیچاری کے دم سے۔ کم از کم اس ویرانے میں ایک بس تو تھی۔“ میں نے شاہ زیب کو ٹال دیا اور سر جھکا کر ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ دن کو تقریباً دس بجے ہا خانم کا بلاوا آ گیا۔ انہوں نے مجھے طلب کیا تھا۔ میں تیار ہو کر اس ملازم کے ساتھ چل پڑا جو مجھے بلانے آیا تھا۔

خوبی کے اندرونی حصے میں رانی ہا خانم ایک

شاندار کمرے میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے اندر جا کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی۔ چہرے پر محنت کا وہی عالم تھا۔ جو میں نے پچھلی رات دیکھا تھا۔ بلاشبہ اس عورت کو حسین ترین عورت کہا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے چہرے سے ذہانت کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ ایک پُر خلوص مسکراہٹ کے ساتھ اس نے مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی اور میں بیٹھ گیا۔

”پر درگرم تو میرا یہ تھا کہ میں آج مہمان خانے میں موجود تمام مہمانوں سے ملاقات کروں۔ لیکن میں نے اس معذرت کر لی ہے اور صرف آپ کو رحمت دی ہے۔“

”شکریہ۔“ میں نے جواب دیا۔ ہا خانم مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

”آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے مجھے اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کیا آپ کو اپنی یادداشت پر اتنا ہی بھروسہ ہے۔“

”جی ہاں۔ مجھے یقین ہے۔“ لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ الفاظ مجھے اس وقت نہیں کہنے چاہیے تھے۔ میں نے جواب دیا اور ہا خانم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں میں بھی اس برجستہ بھوت پر آپ سے معافی چاہتی ہوں۔“

”جی.....“ میں نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

”آپ کا خیال درست تھا۔ میں کچھ عرصہ پہلے ملک سے باہر لگی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں وہاں جس انداز سے گئی تھی۔ وہ ایسا تھا کہ قریب سے قریب کا شخص بھی مجھے نہ پہچان سکے۔ میں اس وقت آپ کی بات سے صرف اسی لئے انحراف کیا تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ دوسروں کو یہ بات معلوم ہو۔“

”میں اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔“

”چھوڑیں..... ویسے آپ کی شخصیت میرے لئے بھی حیران کن ہے۔ یقین کریں کہ میں سوچ بھی

نہیں سکتی تھی کہ پروفیسر شیرازی کے ادارے میں آپ جیسا کوئی شخص بھی موجود ہوگا۔ ویسے آپ وہاں کس سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔“

”میں دنیا کے بہت سے ملک دیکھ چکا ہوں۔ کافی آوارہ گردی کی ہے میں نے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہر حال چلے چھوڑیے۔ میں آپس سے اپنے مطلب کی بات کروں گی ویسے آپ نے ہماری ایک معزز مہمان کو ناراض کر دیا۔“ وہ بولی اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں نہیں سمجھا۔“ میں نے کہا اور ہا خانم نے ایک سفید کاغذ نکال کر میرے سامنے کر دیا۔ میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ یہ پرچہ تھا جو بیچاری زردانہ کی طرف سے لکھا گیا تھا۔

”خانم..... انتہائی بد دل ہو کر جاری ہوں۔ آپ کے مہمان خانے میں لوگوں کے معیار کا کوئی تعین نہیں ہے۔ ہر طرح کے لوگ یہاں آ سکتے ہیں۔ یہاں موجود ایک شخص میرے لئے درد مبین گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ ایک کلنڈر شخص ہے اور محض وقت گزاری کے لئے وہ مجھے محنت مشق بنا رہا ہے لیکن کیا یہ میری توہین نہیں ہے کہ اس نے مجھے سے اظہار عشق کر کے میرے جذبات مجروح کئے ہیں۔ مجھے آنسوؤں سے کباب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

زردانہ،

”جی“ میں نے پرچہ بند کر کے سنجیدہ نگاہوں سے ہا خانم کو دیکھا۔

میں نہیں جانتی کہ آپ مس زردانہ سے اظہار عشق میں کہاں تک مخلص ہیں۔

بہر حال وہ آپ کو ٹھکرا کر چلی گئی ہیں۔

”بس۔ کچھ ایسی ہی ذاتی سی بات ہے۔“

”ایک بات بتائیے۔“

”جی۔“

”پروفیسر شیرازی نے آپ کو کوئی تعارفی خط وغیرہ دیا ہے۔“

”جی.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی.....“ میں نے اپنی جیب سے وہ لفافہ نکال کر ہا خانم کی جانب بڑھا دیا جو خاص طور سے پروفیسر شیرازی نے مجھے دیا تھا۔ لفافے کا کاغذ نکال کر اس نے اسے با آواز بلند پڑھا۔ پروفیسر شیرازی نے میرے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ ہا خانم نے اسے دیکھا اور بولیں۔

”اصل میں مجھے سوال کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن ذاتی طور پر میں آپ سے بے تکلفی سے بات کر سکتی ہوں۔ آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے۔“

”ضرور۔“

”آپ اس سے پہلے کیا کرتے رہے ہیں۔“

”اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔“

”ہوں۔“ آپ کے گفتگو کرنے کا انداز بڑا انھوں ہے۔ مجھے ایسے لوگ بہت پسند ہیں۔ جو سامنے والے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے بالکل کھرے کھرے لہجے میں گفتگو کریں۔ اب مجھے آپ یہ بتائیے کہ آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں۔“

”بہت کچھ۔ جس کی آپ کو ضرورت ہو۔ پہلے تو میں یہ جانا چاہوں گا کہ آپ پروفیسر شیرازی سے کیا جانتی ہیں۔ یہ بات تو آپ بھی جانتی ہیں محترمہ کہ ہم لوگ ایسے مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہیں جن کے سلسلے میں نہ تو پولیس سے مدد لی جاسکتی ہے اور نہ ایسے ذاتی لوگوں سے جن سے بہت سے معاملات ہوتے ہیں۔“

”ایک بات اور بتائیے آپ مسٹر نادر سلطان! اگر کوئی ذاتی راز آپ کو دے دیا جائے۔ تو کیا آپ اس کے محافظ ہوتے ہیں۔“

”پروفیسر شیرازی بھی کہتے ہیں کہ ان سے رجوع کرنے والے ان پر اعتماد کر کے ہی ان سے کام لیتے ہیں۔“

”اور معافی چاہتی ہوں کہ اگر میرے دشمن آپ کو خریدنا چاہیں تو.....؟“

”بہر حال نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہر حال نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہر حال نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہر حال نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہر حال نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہر حال نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہر حال نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہر حال اب میں آپ سے بے تکلفی سے بات کروں گی۔ اور اس کی پہلی شکل یہ کہ میں تمہیں آپ نہیں کہوں گی۔ تمہاری شخصیت اتنی متاثر کن ہے کہ تم سے کسی گھٹیا پن کی توقع نہ کی جاسکتی۔ مجھے خود کی ایسے ہمدردی کی ضرورت ہے۔ جس سے میں انتہائی بے تکلفی سے اپنے دل کا حال بیان کر سکوں۔ ایک اتنی بڑی ذمہ داری کو اٹھانا اتنا مشکل کام ہے کہ انسان پس کر رہ جائے۔ تم لوگ مجھے بڑے بڑے محترم ناموں سے مخاطب کرتے ہو۔ رانی کہتے ہو مجھے اور میرا دل یہ چاہتا ہے کہ جب مجھے کوئی رانی کہے تو میں اس کے من پر چھوڑ دیتا ہوں۔ رانی کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ لوگ نہیں جانتے۔ مجھ جیسی مجبور اور بے کس عورت کو نام سے مخاطب کرے۔ اور مجھ سے یہ ساری ذمہ داریاں لے لے۔

بڑی عجیب زندگی ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کی بھی۔ دنیا کی نگاہوں میں ہم کچھ ہوتے ہی۔ اور اپنے جذبات اور کیفیات میں کچھ اور۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا۔“

”ایک بات مجھے اور بتا دو۔“

”جی فرمائیے۔“

”اگر کسی طور میرا تم سے اختلاف ہو جائے اور تم پسند نہ کرو اس بات کو جو میں تم سے چاہتی ہوں۔ تو کیا ایسی صورت میں تم میرے نقصان دہ ہو سکتے ہو۔“

”دیکھئے کوئی بھی سلسلہ شروع کرنے سے پہلے۔ ہمیں تمام معاملات پر بات چیت کر لینا ہوگی۔ اس کے بعد کسی اختلاف کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ آپ بھروسہ کر لیں کہ آپ کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔“

”بہت بہت شکر ہے۔ کیا اس کام کے معاوضے کی بات بھی تم سے ہی کرنا ہوگی۔“

”میرا خیال ہے نہیں، میں معاوضے وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا۔ اس کا فیصلہ پروفیسر شیرازی ہی کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ بہر حال تم یہ سمجھ لو کہ میں منہ مانگا معاوضہ دوں گی اور جس انداز میں تم پر بھروسہ کر رہی ہوں۔ اس کے لئے میں ذاتی طور پر تم سے ایک بات کہوں۔ کہ اس میں تمہاری شخصیت کا بہت بڑا دخل ہے۔ پروفیسر شیرازی ایک قابل اعتماد آدمی ہے اس کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہیں مجھے لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ اگر انہوں نے کوئی دوسرا آدمی بھیجا ہوتا تو شاید میں اتنی بے تکلفی سے اسے اپنا راز دار نہ بناتی۔ میں تمہیں تمہاری ہی تفصیل بتا دوں۔ مجھے ہما خانم کہا جاتا ہے۔ بلکہ رانی ہما خانم کہا جاتا ہے اور راج گڑھ میں، میں بہت بڑی حیثیت کی مالک ہوں۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ میرا اصل نام ہما خانم نہیں ہے۔ بلکہ میرا اصل نام بھجلا..... بھجلا ماہ روز..... مسٹر ماہ روز کے بارے میں تم نے کچھ سنا یا نہ سنا ہو۔ وہ راج گڑھ میں بڑی با اثر شخصیت تھے۔ اور اپنی زندگی میں ہر شخص کے پسندیدہ رہے تھے۔ میں ان کی دوسری بیوہ ہوں۔ اپنی پہلی بیوی کی وفات کے طویل عرصے بعد انہوں نے مجھے سے شادی کی۔ یہ طویل عرصہ انہوں نے تنہائی میں گزارا اور ان کے نام کے ساتھ کوئی ایسی غلاظت شامل نہ ہوئی کہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے۔ یا ان پر انگشت بازی کرتے۔ مجھ سے ملاقات ایک مخصوص جگہ ہوئی تھی۔ جس کی پستی میں جانا غیر مناسب کی بات ہے۔ اور نہ یہ بات اس کام میں معاون ہو سکتی ہے۔

میرا خاندان بھی معززین میں شمار ہوتا ہے۔ میں بذات خود بھی اتنی چھوٹی شخصیت کی مالک نہیں ہوں کہ لوگ یہ سوچتے کہ مجھے اچانک ایک بڑی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ جاگیر دار صاحب نے مجھ سے شادی کی اور ہم دونوں نے بہت ہی پرسرت زندگی گزاری ان کے دو بچے ہیں۔ ان میں ایک شاہ دل اور دوسری ان کی بیٹی امینہ ہے۔ سترہ سال کی عمر میں امینہ پر فاج کا حملہ ہوا اور وہ بیچاری دونوں ٹانگوں سے معذور ہوگئی۔ یہ صرف ڈیڑھ سال قبل کی بات ہے۔ اس کے علاوہ شاہ دل سادہ طبیعت اور مذہبی انسان ہے۔ اس کے مذہبی

امور میں کسی نے اس کے رجحان پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی۔ خود ماہ روز اسے اسی لئے پسند کرتے تھے۔ کردہ ایک سیدھا سادہ انسان ہے۔

دونوں بچے میرے لئے بھی ہمیشہ پسندیدہ رہے۔ اور میں نے بھی ان سے کوئی خاص تعرض نہیں کیا حالانکہ امینہ بے حد ضدی ہے اتنی ضدی کہ بعض اوقات اس کی منہ اس کے لئے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے لیکن میں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے اور خاص طور سے ماہ روز کی موت کے بعد تو میں نے خاص طور سے ان کا خیال رکھا۔ اور اس کی ان بے جا ضدوں کو بھی گوارا کیا جو بعض اوقات ناقابل قبول ہوا کرتی ہیں رہا ہے چارہ شاہ دل تو وہ سیدھا سادہ ایک دل انسان ہے اس نے بھی کسی کیلئے درد سہنے کی کوشش نہیں کی اس لئے زندگی گزارنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں تھا سارے حالات مناسب طور سے چل رہے تھے لیکن پچھلے تین چار ماہ سے حالات میں کچھ گڑبڑ ہوئی زمینوں کے نگران پریشان ہیں ان کا کہنا ہے ہار یوں کو بھکا جا رہا ہے اور ان کو ہار یوں کے خلاف بناوٹ پر اکسایا جا رہا ہے اس کے علاوہ بھی بے ارم مسائل کھڑے کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور میرے خیال سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں باقاعدہ ایک مشن کام کر رہا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسے تقریباً سات ماہ پیشتر یعنی جاگیر دار صاحب کی موت کے بعد تقریباً دو سال کے بعد منظم بنانے پر سوال اٹھایا گیا تھا۔ اور سوال یہ تھا کہ جاگیر کی عمرانی کیا مناسب طور پر ایک عورت کر سکتی ہے۔ سوال اٹھانے والوں میں ہمارے قرب و جوار کے بڑے بڑے چودھری تھے۔ جس وقت میرا پاس یہ سوال پہنچا تو میں نے ان سب کو طلب کیا اور پوچھا کہ ماہ روز صاحب کی موت کے بعد جاگیر کے امور میں کون سی مشکل پیش آگئی ہے۔ جس کی بنا پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ خاتم جاگیر دار صاحب کی موت کے بعد ان کا کچھ وارث شاہ دل ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اگر یہ بات ہے اور شاہ دل یہ فتنہ

داری سنبھالنے پر تیار ہوں تو انہیں میں بہت ساری ذمہ داریاں سونپ سکتی ہوں۔ لیکن ابھی میں ان کو اس قابل نہیں پاتی کہ وہ پوری پوری ذمہ داریوں کے ساتھ جاگیر اور زمینوں کے امور چلا سکیں۔ اس کے علاوہ جاگیر دار صاحب کی وصیت یہ ہی تھی کہ میں ان بچوں کا خیال رکھوں۔ ابھی یہ اس قابل نہیں ہیں کہ فتنے داریوں کے بوجھ کو مناسب طریقے سے اٹھائیں۔

چنانچہ میں اپنی زمینوں کی اور اپنی دور رس پیملی ہوئی جائیداد کی خود عمرانی کر سکتی ہوں۔ جاگیر دار صاحب نے اپنی زندگی میں مجھے اس قابل کر دیا تھا کہ میں جاگیر کے تمام مسائل کو سمجھ سکوں۔ اور پھر ان کی وصیت کے مطابق مجھے تا زندگی یہ سارا نظام چلانا ہے۔ میں اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرتے ہوئے یہ سارے کام کر رہی تھی لیکن یہ نئی الجھنیں میرے لئے پریشان کن ہیں۔ میں نے انتہائی خلوص کے ساتھ یہ کوشش کی تھی کہ ان دونوں بچوں سے گفتگو کروں۔ ان سے پوچھوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ دونوں معصوم ہیں۔ اور یوں لگتا ہے۔ جیسے ان تمام معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس کے بعد یہ احساس میرے لئے پریشان کن ہو گیا۔ کہ آخر وہ کون لوگ ہیں۔ جو میرے خلاف یہ نضام پیدا کر رہے ہیں۔ ہما خانم نے چند لمحے توقف کیا۔ تو میں نے سوال کر ڈالا۔

”لیکن ایک بات بتائیے کیا آپ کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔“ اس سوال پر ہما خانم کے چہرے پر ایک بدلی ہوئی کیفیت نظر آئی۔ پھر اس نے سر داور سپاٹ لہجے میں کہا۔

”جاگیر دار صاحب سے میری شادی، میری پسند اور میری مرضی کی نہیں تھی۔ بلکہ ایک ذاتی مسئلے میں میرے والدین اس کے لئے مجبور ہو گئے تھے۔ شادی کے بعد البتہ ان سے میرا کوئی اختلاف نہیں رہا۔ لیکن میری اور ان کی عمریں کافی فرق تھا۔“

”اولاد کی بات ادھوری رہ گئی۔“

”نہیں پوری ہو گئی ہے۔ میری کوئی اولاد



نہیں ہے۔“ ہما خانم نے جواب دیا اور میری کھوپڑی ایک لمحے کے لئے گھومی گئی۔ پھر میں نے کہا۔  
”بہر حال آپ ان لوگوں کے خلاف تحفظ چاہتی ہیں۔ جو آپ کے خلاف یہ حالات پیدا کر رہے ہیں۔“

”جہاں تک تحفظ کی بات ہے تو میں خود کو غیر محفوظ نہیں سمجھتی۔ میرے ارد گرد میرے محافظ پھیلے ہوئے ہیں اور خاص طور سے اس وقت سے وہ لوگ بڑے مستعد ہو گئے ہیں۔ جب سے میری رات کی تاریکیوں میں ایک خوابگاہ کے نزدیک ایک شبہ شخص نظر آتا ہے۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ لیکن وہ شخص اتنا پھرتیلا اور چالاک ہے کہ میرے محافظوں کے ہاتھ نہیں لگ سکتا۔ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ وہ عمارت ہی میں گم ہو جاتا ہے۔ اور تم یہ بات جانتے ہو کہ سانپ کا آستین میں ہونا سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔“

”آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ لیکن آپ یقیناً یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ کے دشمن یقیناً آپ کی زندگی بھی لینا چاہتے ہیں۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے کہ میرے خلاف سازش کوئی معمولی حیثیت نہیں رکھتی۔“

”مگر ایک بات اور بتائیے۔ اس سلسلے میں تو حکومت بھی آپ کی مدد کر سکتی ہے۔ کیونکہ آپ اس وصیت کے مطابق اس تمام جائیداد کی واحد نگران اور وارث ہیں۔ اور چند سو داریوں کے علاوہ آپ پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں اپنے دشمنوں میں کس کا نام لوں۔ اگر بے گناہ لوگوں کو پھنساتی ہوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا۔ اور ممکن ہے اس کے باوجود بھی میری انجمنیں برقرار رہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان لوگوں کی نفرت کچھ اور بڑھ جائے گی۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ اصل دشمن کی شناخت ہو جائے۔ اور اس کے لئے ہی مجھے پروفیسر شیرازی سے رابطہ کرنا پڑا ہے۔“

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر تک خاموش رہا اور اس کے بعد میں نے کہا۔

”پروفیسر شیرازی نے مجھ پر اعتبار کر کے مجھے یہاں پر بھیجا ہے اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے بارے میں آپ پروفیسر شیرازی سے بات کر کے مجھے اس سلسلے میں متنبہ کر دیں۔“

”میں تمہیں ایسے ہی اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔ بلکہ تم باقاعدہ میرے یہاں کے کوئی عہدے دار ہو گے۔ یہ کام میں اس لئے کہہ رہی ہوں تاکہ تمہارے اختیارات وسیع تر ہوں۔“

”یہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات آپ پروفیسر شیرازی سے طے کر لیں گی۔“

”اس کے علاوہ تمہاری کوئی اور شرط۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ فی الحال کوئی شرط نہیں ہے۔ البتہ میں پروفیسر شیرازی سے کچھ باتیں ضرور کروں گا۔“

”ہاں یہ کام تو تمہیں کرنا ہی ہے۔ تاکہ میرے اور پروفیسر شیرازی کے درمیان دوسرے معاملات بھی طے ہو جائیں۔ اور کوئی ایسی بات جو تم کہنا چاہتے ہو۔“

میں تمہیں اپنے خاص مشیر کی حیثیت سے دوسروں سے متعارف کراؤں گی۔ تاکہ تمہارا ایک مقام بن جائے اس کے علاوہ میں تمہاری رہائش کا بندوبست بھی کرائے دیتی ہوں۔ تاکہ تم اپنی اصل حیثیت سے سب کے سامنے آسکو۔“ کافی دیر تک میرے اور اس کے درمیان گفتگو جاری رہی۔ اور اسے بعد میں اس کے پاس سے باہر نکل آیا۔

☆.....☆.....☆

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں اور ناظم پاشا نے شمار ایسے اچھے ہوئے مسائل پر کام کر چکے تھے۔ بہت سے لوگوں کے لئے ہم نے بڑے بڑے خطرناک کام سر انجام دیے تھے۔ لیکن یہ کام کم از کم میرے لئے بہت زیادہ باعث دلچسپی تھا۔ میں نے دل میں ایک اور فیصلہ بھی کیا تھا۔ یہاں پر کسی نئے مہمان کا آنا کوئی اہم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ مہمان خانہ کھلا ہوا تھا۔ جلیلہ ماہ روز کے بارے میں مجھے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ

نہایت فراخ دل عورت ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ وہاں کیا کر رہی تھی۔ وہ معاملات بھی نہایت بڑے اسرار تھے۔ جن سے میرا اور ناظم پاشا کا واسطہ پرچکا تھا۔ بہر حال وہ خود بھی ایک بڑے اسرار اور باعمل عورت تھی وہ لوگ کون تھے جو وہاں اس کے ساتھ کا کر رہے تھے یہ ہماری باتیں آہستہ آہستہ ہی سامنے آئیں گیں۔ ذہنی طور پر میں نے اس کام کو خوشی سے قبول کر لیا تھا لیکن دل میں یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ کسی بھی شکل میں کبھی ناظم پاشا کو کم از کم اپنے مددگار کی حیثیت سے ضرور بلا لوں گا۔ اس کے بغیر جیسا کہ میں نے کہا کہ میں اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرتا تھا۔ بے شک وہ میری ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوا تھا لیکن ہم دونوں کے درمیان کچھ ایسی کاکھٹ ہو گئی تھی۔ کہ اب اس کے بغیر میں کوئی کام خوشی سے کر ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کے بعد یہ میرے لئے لازمی ہو گیا کہ میں اس عمارت کا بھرپور جائزہ لے لوں۔ میں نے اب ذرا دوسرے انداز میں یہاں کا جائزہ لیا۔ کسی بہرونی جگہ سے ہما خانم کی خوابگاہ پہنچنے کا براہ راست کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہر جگہ محافظوں سے مدھم بھٹھور ہوجانے کا خطرہ رہتا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایک ملازم کو اشارہ کیا اور وہ میرے نزدیک آگئی۔ میں اس سے کہا۔ ”شہزادہ شاہ لہ سے کہا ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”وہ اپنے کمرے میں ہیں جناب۔“

”براہ کرم مجھے ان کا کمرہ بتا دو۔“ میں نے کہا

ملازمہ نے ادب سے گردن جھکا دی۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے دور سے اشارہ کیا اور میں ان کا شکر یہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ چند قدم ہی آگے ہاتھ کا کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکل آیا۔ میں نے اس طرح اپنا رخ بدل لیا۔ جس طرح اس رخ متوجہ ہی نہ ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے ان سکے۔ یہ شخص جو باہر نکلا تھا بارش تھا اور اچھے لمبے چوڑے بدن کا مالک۔ کچھ دیر توقف کے میں نے شاہ دل کے کمرے کی طرف رخ کیا اور اس

کے دروازے پر دستک دی۔ ”تشریف لائیے۔“ اندر سے ایک آواز سنائی دی اور میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ خاصا بڑا کمرہ تھا لیکن اس کے اندر سجادہ معمولی تھی۔ ایک طرف تخت بچھا ہوا تھا۔ جس پر جائے نماز بچھی ہوئی تھی اور بیچ بھی رکھے ہوئی تھی۔ ایک کرسی پر ایک نوجوان خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے کچھ کرکھڑا ہوا گیا۔ اور یا آواز بلند سلام کیا۔ جس کا جواب دیکر میں آگے بڑھا اور میں نے کہا۔

”آپ کو تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں جناب۔“

”آئیے۔۔۔۔۔ آئیے تشریف رکھئے۔ میں آپ سے ناواقف ہوں۔“ جی ہاں۔۔۔۔۔ میں آپ کے لئے خادموں میں سے ایک ہوں۔ ہما خانم نے مجھے صرف دو روز پہلے ملازمت دی ہے۔“

”خوب۔ کیا عہدہ ہے آپ کا؟“

”اندر والی امور کا محافظ ہوں۔ یعنی کیرٹیکر۔“

”یعنی یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ آپ ہم خانم کے ذاتی محافظ ہیں۔“

”ایسی کوئی ذمہ داری انہوں نے میرے سپرد نہیں کی۔ لیکن ایسا ہے۔ ویسے معاف کیجئے گا۔ آپ کو کوئی اختلاف ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ بنیادی اختلاف۔“ شاہ دل نے صاف لہجے میں کہا اور میں چونک بڑا۔

”آپ کے مرتبے کو مدد نگاہ رکھتے ہوئے مجھے یہ جرات نہیں ہوتی۔ شہزادہ صاحب کہ میں آپ کے اس اختلاف کی وجہ پوچھوں لیکن یہ سوال میرے ذہن میں ضرور ابھرا ہے کہ وہ بنیادی اختلاف کیا ہے؟“

”تکلفات رہنے دیجئے۔ کل آپ کو یہ اختیار بھی مل سکتا ہے کہ آپ ہم سے قانونی طور پر رسوائی کریں۔“

ہماری حیثیت ہی کیا لے۔ اس عمارت میں۔ صرف ہی کہ والد حضور کبھی ہیں بیٹا سمجھتے اور کہتے تھے۔ اب نہ ہم ان کا چھوڑا ہوا قرض ہیں۔ جو ہمیشہ دوسروں کیلئے بوجھ ہوتا ہے۔ بنیادی اختلاف یہ ہے کہ انسان وہ بنیاد ختم کر

دے جو اختلاف کی وجہ بن جاتی ہے بہتر سلوک دشمن کو دوست بنا دیتا ہے۔ ہم تو ویسے بھی بے حیثیت لوگ ہیں۔“

”کیا ہما خانم کا سلوک آپ کے ساتھ اچھا نہیں ہے؟“

”جسے دشمن سمجھا جائے اس کے ساتھ سلوک ہمیں فرق آتی جاتا ہے لیکن دشمن سمجھے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔“

”کاش!..... میں جان سکتا..... کاش!..... انسان ہمیشہ زندگی کے بھول بھلیوں میں بھٹکتا ہے۔ وہ جو کچھ ہوتا ہے اس پر قانع نہیں رہتا۔ اسے خوف ہوتا ہے کہ اس سے اس کی حیثیت چھین نہ جائے۔ حالانکہ موت کی ہنگامی کسی بھی وقت دم چھین لیتی ہے۔ ہما خانم کو خوف ہے کہ ہم دونوں بہن بھائی کسی نہ کی وقت ان سے یہ سب کچھ چھین لیں گے۔ چنانچہ وہ ہم سے ہماری زندگی اور آزادی چھین لیتا چاہتی ہیں۔ میری بہن کے ساتھ۔ میری اپانج بہن کے ساتھ انکا جو رویہ ہے خدا کی قسم خدا اُن سے اس کا حساب ضرور لے گا۔“

میں سناٹے میں آگیا۔ یہ تو کوئی اور ہی کہانی ہے۔ ایک ایسی کہانی جو مجھے آزمائش میں ڈال سکتی ہے۔ اگر ہما خانم کے ذہن میں یہ بات ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صرف ایک جال بن رہی ہوں ایک ایسا جال جس میں وہ دونوں پھنس جائیں۔ بہر حال یہ معاملات ابھی غور طلب تھے۔ میں تو ابتدائی اقدامات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شاہ دل سے گفتگو نے مجھے حیران ضرور کر دیا تھا۔

”بہر حال سب کے پاس ایک سہارا ہوتا ہے۔ اور وہ سہارا اللہ کا ہوتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ہماری ضرورت مدد کرے گا۔“

”میں شرمندہ ہوں جناب کہ میرے سوالات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے۔ میرے پہنچ محدود ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس عظیم الشان عمارت کے اہم امور کی نگرانی کروں۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذمہ

داری میرے سپرد نہیں کی گئی۔ تاہم، شہزادہ کی حیثیت سے آپ بھی اس گھر کے سربراہوں میں سے ایک ہیں۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے ضرور موع دینے گا اور پھر اس حیثیت سے نہ کسی انسانیت کے رشتے سے میں آپ کی مدد ضرور کروں گا۔“

”شکریہ..... ہم خدا پر قناعت کرنے والوں میں سے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ اگر ہم مجرم نہیں ہیں تو وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔“ شاہ دل نے کہا۔ کچھ دیر میں اس کے پاس رُک کر وہاں سے باہر نکل آیا۔ لیکن ذہن میں بہت سے خیالات رقصاں تھے۔ پروفیسر شیرازی نے جو ذمہ داری میرے سپرد کی تھی۔ وہ ایک کاروباری اور کمرشل ذمہ داری تھی۔ لیکن باقی سارے معاملات کیلئے میں انسان بھی تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے اور پاشا نے ہمیشہ اپنا ایک موقع رکھا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ہم جرم کی دنیا سے متعلق ہو گئے تھے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہم انسانوں کو نقصان پہنچاتے رہیں۔ پھر میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہما خانم کے برابر والے کمرے میں پہنچ گیا۔

یہ کمرہ میرے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ میرے اور ہما خانم کے کمرے کی دیواریں ملی ہوئی تھیں۔ اس دیوار میں ایک بڑا درویشانہ تھا۔ جو بلندی پر ضرور تھا لیکن وہاں پر پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ یہ درویشانہ مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ بہر حال ابھی اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ البتہ شاہ دل سے ملاقات کر کے میں کافی الجھ گیا تھا۔ میں ان واقعات کو دہری نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پروفیسر شیرازی نے ہمارا خانم سے رابطہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں اس کا معاوضہ مل رہا تھا۔ لیکن میں اور ناظم پاشا اپنی پسند اور اپنی مرضی کے قائل تھے۔ میں ان واقعات پر غور کرنے لگا۔ ہما خانم جاگیردار کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی سے دو بچے جو جوان تھے۔ لڑکی مفلوج اور بیٹا مولوی مفت۔ شاہ دل کا خیال تھا کہ ہما خانم ان دونوں کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی ہے۔

تاکہ کسی وقت وہ اس کے لئے دروس نہ بن جائیں۔ اور وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ اس کے دشمن ہیں۔ بے شک یہ ایک دور اندیشی تھی۔ لیکن اس الزام میں تھوڑ سا جھجھکاؤ تھا۔ مثلاً پارہیوں اور دوسرے لوگوں کی بغاوت، اگر یہ ہما خانم کی سازش ہوتی۔ تو وہ کم از کم اپنے خلاف بغاوت کی بنیاد نہ ڈالتی۔ کیونکہ یہ اسے نقصان پہنچا سکتی تھی۔ غیر دو یہ بات کہ پولیس افسروں کی امداد زیادہ موثر ہوتی۔ کیونکہ وہ انہیں مجرم قرار دے کر قاتلوں کے حوالے کر سکتی تھی۔

کسی ایسے شخص کو اتنی بھاری رقم دے کر صرف یہ معلوم کرانے کی کوشش نہ کرتی کہ اس کا مجرم کون ہے اور پھر ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ وہ شخص جو شاہ دل کے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ کوئی اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ شاہ دل اندر سے غلط ہے یا پھر ہما خانم۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شاہ دل نے مجھے غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ بہر حال بڑی محنت سے کام کرتا تھا۔ کافی دیر تک میں اس سلسلے میں غور و خوض کرتا رہا۔ اور پھر میں نے ایک پروگرام ترتیب دیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بعض اوقات بڑے بڑے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اس پروگرام کو ذہن میں ترتیب دیتا رہا اور آخر کار دوسری صبح میں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے خاص طور سے ایک ملازمہ کو تاڑا۔ جو میرے کام کی ہو سکتی تھی۔ غالباً اسے میری ہی خدمت پر مسمور کیا گیا تھا۔ پھر وہ آئی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

”تمہارا نام کیا ہے بی بی۔“

”شکریہ سرکار..... بابا میں تمہاری طرح اس گھر کا ملازم ہوں۔ تمہیں پتہ چل گیا ہو گا کہ مجھے یہاں نوکری مل گئی ہے۔“

”سرکار آپ کی نوکری تو بہت بڑی ہے۔ کہاں کہاں آپ۔“

”ایک بات ہوں..... برا تو نہیں مانو گی۔“

”جہیں سرکار..... مجھی میرا نام نادر ہے۔ تم مجھے نادر کہہ لو تو کوئی حرج نہیں ہے۔“

”ارے سرکار جان چلی جائے گی ہماری۔“

”تم یقین کرو..... تم ملازمہ تو کتنی ہی نہیں ہو۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ تم کسی ایسے گھر کی لڑکی ہو اور کچھ بڑے حالات کا شکار ہو کر یہاں نوکری کر رہی ہو۔“

میری ہر بات ثریا کے دل کو لگ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا سرکار۔ اللہ نے جو جسے بنادیا..... بس۔“

”مجھے افسوس ہوا، ثریا تم اتنی خوبصورت ہو کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“ میں نے کہا اور دوسری جانب رخ پھیر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ میرے طرف دیکھے گی اور یہ ہو۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی اور میں نے پلٹ کر گردن ہلائی۔

”آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا۔“ وہ بولی۔

”کتنے عرصے سے یہاں ہو؟“

”سرکار ہم تو بڑے ہی یہاں ہوئے ہیں۔“

اس کا مطلب ہے کہ تمہارے ماں باپ اور دوسرے لوگ بھی یہاں ہی رہتے ہیں۔“

”جی سرکار ماں مرچکی ہے ہماری۔ باپ ہے وہ مالی کا کام کرتا ہے اور ہم یہاں رہتے ہیں جہاں دوسرے نوکر رہتے ہیں۔ ہم بھی اس گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتے رہتے ہیں۔“

”ثریا دیکھو! امت ماننا میری بات کا۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔ تم مجھے بڑی اچھی لگی ہو۔ اور ہاں۔ کسی غلط بات کو اپنے ذہن میں جکھ مت دیتا۔ تمہارے اچھے لگنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کروں۔“

”سرکار آپ تو بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے

ہیں۔ بڑی مہربانی ہے آپ کی۔“

”لو یہ رکھ لو.....“ میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”نہیں سرکار۔ بس آپ نے ہم سے اتنی ہمدردی محبت سے بات کر لی۔ یہ ہمارے لئے بہت کافی ہے۔ پیسوں سے کیا ہوتا ہے۔“

”میں نے غلط تو نہیں کہا تھا ناں شریا کہ تم ایک اچھی انسان ہو۔ ویسے تم یقیناً وفادار ساتھی بھی ہو گی۔ میں تم سے ایک بات کہوں۔ آجکل خانم کچھ پریشان ہیں۔“

”ہاں..... سرکار ہم بیٹھیں تو رہتے ہیں سارا دن۔ اور ہم خانم جی کی خدمت میں ہر وقت رہتے ہیں۔ بے شک وہ آجکل پریشان ہیں۔ ہم ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر ہم تو ایک غریب نوکر ہیں۔“

”پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ کیا شہزادہ شاہ دل کی مخالفت سے وہ پریشان ہیں۔“

”ہم تو نوکر ہیں سرکار..... ہمیں ان باتوں کا کیا معلوم..... ہمیں ان باتوں کا کیا پتہ..... ویسے شہزادہ صاحب بھی بڑے سیدھے سادھے آدمی ہیں۔ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں۔ کوئی برائی دیکھی نہیں ہے ہم نے ان میں۔ ہماری طرف تو آج تک نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہر ایک سے نرم لہجے میں بات کرتے ہیں۔“

”اور وہ بی بی۔ کیا نام ہے ان کا۔“

”آپ امینہ بی بی کی بات تو نہیں کر رہے سرکار؟“

”ہاں..... وہی۔“

”ارے سرکار ان کی تو بات ہی نہ کریں دیکھ کر آسو آتے ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔ وہ بھی لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اچھی ماں پرگنی ہیں اور ایک بات کہیں آپ سے سرکار، کہنے کو دل چاہتا ہے۔ آپ نے اتنی محبت سے بات کی ہے۔“

”کھوٹا..... میں نے کہا ناں کہ میں جنہیں بڑا اپنا اپنا سمجھتا ہوں۔“

”سرکار خانم جی ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتیں۔“

”ایمنہ کے ساتھ۔“

”ہاں“ اس نے کہا اور اچانک ہی خوفزدہ ہو گئی۔

”اللہ کے واسطے سرکار ہم سے ایسی باتیں نہ پوچھیں۔ جن سے ہماری زندگی خطرے میں پڑ جائے۔“

”دیکھو شریا میں نے تمہیں اچھا انسان سمجھ کر یہ سب باتیں پوچھی ہیں۔ اگر میں تمہیں اچھا نہ سمجھتا تو میں تم سے کوئی بات بھی نہ کرتا۔ کیا میں تمہارے خیال میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ جو باتیں میرے اور تمہارے درمیان ہو رہی ہیں۔ ہمیشہ میرے اور تمہارے درمیان ہی رہیں گی۔ اگر یہ محسوس کرو کہ میں نے کسی کو کچھ بتایا ہے تو آئندہ مجھ سے کبھی بات بھی نہ کرنا۔“

”نہیں سرکار۔ ہم تو آپ کی باندی ہیں۔“

”تو پھر مجھے بتاؤ کہ خانم امینہ بی بی سے کیا سلوک کرتی ہیں۔“

”سرکار امینہ بی بی تو قیدیوں کی سی زندگی گزار رہی ہیں۔ اس جے میں سے رہتی ہیں جہاں دوسرے لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ بے چاری معذور ہیں۔ کوئی بھی جش ہو۔ امینہ بی بی کو اس میں نہیں بلایا جاتا۔ کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں ہے انہیں۔ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ معذور ہیں۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ خانم جی انہیں مارتی تک ہیں۔“

”شریائے کہا اور گردن جھکا لی۔

اور میں پڑ خیال انداز میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ ہر قدم ایک نئی آنکھ سے دو چار کر رہا تھا۔ بہر حال شریا چلی گئی اور میں آئندہ اقدام کے بارے میں غور کرنے لگا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اب امینہ کو بھی دیکھ لیا جائے۔ اس سلسلے میں بھی میری مدد شریا نے ہی کی تھی۔ اور جب میں وہاں پہنچا تو ایک مخصوص جگہ مجھے روک دیا گیا۔

”اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے جناب۔“ ایک بھورے رنگ کے آدمی نے جو بہت چست و چالاک تھا محضرت امینہ لہجے میں کہا۔

”مجھ میں معلوم ہے کہ میرا یہاں عہدہ کیا ہے۔ تم میرے ماتحتوں میں شمار ہوتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سرکار ہمیں اطلاع دے دی گئی ہے کہ یہاں کی نگرانی کے لئے نادر صاحب کو عہدہ دیا گیا ہے۔ مگر ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ایک دفعہ آپ کے اقتدارات معلوم کر لیں۔“ اس نے جیب سے سو پائل فون نکالا اور کسی سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ یہ حصہ بھی خوبصورتی سے آراستہ تھا۔ یہاں دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ دو ملازمین ایک خوش کے کنارے بیٹھیں تھیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں ان کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش تھے۔ میں نے اشارے سے انہیں اپنے قریب بلایا اور وہ دونوں میرے قریب پہنچ گئیں۔

”ایمنہ صاحبہ کہاں ہیں؟“

”آرام کر رہی ہیں۔ لیکن آپ.....؟“

”میرا نام نادر سلطان ہے۔ شاید میرے بارے میں تم لوگوں کو ابھی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ میں امینہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔“

”خانم سے اجازت لیتا ضروری ہے۔“

”تم لوگ جانتی ہو کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی شخص یہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ دونوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی اور پھر بولیں۔ ”آئیے“ وہ دونوں مجھے لیکر ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے دروازہ کھول کر مجھے اشارہ کیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک لڑکی اپا بچوں والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔

اتنی حسین لڑکی کی نگاہ تک نہ ٹھہرے۔ چہرے پر ایسی معصومیت اور اداسی تھی کہ دل بے اختیار ڈولنے لگے۔ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی

ہوئی نگاہوں سے پہلی بار مجھے اور پھر دروازے کو دیکھا۔

”آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ ایک ملازمہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ میں نے ان دونوں سے کہا۔ اور وہ دونوں ہچکچاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ تب میں نے دروازہ بند کر دیا۔ امینہ کے سپہ ہونے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ اس پر شاید تشدد بھی ہوتا رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی کرسی پیچھے کھسکا رہی تھی۔

”میں آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنے آیا ہوں شہزادی امینہ۔“

”کک..... کیسی معلومات؟“

”اصل میں یہاں میں کچھ کام کر رہا ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو یہاں کس طرح کی تکلیف ہوئی ہے۔ آپ اطمینان رکھیے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ سے مکمل تحقیقات میرے ذمہ داری ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ ہما خانم آپ کے ساتھ بہت سخت سلوک کرتی ہیں۔“

”نن..... ن نہیں۔ وہ تو بہت اچھی ہیں۔ میرا ہر طرح سے خیال رکھتی ہیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

”لیکن آپ کے بھائی شاہ دل نے آپ کے لئے یہ ہی سب کچھ کہا ہے۔“

”میں نہیں جانتی وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خانم کے مخالف ہی ہیں اور مجھے بھی پسند نہیں کرتے۔ مجھے وہ خانم کی نگاہوں سے گرانا چاہتے ہی۔ براہ کرم ان کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ خوفزدہ ہے۔ میں نے کہا۔

”اگر یہ بات ہے تو انہوں نے آپ کو دوسروں سے الگ تھلک کیوں رکھا ہے۔“

”مم..... مم..... میں خود لوگوں سے الگ رہنا چاہتی ہوں۔ جب میں لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تو پھر لوگوں کا ساتھ کیوں حاصل کروں۔“ امینہ کی آواز میں بے حد اداسی تھی۔





تمہارے گھر میں تو ہوائی مخلوق کا ایک سونامی آیا ہوا ہے۔ یہ دیکھو ادھر بیٹھے ہیں کچھ اچھا تمہاری کپڑوں والی الماری سے سر نکال کر نشہ رہے ہیں اور وہ ادھر ڈانگ کر سبوں پر برا بھلا ہیں۔

ایک چیخ ہی تو نکل گئی تھی اس کی..... بات تھی ہی اسکی..... اس نے حیرانی سے پورا لپٹی الٹ دیا تھا..... اب وہ پاگلوں کی طرح کپڑوں کے ہر ایک جوڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے تین چار بہترین جوڑوں کے بین درمیان کرکٹ کی گیند جتنے سوراخ ہو چکے تھے سر اسکی کے عالم میں وہ ان کپڑوں کو کھولتی اور پھر بیڈ پر پھینک دیتی پھر اٹھا کر انکی سوختی، تازہ جلنے کی بدبو ان کپڑوں سے سک رہی تھی اس کے یہ کپڑے کم قیمتی تو نہ تھے مگر نقصان دہ پھر نقصان ہی ہوتا ہے اس کے دکھ اور کرب میں اضافہ ہو چلا تھا کہ اب وہ فنکشن میں کیا پنن کر جائے گی۔ کرب دورو کے ساتھ اس کے منہ سے چیخ ابھری اور اس کے ساتھ ہی کھٹی کھٹی آواز نکلی۔

”فرحان.....“

نجانے اس کی اس آواز میں کیا تھا، کہ دوسرے کمرے میں اسی فنکشن پر جانے کے لئے تیار ہونے والا ٹائی کی ٹاٹ لگا تا ہوا ادھر بھاگ آیا۔

”کیا ہوا صوفیہ.....“ اس نے ایک نظر اس کی طرف اور دوسری بیڈ پر بکھرے کپڑوں پر ڈالنے ہوئے پوچھا۔

”یہ دیکھو..... دیکھو ادھر..... یہ میرے سارے کپڑے کسی نے جلا ڈالے ہیں ذرا سوچ کر دیکھو.....“

ہوں۔ لیکن مجھے اندازہ ہے کہ میں دشمنوں میں گری ہوئی ہوں۔“

میں کوشش کر رہا ہوں کہ جلد از جلد آپ کے دشمنوں کو بے نقاب کر دوں۔ میں نے آج شاہ دل صاحب سے ملاقات کی تھی۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔“

”شاہ دل بالکل بے ضرر ہے۔ خاموش طبیعت انسان۔ زیادہ تر الجھا ہوا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں ہمیں اپنے لئے نقصان دہ سمجھتا ہو۔ ہو سکتا ہے۔ کچھ دوسرے لوگ اسے اکسارے ہوں۔ انسان بہت کمزور چیز ہوتا ہے۔ کون جانے کون کب بدل جائے اور کیا سوچنے لگے۔“

”میں اپنی جلدی تو اس عمارت کے اس ماحول سے واقف نہیں ہو سکتا۔ آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ میں شاہ دل پر شبہ نہیں کرتی لیکن تم جو بھی مجھ سے پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو۔ تم نے اس سے ملاقات کی تھی۔“

”ہاں۔ مجھے بھی وہ ایک سیدھا سادھا انسان معلوم ہوا۔ اس سے آپ کے بارے میں کافی بات چیت کی اسنے آپ کے خلاف کوئی بات نہیں کی البتہ ایک بات کا اظہار ضرور کیا؟“

”کیا.....؟“ خانم نے پوچھا۔

”اس کا خیال ہے کہ آپ کا سلوک ایمین کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے غور سے خانم کی شکل دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر غمناک تاثر پھیل گیا۔

”ممکن ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں ڈال دی گئی ہو۔ حالانکہ اس بچی سے مجھے جتنی ہمدردی ہے۔ میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔ میں نے اس کی بیماری کا علاج کرانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر مفلوج ہو چکی ہے۔ حالانکہ اس کی شریانوں میں خون کی گردش رواں ہے اور پھر میں نہیں جانتی کہ شاہ دل مجھے اس کا دشمن کیوں سمجھتا ہے۔“ (جاری ہے)

آپ کا علاج کیوں نہیں کرایا گیا۔“

”بہت کرایا گیا ہے۔ مگر قدرت کو منظور نہیں ہے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں۔ میری ٹانگیں ٹھیک ہیں مگر میں کیا کروں میں نفسیاتی بیمار ہوں۔ میں کمزوری نہیں ہو سکتی۔“

”یہ آپ کے ماتھے پر چوٹ کیسے لگی ہے۔“

”کمری سے گر پڑی ہوں۔ اکثر کرتی رہتی ہوں۔ بس اسی لئے میں لوگوں سے الگ تھلگ رہنا چاہتی ہوں۔“

”تو آپ کو ہما خانم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

”ہاں..... مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ بھائی جان کو اس طرح کی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ پتہ نہیں وہ کیا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر میں ایمین سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد میں اس کے پاس اٹھ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا تھا کہ تیسرا کردار بھی کافی الجھا ہوا ہے اور پھر میں وہی طور پر خاصا الجھ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کو ایک اور ملازمہ نے مجھے خانم کی طرف سے دعوت دی۔

”وہ کھانے کی کمرے میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ کھانے کی میز پر ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ خانم نے گردن ہلا کر مجھے خوش آمدید کہا تھا۔

”تم بہت جامد زیب انسان ہو۔ ہر لباس میں شاندار نظر آتے ہو۔ میں کل دیر تک تمہارے بارے میں سوچتی رہی۔ شخصیت کو ستوارہ ضرور جاتا ہے۔ قدرتی جاذبیت کا بھی ایک الگ مقام ہوتا ہے۔“

”شکریہ خانم۔ میں نے گردن تم کر کے کہا۔“

”اچھا چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے کوئی کام کیا۔“

”جی“ میں نے جواب دیا۔

”نہیں..... اتنا مختصر جواب نہ دو۔ میں اس سلسلے میں کتنی بے چین ہوں تمہیں اس کا اندازہ نہیں۔ میرے لئے یہ تمام جاگیر کی ذمہ داریاں سنبھالنا ایک مشکل کام ہے۔ میں اپنے لئے امن کی فضا کی طالب

ایسا لگتا ہے جیسے انہیں ابھی ابھی کسی نے جلایا ہو۔۔۔۔۔ میں نہ کہتی تھی کہ کوئی ہے جو مسلسل مجھ پر جادو کر رہا ہے۔۔۔۔۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے اور۔۔۔۔۔ تم اسے آج تک میرا وہم بتاتے رہے ہو۔۔۔۔۔ اب مجھے بتاؤ۔۔۔۔۔ کہ میں کیا کہن کر جاؤں گی۔۔۔۔۔ مجھے خوف آنے لگا ہے۔۔۔۔۔ وہ تقریباً روتے ہوئے بولی۔

”حوصلہ کرو۔۔۔۔۔ حوصلہ۔۔۔۔۔ تم اب کوئی اور کپڑے پہن لو۔۔۔۔۔ ایک سے ایک بڑھا سوٹ رکھے ہیں تمہارے پاس۔“ فرحان نے فکرمند ہوتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

”مگر اس کا کیا ہوگا۔۔۔۔۔ ابھی کچھ روز پہلے میں نے کپڑے دھو کر چھت پر ڈالے تو کیلے کپڑوں کو آگ لگ گئی تھی وہ تو مجھے جلد پہن چلا گیا تھا ورنہ سب آگ میں جل جاتے۔“ صوفیہ نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ صبح ہونے پر کچھ کرتے ہیں مگر اب تو تم تیار ہو جاؤ۔“

”لیکن اب تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ میں اس گھر میں مزید نہیں رہنا چاہتی۔۔۔۔۔ غضب خدا کا۔۔۔۔۔ یہ ساری واردات صرف میرے ساتھ ہی کیوں ہو رہی ہے۔ کیا دوسرے اس گھر میں موجود نہیں ہیں۔“

”تو کیا تم بھی ہو کہ کوئی گھر کا فرد ہے۔۔۔۔۔ جو تمہارے ساتھ یہ شرارت کر رہا ہے۔“ فرحان نے ٹائی کی گرہ درست بیٹھائی۔

”لگتا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ گھر میں ایسا کوئی ہے جسے میرے ساتھ دشمنی ہے۔“ صوفیہ نے غصے اور کرب کے ملے جلے تاثرات میں جواب دیا۔

”معصیت یہی ہے جو انٹرنیشنل سسٹم میں کسی کو دوشی بھی تو نہیں قرار دیا جاسکتا کس پر انکی اتھاؤ کی۔ کس پر الزام دھر دی۔“ فرحان جو مشترکہ خاندانی نظام کو چاہتا آ رہا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ دادا کی اس جائیداد کا کسی طور پر بٹاؤ ہو۔ وہ ایک اچھی فرم میں بہترین پوسٹ پر کام کرتا تھا اور اس کی تنخواہ اس قدر تھی

کہ اپنے اخراجات کے علاوہ نہ صرف وہ بہت کچھ بچا لیتا تھا بلکہ اس سے گھر کے دوسرے افراد کی ضروریات پر بھی خرچ کر ڈالتا تھا۔

وہ تین بھائی تھے اور سب کی شادیاں اس کے والدین کی زندگی میں ہی ہو چکی تھیں فرحان سب سے بڑا تھا گھر میں اس قدر گنجائش تو موجود تھی کہ وہ سب اپنی اپنی ٹیمیل کے ساتھ آسانی سے رہ سکتے تھے مگر باوجود اس کے کہ اس کے دوسرے بھائی اس قدر نہ کماتے تھے پھر بھی وہ اپنی موردنی جائیداد کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوتے تھے۔ اور ان کی نظریں فرحان کی دولت پر تھی یا منتظر تھے کہ وہ اس مکان کو بیچ کر انہیں حصہ دے دے۔ یا پھر اس مکان کو خود رکھ کر انہیں کہیں دوسرا مکان لے دے۔ مگر فرحان ابھی اتنی ہمت نہ کر پارہا تھا۔ اس لئے وہ خاموش تھا مگر غور نہیں اور زیادہ برتن اکٹھے ہوں تو وہ کھٹکتے رہتے ہیں اور غور میں ایک دوسرے سے بات بہ بات جھگڑتی راتی ہیں۔

اس لئے صوفیہ کو بھی اس بات پر یقین ہو جاتا تھا کہ اسے شک کرنے کے بجائے ڈھونڈے جائے۔ ہیں اور کپڑوں کو جلانے کی واردات میں بھی انہی لوگوں کا ہاتھ ہے جبکہ فرحان اس پر یقین نہ رکھتا تھا۔

آج رات بھی جب وہ کسی فنکشن پر جانے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ تب صوفیہ پر اس بات کا انکشاف ہوا اس کے کپڑوں کے مین درمیان کرکٹ کی گیند جتنی جگہ چلی ہوئی تھی تب ہی تو اس نے شہر چادیا تھا۔

فرحان نے اسے مطمئن تو کر دیا مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس بات کا کس طرح کھوج لگایا جائے کہ اس سارے حادثے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

جیسے جیسے وہ فنکشن تو بھگتا آئے مگر واپسی پر بھی صوفیہ کے ذہن کی سوئی وہیں انکی ہوئی تھی۔

”فرحان۔۔۔۔۔ میں نے پہلے واقعہ کے بعد اپنی سے اس کی کھوج لگانے کی کوشش کی تھی اپنی ایک بلی

کے ہمراہ میں فوری بابا کے پاس گئی تھی بڑا پہنچا ہوا بزرگ ہے اس نے حساب لگا کر بتایا کہ یہ گھر ہی کا کوئی فرد ہے جو شرارت کر رہا ہے مجھے تو یہ تمہاری بھابھی فریدہ کا کیا دھرا لگتا ہے بڑے جادوگر اس کے قبضہ میں ہیں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا اب بہت تھکاؤٹ ہے سو رہا ہوں۔“ فرحان نے صوفیہ کی بات کاٹنے ہوئے کہا اور سو رہا۔

اب تو یہ روزانہ کا معمول بن گیا تھا فرحان جب بھی ڈیوٹی سے واپس آتا تو روز کوئی نہ کوئی نئی بات سننے کو ملتی۔ فرحان کی تشویش بھی بدھتی جا رہی تھی مگر اس کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا تھا کہ وہ کسی عامل سے مل سکے اپنے ایک دوستا سبیلوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے اپنے طور پر اس کا مل بتایا بلکہ رشید اس کا دوست اور اس کے دفتر میں کام کرنے والا ساسی تھا۔

وہ اسے ایک بزرگ کے پاس لے گیا تھا یہ ایک تنگ دتار بیک کوشٹری تھی بڑی ہی گندی جگہ جہاں ایک ہی چار پائی کچھی تھی اور اس کے پیچھے کسی گندی تالی سے نکل کر آیا ہوا پانی سے شرابور کتا بیٹھا تھا کمرے کے ایک کونے میں لوہے کے اسٹینڈ پر رکھا میلا پھیلا ہوا رکھا تھا۔

بابا نیچے فرش پر کچھو کی چٹائی بچھائے بیٹھا جس کے سولے لگا رہا تھا فرحان کو بڑی کراہیت سی محسوس ہوئی مگر اس کے ساتھی رشید نے اسے تقریباً دھکیلنے ہوئے کمرے میں پہنچا دیا۔

انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر بابا نے اپنی بڑی بڑی غلائی لیکن نشتے سے بو جھل آکھیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا وہ دونوں خاموشی سے اس کے قریب بیٹھ گئے۔

”کیوں آئے ہو۔۔۔۔۔؟“ نشتے سے بو جھل آواز نے پوچھا۔

”باباجی۔۔۔۔۔ یہ میرے دوست فرحان ہیں ان کے گھر میں کچھ عرصہ سے بڑا نقصان ہو رہا ہے کبھی

کپڑے جل جاتے ہیں کبھی گھر کا دوسرا نقصان ہو جاتا ہے بڑے پریشان ہیں۔“ رشید نے تعارف کرایا۔

”اگلے روز تو کمال ہی ہو گیا۔۔۔۔۔ میں نے دفتر سے تنخواہ لی تو حیدر قریب ہونے کی وجہ سے آفس والوں نے دس دس کے ٹوٹوں کی نئی گڈی دے دی۔ جب میں گھر آیا تو میری بیگم باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھی اس نے دوسرے پیسے تو پکڑ کر اپنی جیبی پرس میں ڈال لئے مگر نئے ٹوٹوں کی گڈی قریب ہی رکھ لی۔ میں بھی ادھر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد بیگم بولی۔

”فرحان۔۔۔۔۔ نئے ٹوٹوں کی گڈی تم نے اٹھائی۔“

”نہیں تو۔۔۔۔۔“ میں نے اخبار پڑھتے ہوئے جواب دیا۔

”کہاں رکھ دی میں نے۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ارد گرد تمام جگہ دیکھ ڈالی مگر ٹوٹوں کی گڈی کا نہ ملنا تھا اور نہ ملی۔

”مذاق نہ کرو فرحان۔۔۔۔۔“ اس نے رنج ہو کر کہا۔

”سچ کہہ رہا ہوں بابا۔۔۔۔۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے مذاق کرنے کی۔“ میں نے بنجیدگی سے کہا۔

”ابھی میں نے تمہارے سامنے یہاں رکھی تھی۔“ اس نے مجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

تب مجھے بھی حیرانی ہوئی۔۔۔۔۔ مگر گڈی کہیں نہ ملی۔۔۔۔۔ فرحان نے بابا کو بتایا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ بابا نے خمیر لہجے میں جواب دیا۔ اور پھر چوکھیا چراغ کو سامنے رکھ کر اس کی بیٹوں کو جلایا اور خود اس کے سامنے آتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اس کے قریب رکھتا ہونے کے کمرے پر سوئیوں سے ساز بجانا شروع کر دیا ساز کی لے جیسے جیسے تیز ہوتی جا رہی تھی اس کا جاپ بھی اتنا ہی تیز ہوتا جا رہا تھا۔

وہ دونوں خاموشی کے ساتھ اس کے سامنے دم سادھے اس کا تماشا دیکھ رہے تھے چند لمحوں

بعد چار پائی کے نیچے بیٹھا کتارونے کے انداز میں بیٹھا۔  
 ”ہاں..... تو آگئے ہو..... دیکھو اس بالک کو کیا تکلیف ہے بہت مصیبت میں ہے اس کی پریشانی کیا ہے.....“ اس نے ایک ان دیکھی قوت سے سوال کیا۔  
 ”کیا کہا..... کسی گھروالے کی شرارت ہے..... جادو کا اثر ہے..... کون کرتا ہے تعویذ.....“ ایک بار پھر پوچھا گیا۔  
 ”ہوں..... ایک عورت اور ایک مرد..... دونوں ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔“  
 ”کہاں سے یہ سب کرواتے ہیں..... دوبارہ سوال کیا گیا۔  
 ”نہیں پاروالے بابا سے..... اس کا تو ذکر کرو..... یہ سب علم کے زور سے ہو رہا ہے تو اس کو روکو.....“ بابے نے تذکر کی سفارش کی۔  
 ”کچھ دیر کے بعد وہ پھر سے بولا۔  
 ”ہوں..... کر دیا اوپائے..... دوبارہ نقصان تو نہ ہوگا..... دیکھو اگر ان پر کیا ہوا جادو ختم کرنا ہو تو.....“ اس نے پوچھا۔  
 ”ہاں..... ہاں تو یہ تو میں دے رہا ہوں..... اس سے فائدہ ہو جائے گا..... ٹھیک ہے.....“ یہ کہہ کر اس نے ساز بجانا اور پڑھنا بند کر دیا اب وہ براہ راست ان سے مخاطب تھا۔  
 ”سن لیا آپ نے بڑا سخت عمل کر رکھا ہے تمہارے گھر کی ایک عورت ہے اور اس کے ساتھ ایک مرد..... دونوں سے تم بڑی محبت کرتے ہو۔ مگر ان کی نظریں تمہاری دولت پر لگی ہوئی ہیں وہ تمہیں برباد کر دیتا چاہتی ہے حد کرتی ہے تمہاری امارت سے جلتی ہے تمہارے رہن بہن کے انداز سے یہ تعویذ لے لو..... اور اسے قبرستان میں کسی پرانی قبر میں دبا دینا بہتر ہو جائے گا۔“  
 شک وشبہ اور دوسو سے کی چار اوڑھو وہ اور اس

کا ساتھی رشید باہر نکلے تو ایک ہماری رقم فرحان کی جیب سے نکل کر بابے کی مٹھی میں جا چکی تھی اور اس کی مٹھی میں ایک تعویذ آ گیا تھا جسے وہ کسی پرانی قبر میں دفن کرنے کا سوچ رہا تھا۔  
 ”اسے کسی قبرستان میں جا کر پرانی قبر میں دبا دینا۔“ رشید بولا۔  
 ”یار میں نے بھی یہ کام نہیں کیا..... تم چلو ان میرے ساتھ۔“ فرحان کا خوف باہر نکلا تو رشید ہنس دیا۔  
 ”اچھا یار چلو..... تم بھی کیا یاد رکھو گے۔“ وہ دونوں ایک قبرستان میں آگئے گرمیوں کی سائیں سائیں کرتی دوپہر وہ پرانی قبر ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ ایک قبر سے انہیں کسی مردے کی کھوپڑی نظر آئی فرحان نے آگے چلتے ہوئے رشید کے کندھے کو زور سے پکڑ لیا۔  
 ”کیا ہوا؟“ رشید نے رک کر پوچھا۔  
 ”وہ دیکھ رہے ہو..... قبر سے مردے کی کھوپڑی ہمیں دیکھ رہی ہے۔“ فرحان نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔  
 ”بہت ڈر پوک ہو..... کسی کتے یا دوسرے جانور کا کارنامہ ہوگا۔ چلو آگے آؤ.....“ رشید نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور دونوں آگے بڑھ گئے۔  
 پھر ایک پرانی سی قبر کے پاس جا کر وہ رک گئے۔ ایک بڑا سا سوراخ اس قبر کے پہلو میں نکلا ہوا نیچے کہیں دور تک جا رہا تھا۔  
 ”یہ کیا ہے.....“ فرحان نے ڈرے لہجے میں پھر سے پوچھا۔  
 ”چوہوں کی کاریگری ہے.....“ رشید نے اسے کھینٹ لیا اور پھر تھوڑی سی جگہ کی نوکیلے پتھر سے کھود کر اس میں تعویذ دبا دیا اور باہر آ گئے۔  
 لیکن اس کے گھر میں رونما ہونے والے واقعات ختم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی بیوی کا شک بڑھتا چلا گیا اور اب وہ خود ان چکروں

میں پڑ چکا تھا کہ جو نبی اسے وقت ملتا اور جہاں اسے کسی بچپنے بزرگ یا بابے کا پتہ چلتا وہ وہاں پہنچ جاتا۔  
 اب اس کی بھابیوں اور اس کی بیوی کے درمیان اس بات پر جھڑپیں بھی ہونے لگیں تھیں عمران اس کے چھوٹے بھائی کی بیوی رضیہ بڑی منہ پھٹ گئی اس نے تو باتوں باتوں میں ایک بار نہیں کئی بار یہ کہا تھا۔  
 ”جن کے پاس زیادہ دولت ہوگی وافر چیزیں ہوں گی وہی کم ہونگی چوری چکاری بھی تو انہی کی ہوگی نہ ہمارے پاس فالو دولت ہے اور نہ ضرورت سے بڑھ کر چیزیں۔“  
 رات کو گھر آئے فرحان کو مصوفیہ نے یہ بات بتائی تو وہ بے جا رگی سے ہنس دیا۔  
 ”مصوفیہ بات تو اس کی بھی ٹھیک ہے۔“ فرحان بولا۔  
 ”لو اور سنو..... برسوں جو تم نے اپنے لاڈلے جنید کو ریل گاڑی کا کھلونا لا کر دیا تھا وہ جو بیڑی سیل سے چلتا تھا وہ اس سے چھت پر کھیل رہا تھا..... اور میں نیچے کچم میں مصروف تھی کسی کام سے اوپر چھت ہو گئی تو جنید گرمیوں کی اس سخت دوپہر میں وہ اکیلا چھت پر بیٹھا اس کے ساتھ کھیل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ باتیں بھی کئے جا رہا تھا۔“  
 ”جنید..... میں نے آواز دی۔ تو وہ ایک طرح سے چونک اٹھا۔  
 ”بی ماما.....“ ڈرے لہجے میں وہ بولا۔  
 ”دکس سے باتیں کر رہے ہو۔ اور کس کے ساتھ کھیل رہے ہو۔“  
 ”وہ میں..... اپنے دوست کے ساتھ۔“  
 ”کہاں ہے..... مجھے تو یہاں تمہارے علاوہ کوئی نظر نہیں آ رہا۔“  
 ”یہ تو بیٹھا ہے میرے ساتھ.....“ جنید نے اشارہ کیا اور پھر بڑبڑایا۔  
 ”اچھا ماما ہمیں پریشان نہ کرو..... ورنہ میرا دوست بھاگ جائے گا اور پھر میں کس کے ساتھ کھیلوں

## نایاب فراری اپنے بیڈروم میں چھپا دی

امریکہ میں ایک شخص نے اپنی 1969ء ماڈل کی نایاب فراری کار کو محفوظ کرنے کا انوکھا طریقہ استعمال کرتے ہوئے اسے اپنے اپارٹمنٹ کے ایک بیڈروم میں کھڑا کر دیا اور تیس سال بعد اس نے اپنی اس کار کا انکشاف کیا ہے بتایا گیا ہے لاس انجلس کے رہائشی شخص جس نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا ہے کہ اس نے 1959ء ماڈل کی فراری کار 1975ء میں کسی سے خریدی اور اٹھ سال تک اسے چلاتا رہا پھر اسے اپنے اپارٹمنٹ کے ایک بیڈروم میں کھڑا کر دیا تاکہ وہ محفوظ رہ سکے اور اب وہ اسے فروخت کرنا چاہتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس کی یہ کار 7 لاکھ 50 ہزار ڈالر میں فروخت ہو سکتی ہے کیونکہ رزائل برس اسی طرح کی ایک گاڑی جس میں 7 لاکھ 15 ہزار ڈالر میں بک چکی ہے۔  
 (محبت علی - رریا خان)

گا.....“ جنید نے بڑے ذوق سے جواب دیا۔  
 ”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا.....“ میں نے تلخی سے ڈرے انداز میں کہا۔  
 ”اچھا دوست..... کل ملیں گے..... اوکے بابے.....“ یہ کہہ کر جنید نے الوداعی انداز میں ہاتھ کا اشارہ کیا اور میرے ساتھ نیچے آ گیا۔  
 ”اور وہ تمہارا کھلونا کدھر ہے.....“ میں نے اسے زبردستی کھینچے ہوئے پوچھا۔  
 ”وہ تو میں نے اپنے دوست کو دے دیا ہے۔“ جنید نے اطمینان سے جواب دیا۔  
 اس کے ہاتھ واقعی خالی تھے اور کھلونا بھی کہیں موجود نہ تھا۔ فرحان خدا کے لئے کچھ کرو..... ورنہ ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔“ مصوفیہ نے روتے ہوئے کہا۔



”کہاں ہے جیدہ.....“ فرحان نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔  
 ”سوچا ہے.....“ فرحان میں بہت پریشان ہوں..... خدا کے لئے کچھ تو کرو۔“  
 ”بڑی عجیب بات ہے کہیں یہ ساری شرارتیں وہی لوگ تو نہیں کرتے جن کا الزام ہم دوسروں پر لگاتے ہیں۔“ فرحان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”میں نہیں جانتی..... مگر مجھے جیدہ کی طرف سے بڑی فکر ہو رہی ہے۔“ صوفی نے فکر مند لہجے میں بتایا۔  
 ”یہ اس کے لئے ایک نئی بات تھی ساری رات وہ سوچتا رہا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے اس کے تدارک کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا بہت ضروری تھا۔  
 اگلے روز اتوار تھا اس لئے اسے آفس سے چھٹی تھی اس نے جیدہ کو بلا کر پوچھا جیدہ نے اسے بات کی تہدید کی کہ وہ ٹھیک نامی جن کے ساتھ کھیلنا ہے۔  
 ہوئی۔“ فرحان نے حیرانی سے پوچھا۔  
 ”ہاں..... میں اور میرے دوست اکثر اسکول کے لان میں لگے درختوں کے قریب خالی چیرڈ میں کھیلتے ہیں ایک دن اتفاق سے کوئی دوست ادھر نہیں آیا تو میں اکیلا ان درختوں کے پاس پہنچ گیا پہلے تو وہ جگہ خالی تھی مگر اچانک وہاں میرا ہم عمر ایک اور لڑکا مجھے نظر آیا میں نے سمجھا قریبی آبادی کا کوئی لڑکا ہوگا وہ میرے قریب آ کر بیٹا۔“  
 ”دوستی کرو گے.....“ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔  
 ”مجھے وہ اچھا لگا چنانچہ میں نے بھی اس کے ہاتھ پر اپنا توروکھ دیا اور اپنا تعارف کرایا اس نے میرے تعارف کروانے پر اپنا نام تجیل بتایا اور اپنی رہائش قریبی آبادی بتائی یہ اسی وقت سے میرا دوست ہے اور میری اجازت سے ہی میرے گھر آنے لگا ہے آہستہ آہستہ جب ہماری دوستی کچی ہو گئی تو اس نے اپنا اصل نام بتایا کہ اس کا تعلق انسانوں سے نہیں لیکن

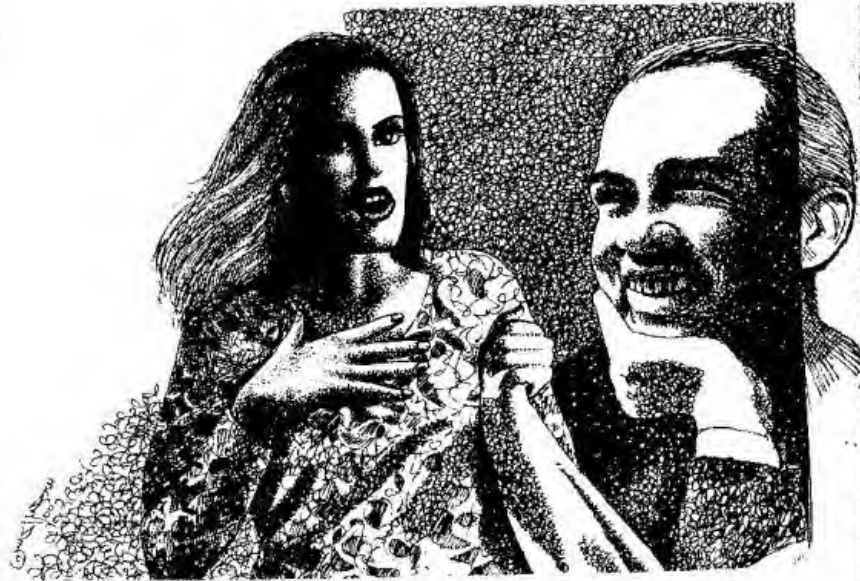
مجھے اس سے کیا غرض..... وہ میرا دوست تھا..... اور میں جب بھی اکیلا ہوتا ہوں تو وہ میرے ساتھ کھیلنے آ جاتا ہے چونکہ اس کا نام مشکل تھا اس لئے میں اسے یاسین کہتا ہوں.....“ یہ عجیب و غریب کہانی سن کر ایک بار تو فرحان پر کچھ ہی طاری ہوئی۔  
 ”تو کیا تمہیں اس سے ڈر نہیں لگتا۔“  
 ”کیوں ڈر کر بات کا..... وہ میرا دوست ہے ہم ایک دوسرے کے ساتھ تجھے تحائف بھی تبدیل کرتے رہتے ہیں وہ جو ریل گاڑی کا کھلونا آپ نے لا کر دیا تھا اسے پسند آ گیا میں نے اسے دے دیا ہے۔“ جیدہ نے ایسے کہا جیسے اس کے لئے یہ بات کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔  
 ”مگر پھر بھی بیٹا..... وہ تمہیں نقصان نہ پہنچائے مجھے ڈر لگتا ہے۔“ فرحان نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔  
 ”اس پر جیدہ فیس دیا بات آئی مٹی ہو گئی ان ہی دنوں کی بات ہے فرحان ڈیوٹی سے واپس لوٹا تو صوفیہ کا مزاج پہلے سے کچھ بدلا بدلا سا تھا رات کھانے پر اس نے فرحان کو بتایا۔  
 ”آج خالدہ اینڈ آئی تھیں۔“  
 ”کون خالدہ اینڈ.....“ فرحان نے استفسار کیا۔  
 ”ارے تم نہیں جانتے..... وہ ادھر کچھلی گلیوں میں رہتی ہیں بے چاری جوانی میں ہی بیوہ ہو کر اپنے والدین کے گھر آ چکی تھیں والدین فوت ہوئے تو ایک بزرگ کو اپنے پاس رکھ لیا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ بزرگ بھی وفات پا گئے مگر کچھوں کو قرآن پڑھاتی ہیں آج وہ آئیں تو آتے ہی حیرانی سے کہنے لگیں۔  
 ”ارے بیٹی..... اپنے گھر کی طرف دھیان دو۔“  
 ”خالدہ کیا بات ہوئی مگر مرگرتی تو مجھے لے بیٹھی ہے اور تم کہہ رہی ہو گھر کی طرف دھیان دوں۔“ میں نے حیرانی سے جواب دیا تو وہ ہنس کر بولیں۔  
 ”ارے نہیں میں یہ نہیں کہتی..... میرا مطلب

کچھ اور ہے تمہارے گھر میں تو ہوائی مخلوق کا ایک سونا آئی آیا ہوا ہے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔  
 ”میں کچھ سمجھی نہیں.....“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔  
 ”کیا تمہارے گھر میں نقصان نہیں ہوتا..... میرا مطلب ہے اشیاء گم نہیں ہوتیں روپے پیسے کا نقصان نہیں ہوتا.....“ انہوں نے استفسار کیا۔  
 ”بہت ہوتا ہے.....“ میں نے ان کی باتوں میں دلچسپی لی۔  
 ”بہت زیادہ ہوتا ہے..... یہ دیکھو ادھر بیٹھے ہیں کچھ ادھر تمہاری کپڑوں والی الماری سے سرکال کر فیس رہے ہیں اور وہ ادھر ڈانٹنگ کرسیوں پر براجمان ہیں اور کچھ ادھر صحن اور دوسرے کمرڈ میں دھناتے پھر رہے ہیں۔“ اس نے اس طرح سے کنشری کی کہ ایک بار تو میرا دل دھل گیا۔  
 ”خالدہ اس کا کچھ کرو..... تم ہی کچھ کرو..... ہم تو بے حد تنگ آ چکے ہیں۔“ میں نے کچھ حوصلہ پاتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”اے لڑکی..... میں صرف دیکھ سکتی ہوں..... میں کوئی عامل تھوڑی ہوں جوان کو بچکا دوں کی عامل سے رابطہ کرو..... تجھی میں تو ان کی تمہارے گھر میں یلغار دیکھ کر پریشان ہو گئی ہوں..... ہوائی مخلوق کا سونا می لگ رہا ہے تمہارے گھر میں.....“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا دیا۔  
 ”وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں..... مگر میں اسی وقت سے پریشان ہوں۔“  
 ”ہوں..... مجھے بھی ایسا ہی لگتا تھا مگر تمہارے غصے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پاتا تھا..... میں نے اپنے ایک دوستا میوں سے کہہ رکھا ہے شاید وہ اس بارے میں کچھ کر پائیں میرے ایک دوست کے جاننے والے سندھ میں رہتے ہیں ان سے رابطہ بھی ہوا ہے وہ کہتا ہے وہ چند روز تک آ جائیں۔“  
 اس رات فرحان کورات میں بھی ایسی مخلوق

دکھائی دی وہ کبھی اسے ڈراتے اور کبھی مختلف روپ دھار کر اسے تنگ کرتے وہ ساری رات نہ سو سکا تھا صبح اٹھ کر اس نے اس کا ذکر صوفیہ سے تو نہ کیا البتہ وہ اندر ہی اندر سے خوف زدہ ضرور رہا۔  
 اس نے دفتر میں اپنے اس ساتھی سے بھی اس بات کا ذکر کیا تو اس نے اسے تسلی دی کہ وہ یوم آزادی کی تعطیل میں ادھر آ رہا ہے۔  
 14 اگست کا دن آنے میں دو روز باقی تھے۔  
 اوریہ وقت صوفیہ اور فرحان دونوں کے لئے گزارنا بہت مشکل ہو رہا تھا پھر وہ لمحہ بھی آن پہنچا۔ تعطیل کی وجہ سے وہ گھر میں موجود تھا جب اس کے ساتھی مشتاق نے اسے موبائل پر کال کر کے بتایا کہ سندھ سے آنے والا عامل اس کے پاس پہنچ گیا ہے اسے وہ لے کر کرب آئے۔  
 ”میں گھر پر ہی ہوں تم اسے لے آؤ۔“ فرحان نے جواب دیا۔  
 ”دوپہر کا وقت تھا..... جب مشتاق اسے لے کر آ گیا..... فرحان نے اسے بیٹھک میں بیٹھایا اور صوفیہ کے ساتھ فرحان بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔  
 آنے والا تقریباً 25/30 سالہ نوجوان تھا۔  
 ”یہ منزل ہیں سندھ میں رہتے ہیں انہیں میں نے تمہارے گھر کے سارے حالات بتائے ہیں۔“ مشتاق نے تمہید باندھی۔  
 ”دکب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔“ منزل نے پوچھا۔  
 ”کئی ماہ سے..... بہت سے لوگوں کو دکھایا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی..... کے مصداق افادہ نہیں ہوا۔“ فرحان نے رک رک کر بتایا۔  
 ”ہوں..... اصل میں..... میرا علم اس کی کاٹ ضرورت کروے گا مگر میرے ساتھ المیہ یہ ہے کہ میں اس مخلوق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا..... اس کے لئے مجھے ایسے شخص کی یا سنے پچنی کی ضرورت ہوگی جو حضرات میں میری مدد کر سکے۔“ منزل نے

# شیطانی عمل

ایس اتیاز احمد - کراچی



ایک بار اس کی محبت کی عزت کو پامال کیا تو کیا دوسری بار وہ خود اپنی محبت کو رسوا کر دے۔  
فیصلہ کر کے وہ دوبارہ خالہ کے پاس آیا۔ ”خالہ میں کل رات راجہ سے نکاح کر لوں گا۔“

سمیح صاحب کرن کی طرح چپکتے اور آن واحد میں مایوسی کے اندھیرے چھٹ جاتے۔ سمیح سمیح الدین کا جہاں سارے محلے والے احترام کرتے وہاں ایک بے ادب بھی تھا۔ صاحب کو کھانا دینا تو دور کی بات گھاس بھی نہ ڈالتا اور وہ بے ادب تھا۔  
سمیح صاحب کا سلیم بڑی بڑی تھا۔ سر سے پیر تک شیطان، سمیح صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ نہ پڑھا ہوتا تو وہ یقیناً سلیم کو انسان کے بجائے سچ کچ کا شیطان سمجھتے۔ جو شاید ان کے امتحان کے لئے اترا تھا۔ سمیح صاحب کو جتنی خدا سے محبت تھی، اتنی ہی سلیم سے نفرت تھی۔ سمیح صاحب کا یہ معمول تھا کہ وہ

سمیح الدین کی آواز میں جانے ایسی کون سی کشش تھی کہ بڑے سے بڑا گناہ گار بھی اگر دو چار بار سمیح صاحب کی آواز سن لے تو ساری عمر گناہ کی طرف رخ نہ کرے۔ محلے کے مرد، عورتیں، بچے بوڑھے سب سمیح صاحب کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آخر لوگ ان کی عزت کیوں نہ کرتے؟ وہ لوگوں کو ایسے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے۔ ان میں اخلاقی قدروں کو اجاگر کرتے۔ تین وقت کا ایچھے سے اچھا کھانا، سمیح صاحب کو محلے کے لوگوں سے پابندی سے ملتا رہتا۔ سمیح الدین محلے والوں کے لئے ہر مسئلے کا حل تھے۔ کوئی مذہبی مسئلہ ہو یا دنیاوی معاملہ

خوفناک کہانیاں 193 اپریل 2018ء

”کوہو..... کیا ہو رہا ہے اب.....“ منزل نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔  
”ہر طرف کئے بیٹے لوگ پڑے ہیں خون سے زمین لال ہو رہی ہے مجھے خوف آ رہا ہے میں چلتی ہوں.....“ امینہ نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔  
”تو بے بابا..... تو بے..... یہ لڑائی تو اب جگ میں تبدیل ہونے لگی ہے میں اپنے گھر میں رات اکیلی ہوتی ہوں میں تو ان سے جھگڑ نہیں سکتی ہو سکتا ہے یہ مجھے تنگ کریں کیونکہ میں نے ہی ان کی نشاندہی کی تھی۔“ امینہ بانی نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

منزل نے بھی دوبارہ سے اپنے ساتھیوں کو بلانے کا عمل شروع کر دیا تھا۔  
”مجھے افسوس ہے کہ مجھے راہ میں اپنا عمل روکنا پڑا ہوں لگتا ہے جیسے اس گھر میں سونا ہی اتر آیا ہے..... یہ جگ لگتی ہے کسی زمانے میں شیشاں گھاٹ رہا ہو..... کیونکہ بقول اس عورت کے..... اس قدر ہوائی مخلوق جن میں مردوں کے علاوہ عورتوں، بچوں کی ایک بڑی تعداد رہتی ہے میں نے نہ پہلے کسی جگہ سنی اور نہ ہی دیکھی ہے۔“ منزل نے فارغ ہوتے ہوئے بتایا۔  
”تو اب کیا ہوگا.....“ صوفیہ نے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

”سونا ہی اگر ایک بار اتر جائے تو دیر بعد ہی ملے گا..... ان میں سے بے شمار کو میرے ساتھیوں نے قتل کر ڈالا ہے اور دوسرے یہ جگ چھوڑ گئے ہیں امید ہے اب آپ کو دوبارہ اس بات کی شکایت نہ ہوگی اور نہ ہی یہ دوبارہ شرارتیں کریں گے۔“ منزل نے حوصلہ دلایا۔  
اور پھر منزل چلا گیا اور جاتے جاتے ایک بہت بڑی رقم بھی لے گیا..... اس کے بعد اس گھر میں بھی افادہ ہو گیا مگر سونا ہی اتر جائے تو کیا اس کے نقصانات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

صوفیہ اور فرحان ابھی تک اسی ڈر میں مبتلا ہیں۔ کہ نہ جانے پھر سے سونا ہی آجائے۔

☆☆

جواب دیا۔  
”یہ ٹھیک رہے گا..... آپ اسے بلوالیں وہ دیکھ کر مجھے بتائی رہیں گی اور میں بہتر طور پر انہیں یہاں سے بھگادوں گا۔“ منزل بولا۔  
تب صوفیہ نے چند کو بھجوا کر امینہ بانی کو بلوالیا۔  
وہ آ کر ان کے نزدیک بیٹھی تھی..... مگر اس کی نظریں بڑی تشویش اور حیرانی سے ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔  
”کیا آپ دیکھ سکتی ہیں.....“ منزل نے پوچھا۔  
”بہت کچھ دیکھ رہی ہوں.....“ امینہ نے

جواب دیا۔  
”پھر میں ان کو بھگانے کے لئے یا ان کا صفایا کرنے کا عمل کرتا ہوں آپ دیکھ کر مجھے بتائی رہیں۔“  
منزل نے یہ کہہ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ساتھ وہ پوچھتا چلا جا رہا تھا۔  
”آپ دیکھ رہی ہیں میرے کچھ حواری ادھر سے آ رہے ہیں۔“ منزل نے پوچھا۔  
”ہاں..... کچھ لوگ آ رہے ہیں..... مسلسل آتے جا رہے ہیں اور اب اس گھر میں پہلے سے موجود لوگوں سے ان کی ہاتھ پائی شروع ہو چکی ہے۔“

یوں لگ رہا تھا جیسے اس بھینک ٹھیل پر ایندروں تبصرہ کر رہی ہو منزل تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس سے سوال کرتا جا رہا تھا۔  
امینہ بانی نے بتایا کہ اب دونوں اطراف سے بڑھ بڑھ کر محلے ہو رہے ہیں کچھ لوگ کاٹ رہے ہیں اور کچھ کٹ کر گر رہے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی تعداد میں کمی نہیں ہو رہی..... شاید اب امینہ بھی خوف زدہ ہونے لگی تھی کیونکہ اس کے چہرے پر مردنی سی چھانے لگی تھی۔

باقی سارے بڑی پریشانی سے خاموش بیٹھے تھے انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور وہ دونوں کیا کر رہے ہیں منزل کسی ماہر کی طرح اپنی افواج کو لڑا رہا تھا مگر امینہ بانی کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

خوفناک کہانیاں 192 اپریل 2018ء

دروازے پر جاتے کینوں کی خیریت دریافت کرتے ان کے مسائل دلچسپی سے سنتے اور جہاں تک ممکن ہوتا ان کی مدد کرتے۔ پیر کے روز بھی وہ حسب مول نصیر کی نماز پڑھ کر محلے میں داخل ہوئے تو ان کی نظر گھریلو سامان سے بھری سوزوکی پر پڑی۔ وہ لپک کر محلے میں داخل ہوئے۔ سوزوکی پر رکھا ہوا سامان مالکان کی زبوں حالی کو پکار پکار کر عیاں کر رہا تھا۔ مسیح صاحب نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ سامان کے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے۔ بلکہ دو خواتین ہیں۔ جن میں ایک بچی عمر کی عورت تھی اور ایک کم عمر لڑکی جس کا اچھوت حسن آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ مسیح صاحب فوراً آگے بڑھے۔ ”خاتون! کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ دونوں خواتین نے ایک ساتھ مڑ کر فوراً ان کی طرف دیکھا۔ ”جی ہاں! بڑی مہربانی، آپ ذرا یہ الماری محلے کے لڑکوں سے پکڑوا کر اندر رکھوادیں۔“

”بالکل بالکل۔“

مسیح صاحب نے جلدی سے کہا اور تیزی سے مڑ گئے۔ چند سیکنڈ بعد جب وہ وارد ہوئے تو ان کے ساتھ دو صحت مند لڑکے تھے۔ دونوں لڑکوں نے خواتین کو سلام کیا۔ سوزوکی والے کی مدد سے الماری اتروائی اور گھر کے اندر لے گئے۔ جس وقت لڑکے الماری اندر لے جا رہے تھے، مسیح صاحب کی نظر سلیم پر پڑی وہ خدمت کے جذبہ میں بھول بیٹھے کہ سلیم ان کا اڑی دشمن ہے۔

”ارے سلیم بیٹا ادھر آنا؟“

سلیم نے مڑ کر ان کو تیز نگاہوں سے دیکھا لیکن بغیر کچھ کہے آگے آ گیا۔ ”بیٹا ذرا گاڑی سے صندوق اتار کر اس گھر میں پہنچا دو۔“ انہوں نے انگلی سے سامنے والے گھر کی طرف اشارہ کیا، دراصل گاڑی آگے نہیں جاسکتی راستہ تنگ ہے۔ پھر دیکھو تو صرف دو خواتین ہیں سارے سامان کے ساتھ، پتہ نہیں کیا آفت آن پڑی کہ کوئی بھی مرد ساتھ نہیں ہے

اور پتہ نہیں کوئی مرد ہے بھی یا نہیں پھر بھی بے چاریاں تنہا دنیا کے دکھ اٹھا رہی ہیں۔ آپ ہی آپ بڑبڑا کر مسیح صاحب نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا سلیم اپنی جگہ کھڑا ہے اور اس کی نگاہ سامان کے ساتھ آنے والی لڑکی پر پڑی ہے۔ یہ دیکھ کر مسیح صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لا حول ولاقوۃ میاں لوگ واقعی سچ کہتے ہیں چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اسے میں تجھ سے کہہ رہا ہوں صندوق اندر پہنچا دے اور تو کس شیطانی دھندے سے لگا ہے۔ سلیم نے گردن گھما کر دیکھا اور بازاری مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولا۔

”ارے مسیح الدین نظریں GOD کی تعریف کر رہی تھیں۔ خدا کی قسم کیا حسن اُترا ہے۔ شہنشاہ پرگنی اور رہا صندوق تو یہ مسیح صاحب ان حسن زادی کے طفیل ابھی گھر میں پہنچا۔ تم تو جانتے ہو کہ سلیم بھوٹ میں کسی کام بھی نہیں کرتا۔ پر ایک نظر نے ساری مزدوری دے دی اللہ قسم۔ سلیم نے بازاری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر ایک آنکھ دبا کر مسیح صاحب کو عامیانہ سا اشارہ کیا اور صندوق اندر پہنچا کر یہ جاوہ جا۔“ لا حول ولاقوۃ“ کہتے ہوئے مسیح صاحب تیزی سے خواتین کے پاس گئے اور جلدی سے معذرت کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”دیکھئے برائہ مانے گا۔ اس کم بخت نے لپٹنے کی باتوں کا یہ سارا حملہ شریفوں کا ہے یہاں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ سارا حملہ خاندان کی طرح رہتا ہے۔ آپ جس وقت“ ابھی مسیح صاحب کی بات ادھوری ہی تھی کہ محلے کی کئی خواتین اندر داخل ہوئیں علیک علیک کے بعد پڑوس کی چوکی اماں حسب عادت مردانہ آواز میں مخاطب ہوئی۔

”اے اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا پڑوس آباد ہوا۔ کم سے کم اب رونق تو لگی رہے گی۔ کیا نام ہے، بہن تمہارا؟ کہاں سے آئی ہو کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟“ انہوں نے گہری نظروں سے کم عمر لڑکی کی طرف دیکھتے

ہوئے پتہ عمر کی خاتون سے سوال کیا۔ عورت دکھ سے مخاطب ہوئی۔

”جی میرا نام روزی ہے اور یہ میری بیٹی ریٹا ہے۔ میرے شوہر مانیکل کا پچھلے برس انتقال ہو گیا۔ جب تک وہ زندہ رہے ہم خوش و خرم تھے دوستوں رشتہ داروں کی کوئی کمی نہ تھی ان کی آنکھیں کیا بند ہوئیں ایک ایک کر کے سارے سگی ساتھی تنہا کر گئے۔ جمع پونجی ختم ہوئی تو مکان بیچ ڈالا، آخر کب تک وہ سرمایہ سہارا دیتا۔ آج کل کراہ کے مکان بھی ایک عذاب ہیں، سلائی کر کے اتنا کماگیتی ہوں کہ ہم ماں بیٹی کی گزر بسر ہو جاتی ہے۔“ بات ختم کر کے جب انہوں نے تمام لوگوں پر نگاہ ڈالی تو آٹھ دس خواتین میں سے اب وہاں پر صرف دو چار خواتین ہی بچی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی بے ڈاری کے آثار نمایاں تھے۔ البتہ مسیح صاحب ہمدن گوش تھے۔ باقی خواتین دل ہی دل میں توبہ کرتے ہوئے صرف اس لئے اپنے گھر پہنچ گئیں کہ ایک غیر مذہب کی عورت کے ساتھ بیٹھ کر وہ کیوں جہنم خریدیں۔ جب کہ ان میں سے کچھ عورتوں کا خیال تھا کہ ایسے گھر پر خرا کی مار ہوتی ہے جہاں کوئی مرد نہ ہو۔ بھلا مرد کے بغیر بھی گھر میں رونق ہوتی ہے۔ جب رات گئے تک میاں بیوی کے بچھڑے کی آواز نہ آئے، دو چار برتن نہ ٹوٹیں اور بیوی کے جسم پر سچ پڑوس کی عورتوں کو نیکل نظر نہ آئے تو کوئی زندگی بھی ہے۔ جب تھوڑی دیر میں محلے کی باقی خواتین بھی اپنے اپنے گھر چلی گئیں تو ریٹا نے ماں کو آواز لگائی۔

”امی گھر کا غسل خانہ تو بالکل بدترین صورت حال پیش کر رہا ہے۔“

بیٹی کی آواز پر جب روزی نے جا کر دیکھا تو جی جگہ جگہ کانٹے نے نہ صرف غسل خانہ کو بلکہ اس سے قریب باورچی خانہ کو بھی سیل زدہ کر دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہم ابھی مل کر اس گھر کو گادیں گے۔“ ماں نے ایک عزم کے ساتھ بیٹی کو

مخاطب کیا۔

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“ ریٹا نے ماں کے خیال سے متفق ہوتے ہوئے کہا۔ دو کمروں کے مکان کی صفائی ٹائم ہی کتنا جیتی ہے۔ چار گھنٹے میں سارا مکان صاف ہو گیا۔ دونوں نے ایک نظر سارے گھر پر ڈالی کہ کہیں کچھ باقی تو نہیں رہ گیا۔ مگر کونہ کونہ صاف ہو چکا تھا۔ اب رات کے آٹھ بج رہے تھے، گرمیوں میں یہ وقت کچھ اتنا اندھیرا نہیں لاتا۔ مگر دونوں تھک کر اتنا چور ہو چکی تھیں کہ ان کی ہمت نہیں تھی کہ باہر جا کر کچھ کھانے کا انتظام کریں دونوں نے ایسے ہی رات بسر کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد ریٹا نے ماں کو آواز لگائی امی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

”اگر کھوتو چائے بنا لوں؟“ اس بات پر ماں نے خاموشی اختیار کر لی، شاید سوچ رہی تھیں کہ خالی چائے سے کیا گزارا ہوگا اگر چائے ابھی بنا بھی لی تو صبح کہاں سے چائے بنائیں گے، ڈبے میں صرف ایک وقت کی چائے کی پتی پڑی تھی۔ جس وقت وہ پرانا مکان خالی کر رہی تھی وہاں آس پاس کی عورتوں پر ان کے سلائی کے پیسے آتے تھے مگر سب نے مختلف دنوں کا وعدہ کر کے ان کو ٹال دیا تھا۔ البتہ بے بی کی ماں نے بیگم روزی کے بڑے اصرار پر کہا تھا کہ وہ شام کو بے بی کو اباسے اس کی سلائی کے پچاس روپے لے کر گھر میں آکر اکل دے وہ آکر لے جائے۔ محلے کی خواتین کے رویے سے ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کسی سے بھی مدد کی توقع رکھنا فضول ہے۔ آنے والی خواتین میں سے ایک خاتون بڑے روکھے انداز میں کہتے ہوئے ابھی تھیں۔

”چلو بھئی اشمشوں کے ابا کہتے ہیں، کافروں سے دوستی سے بہتر مسلمانوں کی دشمنی ہے۔“

گوڈ بہتر کرے ان مسیح صاحب کا جنہوں نے فوراً کہا تھا۔

”اری کم عقل یہ اہل کتاب ہیں اور اہل



کتاب کا فر نہیں ہوتے۔“ جس پر اس عورت نے ہانک سکو کر کہا۔

”معاف کرنا مسیح صاحب ہم نے بزرگوں سے سنا ہے اور خود کو بھی دیکھا ہے جس سال زیادہ تر کم ہوتے ہیں اور اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ کم ترول سے دوستی کریں۔“ جس پر مسیح صاحب نے ان کو عالمانہ لیکچر دیا دس بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ بھوک کی وجہ سے دونوں ہی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ آواز سن کر روزی نے بستر سے اٹھنا چاہا۔

”ظہور۔“ ماں نے اس کو روکتے ہوئے کہا رات کا ٹائم ہے بیٹی اور پھر حملہ بھی نیا ہے میں دیکھتی ہوں، روزی نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک آٹھ لوسال کا لڑکا کھڑا تھا۔ بیگم روزی کو دیکھ کر جلدی سے بولا۔

”یہ کھانا ہے مسیح صاحب نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اس کو بڑوں ہونے کے ناتے اپنا حق سمجھیں۔“ دونوں ماں بیٹی جس وقت کھانا کھاتے ہوئے مسیح صاحب کو دعا میں دے رہی تھیں مسیح صاحب بھی ان کے خیالوں میں گم تھے۔

”امی مسیح صاحب بڑے نیک آدمی ہیں۔ دیکھئے تو ہمارا کتنا خیال ہے ان کو اور امی سچ مجھے تو نیند بھی نہیں آتی۔“ کھانے کے بغیر ریتانے جلدی جلدی کھانا کھاتے ہوئے مسیح صاحب کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ ہاں یہ تو ہے ماں نے صرف اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ کھانا کھانے کے بعد نہ جانے کس وقت باتیں کرتے کرتے دونوں ماں بیٹی سو گئیں۔

ادھر مسیح صاحب کی آج برسوں بعد نیند آگئی تھی۔ مسیح صاحب رات بھر خدا کی تعریف کرتے رہے کہ اس خدا نے ریتا کو کس قدر خوب صورت بنایا تھا۔ خیالات بیکٹنے لگے تو انہوں نے جلدی سے ”لا حول“ پڑھی۔ اور پھر خود ہی بو بڑا نے کسی بندے کی کیا مجال کہ وہ خوب صورت بن جائے اور کسی دوسرے بندے کی کیا مجال کہ وہ اس کی رضا کے بغیر اس خوب صورتی کی تعریف کرے اور پھر ریتا کی

تعریف تو خدا کی تعریف ہے، کسی عورت کی تعریف ہرگز نہیں۔ وہ تو اس مصر کی تعریف تھی جس نے زمین پر بلا کی خوب صورتی بکھیر دی تھی۔ اس طرح وہ پیدا ہوتی ہوئی بحرمانہ سوچ کو جان بوجھ کر ان کی دل ہی دل میں کوشش کرتے رہے۔ گو کہ مسیح صاحب نے دو چار بار ہی کن اکھیوں سے ریتا کو دیکھا تھا۔ لیکن بلا کا حسن ان کی نگاہوں میں چھا گیا تھا۔ کشادہ پیشانی کے نیچے گہری ہنر آکھیں۔

ذرا نیچے خوب صورت ناک، ذرا اور نیچے خوب صورت ہونٹ، ذرا اور نیچے خوب صورت گردن اور ذرا..... اور..... نیچے..... یہاں سے آگے مسیح صاحب سے سوچا نہ گیا اور ان کا سانس دھونکی کی طرح چلنے لگا۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح فجر کی نماز کے بعد وہ دعا میں رہنا.....

صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔ انہوں نے اپنے نادان دل کو ڈانٹا۔ اور چورنگا ہوں سے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی ان کے خیالات سے واقف تو نہیں ہو گیا۔ مگر کمرے میں چاروں طرف اندھیرا تھا صرف ان کا دل ریتا کے حسن سے روشن تھا۔

دوسری طرف سلیم بھی جاگ رہا تھا۔ ریتا ہاں بار اس کے خیالوں میں جھم جھم کرتی جاتی اور وہ گہرا کر اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اور خدا سے دعا کرتا۔ ”اے خدا تو جانتا ہے، میرا دل پاک ہے سلیم دنیا میں بڑے سے بڑے بد معاش اور بڑے سے بڑے شریف سے نہیں ڈرا۔ سلیم اگر ڈرا ہے، تو صرف کسی کنواری کی عزت سے ڈرا ہے اے پاک ذات اس حسن کی دیوی کو ہمیشہ پاک رکھنا اس کی عزت کی حفاظت کرنا۔“

سلیم نے بھی کسی لڑکی پر بڑی نگاہ نہیں ڈالی اس نے ریتا پر بھی ایک عام نظر ڈالی تھی۔ مگر اس کا حسن اس کی نگاہوں میں بس گیا تھا۔ دل بار بار کہتا سلیم یہ حیرے لئے دنیا میں آئی ہے۔ یا اللہ تو جانتا ہے میں بہت برا آدمی ہوں۔ اے مالک مجھے برا رہنے دے اٹھا اچھی لڑکی کی خواہش میرے دل میں مت

ڈال۔

دعا مانگتے مانگتے سلیم کی آنکھوں سے زار زار موتیوں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ اللہ بڑا ہے۔ اللہ بڑا ہے کی آواز کے ساتھ ہی سلیم نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد روزی نے بیٹی کو آواز لگائی۔ ریتا دروازہ اندر سے بند کر لو میں ذرا سلائی کے پیسے لے آؤں۔ اور خبردار کوئی بھی آئے دروازہ مت کھولا ابھی وہ دروازے سے باہر قدم نکال ہی رہی تھی کہ ان کو مسیح صاحب نظر آئے جن کا رخ ان کے ہی گھر کی طرف تھا۔ روزی نے دروازہ پر رک کر مسیح صاحب کے قریب پہنچنے کا انتظار کیا۔ سلام دعا کے بعد روزی نے رات کے کھانے کے لئے مسیح کا شکریہ ادا کیا تو مسیح صاحب دل میں بڑے حیران ہوئے اور ان کی نظر جیسے ہی دروازہ کے اندر کھڑی ریتا پر پڑی وہ حیرانگی کو بھول بھال کر اس کی خیریت دریافت کرنے لگے۔

وقت جتنی تیزی سے آتا ہے اتنی ہی تیزی سے گزر جاتا ہے روزی کو اس محلے میں آئے ہوئے چھ ماہ ہو گئے اور اس دوران وہی محلے والے جو کترا کر گزر گئے تھے روزی اور ریتا کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ محلے کی کوئی خوشی اور غمی ان کے بغیر ادھوری سمجھتی جاتی اور اس اہمیت کے لئے دونوں ماں بیٹی مسیح صاحب کی شکر گزارتھیں۔ جن کی کوششوں سے محلے والوں نے نہ صرف یہ کہ ان کو قبول کر لیا تھا بلکہ ان سے محبت بھی کرنے لگے تھے۔ ایک اعتماد ان کو اس محلے میں مل گیا۔ مگر اس اعتماد میں شک کا بال سلیم کی ذات تھی وہ اب سلیم سے خوفزدہ رہتی تھیں۔ ان کو صرف سلیم سے کسی نہ کسی خطرہ کا خوف لگا ہی رہتا اور پھر کچھ دنوں سے وہ اپنی بیٹی ریتا میں بھی بڑی تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔

ریتا اب گھوم پھر کر سلیم کے تذکرہ کو اپنی باتوں میں ضرور لاتی اور سلیم بھی جہاں نہیں ریتا کو دیکھتا پھر کا

بت بن جاتا۔ ابھی کل شام ہی کو جب وہ سامنے گھر سے نکلی تو سلیم اور ریتا ایک دوسرے کو گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ریتا نے جیسے ہی ماں کی آہٹ محسوس کی تیزی سے اندر چلی گئی اور سلیم نے بھی پیٹھ موڑ لی۔ اور یہ اس طرح کے دوسرے واقعات نے روزی کو بیٹی کی طرف سے کافی فکر مند کر رکھا تھا۔

چھ ماہ میں روزی پر مسیح صاحب کی قربت نے بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ان کے پہنچنے کے انداز اور رویہ نے روزی کو تنجیدگی سے مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ مسیح صاحب سے وہ پہلے ہی کئی دین کی کتابیں لے کر پڑھ چکی تھی۔ اسلام ان کو تمام مذاہب سے افضل لگا، جہاں زندگی کا ہر مسئلہ سمجھا ہوا تھا۔

آخر ایک دن حتمی فیصلہ کر کے انہوں نے اپنے گھر ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا اور اسی تقریب میں مسیح صاحب کے ہاتھوں دونوں ماں بیٹی مسلمان ہو گئیں۔ محلے والوں نے اس خوشی پر روزی کو جس کا نام زریہ اور ریتا کو جس کا نیا اسلامی نام رابعہ رکھا گیا بار پہنائے۔ اس واقعہ کے بعد مسیح صاحب کو لوگوں کی نظر میں کچھ اور بڑی بزرگ ہستی بن گئے۔ تقریب کے اختتام پر مسیح صاحب اب رابعہ (ریتا) سے مسلمان ہونے کے ناطے اور زیادہ قربت محسوس کر رہے تھے۔

جس وقت دروازے پر دستک ہوئی رابعہ قرآن شریف یاد کر رہی تھی ایک ایک حرف اس کے دل میں اتر رہا تھا۔ شیریں آواز دروازے سے کان لگائے سلیم کے دل میں ایک بے قراری پیدا کر رہی تھی۔ سلیم کو چاروں طرف نور ہی نور نظر آ رہا تھا۔ وہ گنا گار زار زار معافی کے لئے آنسو بہا رہا تھا کہ اچانک نگاہ مسیح صاحب پر پڑی جو رابعہ کی طرف آرہے تھے۔

سلیم ایک کونے میں ہو گیا۔ دستک سن کر رابعہ نے دروازہ کھولا اور خوش ہو کر بولی مسیح صاحب میں نے سبق یاد کر لیا ہے۔ کیا اماں ہے گھر ہیں؟



”چھوڑ دو مجھے..... خدا کے لئے جانے.....  
 ہائے..... آ..... چھوڑ دو.....“  
 نازک حسین لڑکی زمین پر لیٹی زنجیروں سے بندھی  
 رہی تھی۔

”کوئی ہاتھ میں بڑی دھارواں کبھاڑی لئے  
ہاتھ جب قریب پہنچا تو لڑکی مکمل طور پر سہم چکی تھی  
ٹھانڈی کچھ کھانچا جی تھی کہ اس شیطان نے کبھاڑی کی  
نصف میں بند کی اور زور سے کبھاڑی اس کی ٹانگہ  
پر ماری..... ٹانگہ کٹ گئی..... لڑکی کسی بنیا پانی  
کھلی کی طرح تڑپ رہی تھی مگر وہ مضبوط زنجیروں  
پر تھم رہی تھی۔ ہاتھ دوبارہ ہوا میں بند ہوئے اور جسم کے

نہیں سمجھ صاحب وہ سلائی کے کپڑے دینے  
 ڈرتے وہ اندر داخل ہوا۔ بیٹھ جاؤ کہہ کر راجہ کی امی  
 نے اچانک اپنے سر سے دوپٹہ اتار اور اس کے  
 منہ پر لپیٹ دیا۔

اس دوران سلیم وہاں سے سیدھا مسجد کی طرف چلا آیا اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ وہ چارہا تھا کہ ساری عمر اسی طرح بیٹھا رہے اور روتا رہے لیکن اس کو بہت سے کام کرنے تھے اس نے سنا تھا کہ سیکینہ کی شادی کے لئے اس کے باپ کو کسی سے بھی رقم نہیں مل رہی ہے۔ لہذا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ چوری کرے گا اور رقم سیکینہ کے گھر ضرور پہنچائے گا اس کی شادی وقت پر ضرور ہوگی۔

مسجد سے نکل کر وہ دوبارہ کئی میں داخل ہوا تو

اس کی نگاہ سب پر پڑی وہ رابعہ کے گھر سے  
بڑے گہرائے ہوئے انداز میں نکلے۔ سارا جسم پسینہ  
سے شرابور تھا ہمیشہ سر پر مو جو ڈوٹی قانع تھی اور وہ تیز  
تیز چلنے پر قادر تھی۔  
سلیم نے انجانے خدشہ کے تحت تیزی سے

راجہ کے دروازے پر پہنچ کر تین بار ہولے ہولے سے دستک دی مگر جواب نہ ملا ایسا ہو کر وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ دو چار روز بعد ہی سلیم کی مصروفیات دوبارہ عود آئیں۔ جگہ جگہ چوریاں کرنا اور رقم کو کیکنہ کے گھر میں پہنچانے میں وہ اتنا مصروف ہوا کہ اس کو یہ بھی نہیں چلا اور تین ماہ گزر گئے۔

رابعہ کی یاد کے ساتھ ساتھ اس کو بار بار مسیح صاحب کا رابعہ کے گھر سے گھبرا کر کھٹا جھنڈا میں نہیں آتا تھا۔ مگر ایک روز یہ مکتی بھی سلجھ گئی۔ وہ مٹلے سے گھٹناتا گزر رہا تھا، آج صبح اس نے رابعہ کو دیکھا تھا۔ وہ کمزور لگ رہی تھی۔ مگر اتنی خوب صورت تھی جب بھی رابعہ پر نظر پڑتی ایک ٹور کی خشک اس کے دل میں اتر جاتی۔ ابھی وہ رابعہ کے گھر کے نزدیک ہی پہنچا تھا کہ رابعہ کی امی زریبہ نے دروازہ کھولا اس پر نگاہ پڑتے ہی آواز دی۔

گیا تھا کہ اس کے دل نے سرگوشی کی کیا رابعہ اس بدنامی کے بعد زندہ رہ سکے گی۔ کیا لوگ اس کی عزت کریں گے۔

ایک بار مسیح صاحب نے اس کی محبت کی عزت کو پامال کیا تو کیا دوسری بار وہ خود اپنی محبت کو رسوا کر دے۔ فیصلہ کر کے وہ دوبارہ رابعہ کے پاس آیا خالد اندر ہی تھیں۔ ”خالدہ میں کل رابعہ سے نکاح کر لوں گا۔“ سلیم نے رابعہ پر نگاہ ڈالی اور وہ اسے

☆ ☆

رانا شہر یار نے اسے خرید لیا اور پھر اس گھر کا آخری فرد  
حنا شہر یار جو نشاء حسد کے نام سے مشہور ہے۔ ایک  
سپر ماڈل ہے جس کے جلوؤں سے دیکھنے والا مست  
محو ہو جاتا ہے۔

گاؤں سے شہر جاتے ہوئے اس کے ساتھ اس  
کی والدہ بھی تھی مگر وہ چار سال پہلے ایک کار ایڈیٹ  
میں ماری گئی۔ اس کے پیچھے گاڑی میں کچھ لوگ اس کا  
تغائب کر رہے تھے تیز رفتاری کے باعث گاڑی ایک  
ٹرک سے ٹکرائی اب اس حویلی کی اکلوتی وارث حنا  
شہر یار عرف نشاء حسد ہے جو بچپن میں ہی شہر آ گئی تھی  
اور دوبارہ بھی حویلی کو پلٹ کر نہ دیکھا۔

☆.....☆.....☆  
کانٹیل راشد جو حویلی کو چیک کر کے آیا تھا  
اور پھر یہ تمام معلومات اس نے اپنے سینئر ”انسپکٹر سجاد“  
کو فراہم کیں۔ دراصل ایک دن پہلے حویلی میں کسی  
لاکی کا بے دردی سے قتل ہو گیا تھا اور اس کیس کو انسپکٹر  
سجاد ہینڈل کر رہا تھا انسپکٹر سجاد نے راشد کو کچھ ضروری  
ہدایات دی اور کہا قتل کے بعد فوری طور پر پہلے حویلی  
اور پھر نشاء حسد کے گھر روانہ ہونا ہے۔

انسپکٹر سجاد دوپہر 3 بجے کانٹیل راشد اور اس  
کے ہمراہ دوکانٹیل ودیگر سامان کے حویلی کے اندر قتل  
والی جگہ موجود تھا۔ قتل والی جگہ کی سفید چوٹے سے  
خاص حد بندی کی گئی تھی۔

”قتل کرنے سے پہلے لڑکی کو تشدد کا نشانہ  
بنایا گیا۔۔۔ اور پھر اس کے بعد زنجیروں سے باندھا گیا  
اور لوہے کی کسی تیز دھار آلے سے بے دردی کے  
ساتھ قتل کیا گیا۔“ انسپکٹر سجاد نے پوسٹ مارٹم بمعہ قتل  
والی جگہ کو دیکھتے ہوئے قتل کی نوعیت کا جائزہ لیتے  
ہوئے کہا۔

اس کے بعد حویلی کے دیگر کمروں کا جائزہ لیا گیا  
اور چھوٹے موٹے دھنکس کا جائزہ لیا گیا اب گاڑی کا  
رخ شہر کی جانب تھا اور شہر پہنچنے کے بعد نشاء سے  
ملاقات کرنا تھی۔

”انسپکٹر سجاد جوان سالہ اچھے قد و قامت کا مالک  
ایک خوب صورت حسین جوان تھا اور اس وقت وہ اپنے تین  
عدد کانٹیل کے ہمراہ نشاء کے بچکے میں موجود تھا۔

”نشاء آپ آخر بچپن کے بعد اب تک اپنے  
آبائی گاؤں کی حویلی میں واپس کیوں نہیں گئی۔“ انسپکٹر  
سجاد نے نشاء سے دعا و سلام کے بعد پراسوال پوچھا۔  
”مجھے آگے بڑھنا اچھا لگتا ہے اور بچپن سے  
مجھے پرانی چیزوں سے کوئی لگاؤ نہیں۔۔۔ میں آپ کے  
اس پرانے سوال کا اتنا ہی جواب دینا چاہوں گی  
جو میڈیا والے مجھ سے کئی بار پوچھ چکے ہیں۔“ نشاء نے  
اپنے مخصوص مغرور انداز میں جواب دیا۔

”مجھے قتل کا علم ہو چکا ہے جس نے بھی یہ کیا، غلط  
کیا اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ اسے ضرور  
سزا دلوائیں گے مگر ان سب سے پہلے یہی کہ آپ  
جو سوالات مجھ سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کچھ  
چینا چاہیں گے۔“ نشاء نے کہا۔  
”نہیں شکس۔۔۔“ انسپکٹر سجاد نے کہا۔

”میرا دوسرا سوال یہ ہے۔۔۔ کہ کیا کوئی آپ کی  
حویلی خریدنا چاہتا ہے مگر آپ اسے بیچنے پر راضی  
نہیں۔“ انسپکٹر سجاد نے کہا۔

”ارے۔۔۔ میں تو شکر کروں۔۔۔ جان چھوٹے  
اس منحوس حویلی سے میری۔۔۔ اس کی وجہ سے میڈیا  
والے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے  
ہیں۔“ نشاء نے کہا۔

”وہ حویلی شروع سے ہی منحوس ہے جب  
میرے والد صاحب رانا شہر یار نے خریدی تو اس کے  
بعد ان کی دشمنی ملک فہیم انجم سے ہو گئی۔ دشمنی کی وجہ  
سے دونوں طرف سے جانوں کے نقصان دے دیئے گئے  
پھر میں اور میری والدہ دونوں شہر آ گئے اور جب میں  
نے ماڈلنگ میں قدم رکھا تو شوبیز کی دنیا میں میرا  
ایک مقام بن گیا سو مجھے بلیک میل کیا جانے لگا جس کی  
وجہ سے میری والدہ ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئیں خبر  
میں نے بلیک میل کرنے والوں کو قانونی طور پر سزا

لوادی اب میں خود یہ چاہتی تھی کہ یہ حویلی کسی طرح  
یک جائے مگر پھر اس معصوم لڑکی ”رنا یاب“  
کا قتل۔۔۔ وہ میری اسٹوڈنٹ تھی اور میں اسے بہت  
جلد ماڈلنگ کی دنیا میں لانے والی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ اس  
کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہ تھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ پتا  
نہیں میرے ساتھ ہی کیوں۔۔۔ بچپن سے لے کر آج  
تک جس کو اپنا بنایا، جس کو اپنا سمجھا وہی کیوں دور چلا  
جاتا ہے۔۔۔ کہنے کو تو سپر ماڈل ہوں لاکھوں فین ہیں  
میرے، ہزاروں چاہنے والے مگر پھر بھی اس جہنم میں  
لیجا کامیابی کا سفر طے کر رہی ہوں۔۔۔ نشاء کی  
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”نہیں میڈم میرا مقصد آپ کو ہرگز دھمکی کرنا  
نہیں تھا۔۔۔ پلیز میڈم آپ دیدہ نہ ہو۔۔۔“ انسپکٹر سجاد  
نے نشاء کو نشودیتے ہوئے کہا اور وہ آنسو پونچھنے لگی۔  
”آپ ایک ایماندار اور اپنے فرض سے لگاؤ  
کے والے انسپکٹر ہیں ورنہ آج کل کے پولیس انسپکٹر  
یہ کہہ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں میں جتنی عزت آپ کی  
رتا ہوں اس سے کہیں زیادہ میرے دل میں آپ کے  
لئے عزت ہے۔ خیر خدا آپ کو کمر و جیل عطا کرے اب  
چے چلنا چاہئے۔۔۔ لیکن کیس کے سلسلے میں آپ سے  
بات ہوتی رہے گی۔“ انسپکٹر سجاد نے کہا۔  
”ارے۔۔۔ رکھیں نا۔۔۔ رات کا کھانا اکتھے  
لیتے۔“

”نہیں۔۔۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ دیے  
آپ نے ہمارے ساتھ اتنا تعاون کیا۔۔۔ بہت  
اور کیس کے سلسلے میں دوبارہ ضرور ملاقات  
سوینکسٹ ٹائم۔“

”کیا ماڈل ہے۔۔۔ سپر ماڈل کم۔۔۔ اور کسی  
(حساس ادارے) کی انسپکٹر زیادہ لگتی ہے  
انھوں اور چہروں کو تو پڑھتے دیکھا تھا۔۔۔ یہ  
اڈل لوگوں کے ذہن بھی پڑھتی ہے۔۔۔ جھینک  
کہیں سچ میں ذہن نہیں پڑھ لیا ورنہ اس

بار تو لائف ٹائم سپیڈ ہو جاتا بہر حال کچھ بھی ہو۔۔۔  
خوب جے کی محفل جب مل بیٹھیں گے دو۔۔۔ ایک  
انسپکٹر دوسری سپر ماڈل۔۔۔ گھر سے باہر گاڑی کے  
قریب تینوں کانٹیل انسپکٹر سجاد کا ویٹ کر رہے تھے  
پھر وہ روانہ ہو گئے۔

”اس کے بعد انسپکٹر سجاد نے کانٹیل راشد  
کو ہدایت دی کہ وہ اپنے ساتھ دو تین کانٹیل اور لے  
کر جائے اور حویلی سے متعلق اور معلومات اکٹھی  
کرے۔ نیز پتا چلائے کہ ملک فہیم انجم کے خاندان میں  
کون کون اب باقی ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ابھی تک  
حویلی کو حاصل کرنے کی جستجو میں ہے۔۔۔ اور یہ تمام  
سازش ان ہی نے کرائی ہو۔۔۔؟“

☆.....☆.....☆  
انسپکٹر سجاد ٹھیک 8 بجے آفس میں موجود تھا۔۔۔  
اس کی شروع سے ہی عادت تھی کہ ٹائم کی پابندی کرتا  
اور وقت سے پہلے آفس پہنچ جاتا۔ ٹیلی فون کی بیل بجی۔  
”ہیلو۔۔۔ انسپکٹر سجاد اسٹیکلنگ۔“

”جی سر میں کانٹیل زیدی بات کر رہا ہوں کل  
شام کو آپ نے جس لڑکی کی تلاش کا کہا تھا اس کا ٹھکانہ  
مل گیا ہے۔ دراصل اسے دوپہر 2 بجے کالج سے چھٹی  
کے بعد گھر آتے ہوئے راستے میں اغوا کر لیا گیا تھا۔  
میں نے پتا چلا لیا ہے ریلوے اسٹیشن کے پرانے سرکاری  
کوآرٹروں میں سے ایک کوآرٹر میں اسے قید کیا ہوا ہے یہ  
کوآرٹر اب ناقابل استعمال ہیں اور کافی سنگت حالات میں  
ہیں۔ حکومت اسے بہت جلد تھام کرنے والی تھی پر کسی  
وجہ سے روک دیا گیا لڑکی کے گھر والوں سے 20 لاکھ کی  
مانگ کی گئی ہے آپ نفری تمبھیں تاکہ ریڈ کی جاسکے  
ویسے زیادہ بندوں کی ضرورت نہیں۔۔۔ تین تین چار ہیں  
مگر لڑکی کی سنگتی زیادہ ضروری ہے۔“

”زیدی its ok تم واپس آ جاؤ۔۔۔ انہیں  
میں اکیلا ہی ہینڈل کر لوں گا اور ایسا سبق سکھاؤں گا کہ  
پھر اس علاقے میں کوئی بھی کسی کو بھی اغوا کرنے سے  
پہلے انسپکٹر سجاد کو یاد کر کے ضرور خود کو کوٹے گا۔“



”لیکن سر آپ کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“  
 ”انکچر سجاد خطروں سے زیادہ خطرناک ہے۔“  
 ”Understand-“  
 ”Yes Sir“

سے بھی نہیں ملے گے۔“ دوسرے گرائڈ مل شخص نے کہا۔  
 ”منے تو ابھی تم دونوں ہو..... افواہ کا تو ڈھنگ  
 سے آتا نہیں اور جلد پولیس اسٹیشن سے چنگا لینے۔“  
 ”میرا نام اسٹیشن چا داس لئے نہیں کہ میں خود  
 کر جھک جاؤں میں تم جیسوں کو اپنے پاؤں میں  
 جھکانے آیا ہوں۔“

”کہا تھا ناں..... میرا نام انسپکٹر سجاد اس لئے نہیں کہ میں خود ڈر کر چمک جاؤں..... میں تم جیسوں کو اپنے پاؤں میں جھکانے آیا ہوں..... نادان تھا جو میری بات نہیں مانا۔ اگر مانی ہوتی تو ابھی زندہ ہوتا۔“ کسی نے پیچھے سے زور سے انسپکٹر سجاد کے سر میں لاشی رسید کی..... لاشی اتنی قوت سے باری کئی تھی کہ وہ سر کے ساتھ ٹکرانے کے بعد ٹوٹ گئی تھی..... انسپکٹر نیچے گرا..... چڑھا اور آخری شخص پیچھے موجود تھا۔

”اب تجھے پتا چلے گا کہ ڈر اور خطرہ کیا ہوتا ہے..... انسپکٹر.....“ جو شخص نے کہا۔

موتی وہ فوراً اپنے ہمراہ دو کاشییل لے کر کئی اسپتال روانہ ہو گیا۔

کئی اسپتال پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ کاشییل راشد واقعی ہی میں شدید زخمی حالت میں تھا بہر حال بروقت علاج معالجہ کی وجہ سے وہ خطرے سے باہر تھا۔

”راشد یہ کیسے ہوا۔“ انجیکٹر سپاہی نے کہا۔

”ان باتوں میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ کوئی ایک ڈیڑھ برس میں کتنی ہی حسین اور جوان لڑکیاں عورتیں، کال گرلز، ماڈلز اور طوائف پر اسرار طور پر غائب، ملاپتہ اور کم ہوتی رہی کچھ کا تو نام و نشان اور سراغ نہیں ملا۔ اور جو بھی اغوا ہوئیں وہ بھی اغوا ہوئیں جب وہ اپنے اپنے کام میں مشغور ہو چکی تھیں اور جو ملی وہ مردہ نہایت بےحالت حالت میں حویلی کے اندر یا باہر۔۔۔ اس کے متعلق طرح طرح کے قصے اور کہانیاں مشہور ہیں۔۔۔ کسی بدروح، چڑیل کا قصہ، بکواس اور من گھڑت ہے۔۔۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس سب کے پیچھے کوئی شیطان مفت فتنہ پس پردہ موجود ہے۔“ انسپکٹر سجاد اپنے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے اپنے سینئر اے ایس پی اسلم یار خان کو کیس کے متعلق بتا رہا تھا۔

”لیکن وہ صرف نہایت حسین، پرکشش و شیرازوں چاہے وہ طوائف ہوں، سپر ماڈل یا لڑکیاں انہیں ہی کیوں اغوا کرتا ہے؟ کیا کوئی خاص بات۔۔۔ ہاں جیسا کہ کوئی خاص بات ہے۔۔۔؟ سمجھے۔ انسپکٹر سجاد۔“ اے ایس پی اسلم یار خان نے کہا۔

”Yes Sir“ انسپکٹر سجاد نے کہا۔  
”اب جاؤ۔۔۔ اور کیس کو حل کر کے ہی مجھے اپنی شکل دکھانا۔۔۔ تمہیں اندازہ ہے۔۔۔ کہ میڈیا والے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں، میں تمہیں تین دن کا ٹائم دے رہا ہوں۔۔۔ اس کے بعد یہ کیس تم سے لے لیا جائے گا۔“ Understand۔

”Yes Sir“ اور انسپکٹر سجاد واپس اپنے آفس آ گیا۔

ایک بار پھر انسپکٹر کے موبائل کی بیل بجی۔  
”ہیلو۔۔۔ انسپکٹر سجاد اسپیکنگ۔“

”کیسے ہو دوست۔۔۔؟ یہ آواز تو سنی ہی ہوگی۔“

انسپکٹر سجاد کے چہرے پر مسکراہٹ قس کرنے لگی۔  
”میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اپنی سٹا میرے

یار۔۔۔ کیسا ہے۔۔۔ یار طاہر آج کل تیری بڑی یاد آتی ہے پہلے تو تمام کیسز حل کر کے حل کرتے تھے پر اب۔۔۔“ انسپکٹر سجاد نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”It's ok“ تمہیں ہوتا تو چل چکا ہوگا کہ میرا سفر دوبارہ تمہارے قہارے ہو گیا ہے۔۔۔ میں راستے میں ہوں۔۔۔ بس پہنچ گیا۔۔۔ ویسے پہنچنا تو مجھے صبح 9 بجے تھا لیکن لیٹ آنا اور صبح آنا میری فطرت میں ہے۔“ طاہر نے کہا۔

ابھی وہ دونوں موبائل پر باتیں کر رہے تھے کہ اے ایس پی آئی طاہر انسپکٹر سجاد کے آفس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ انسپکٹر سجاد کو کسی اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا۔۔۔ وہ بھی پلٹا۔۔۔ اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے یہ دونوں ایک انسپکٹر اور دوسرا اے ایس پی آئی ہونے کے علاوہ بچپن کے دوست تھے دونوں کی دوستی بہت گہری تھی۔

اس کے بعد انسپکٹر سجاد نے اے ایس پی آئی طاہر کو حسین لڑکیوں کے قتل کے متعلق بتایا۔۔۔ اور کاشمیل راشد کے زخمی ہونے کے متعلق۔۔۔ اور یہ بھی بتایا کہ معلومات کے مطابق اب ملک فہیم انجم کے خاندان کا کوئی فرد اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اے ایس پی آئی طاہر اور انسپکٹر سجاد دونوں اس بات اکتفا نہیں کر رہے تھے اب بقول ان دونوں کہ وہ اکیلے پوری فوج کے برابر ہیں۔۔۔ کیونکہ جب وہ دونوں ایک ہو کر کام کرتے تو پھر۔۔۔ سفید دودھ سے سفید بال تک نکال لیتے۔۔۔ وہ دونوں دوستوں کی طرح رچے تھے کبھی ایک دوسرے کو سینئر، جو نیئر ہونے کا احساس نہیں دلاتے۔

رات کو اے ایس پی آئی طاہر اور انسپکٹر سجاد جیو اور ٹی شرٹ میں ملبوس جنگلاتی علاقے کی طرف بلیک پاراڈو میں رواں دواں تھے بلیک پاراڈو جس سڑک پر چیری سے دوڑ رہی تھی وہ آگے جا کر تین حصوں میں تقسیم ہو کر سامنے تاریک جنگل کے سینے میں پیوست ہو رہی تھی۔ چار سو سمیر سنائے کا راج تھا۔ مگر جوں جوں پاراڈو جنگل کی طرف بڑھ رہی تھی اس کی تیز

رفتاری کی وجہ سے ایک زمانے دار آواز رفتہ رفتہ جنگل کی خاموشی میں مل چل پیدا کر رہی تھی۔ جنگل میں سے ایک کچا راستہ اس قاتلہ حویلی تک جاتا تھا جس پر بے با آسانی گاڑی جا سکتی تھی طاہر نے گاڑی سیدھی حویلی کے سامنے کھڑی کی اور پھر وہ دونوں باہر آ گئے۔

دونوں کے ہاتھوں میں ریو اور موجود تھے اور وہ آہستہ آہستہ حویلی کے صدر دروازے کی جانب بڑھے دونوں نے ایک ایک ہاتھ سے صدر دروازے کا ایک ایک پٹ کھولا اور اندر داخل ہو گئے ہر سوراخ کی کاراج تھا۔ مگر چاند کی ہلکی چاندنی میں توڑا بہت دکھائی دے رہا تھا وہ صحن سے گزر کر کمروں کی ایک لمبی قطار کے سامنے کھڑے تھے۔ درمیان میں راستہ تھا اور دونوں طرف کمرے تھے صحن راستے کے درمیان میں انہوں نے ایک چھوٹی سی چنگاری دیکھی وہ دونوں تیزی سے چنگاری کی جانب بڑھے۔۔۔ جب پاس جا کر دیکھا تو وہ ایک سلاک ہوا سگریٹ تھا۔ جس میں ابھی توڑی چنگاری باقی تھی وہ دونوں الٹ ہو گئے۔ سگریٹ اپورٹڈ براڈ انٹر میٹل اسوکنگ ون کلاس کا تھا۔ سگریٹ آسنے سامنے دو کمروں کے درمیان گرا ہوا تھا وہ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے کیونکہ سگریٹ اس کمرے کے زیادہ نزدیک تھا مگر اندر سوائے تھا تاریک کے کچھ نہ تھا انہوں نے ٹارچ سے جائزہ لیا اور فوراً سامنے کے کمرے میں داخل ہوئے اس کمرے میں بھی کچھ نہ تھا پھر انہوں نے تیزی سے تمام کمرے چیک کئے۔ مگر کوئی سوراخ نہ ملا۔

”پھر یہ سگریٹ۔۔۔ آخر کوئی تو یہاں آیا تھا۔“ انسپکٹر سجاد نے اے ایس پی آئی طاہر سے کہا۔  
ابھی وہ واپس پلٹے ہی تھے کہ حویلی سے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر واپس راوند ہوئیں کہ۔۔۔ پیچھے سے۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ کی آوازیں آنے لگی۔۔۔ اور یہ آوازیں صحن اسی کمرے سے آ رہی تھیں جس کے باہر سگریٹ پڑا ہوا تھا وہ دونوں ایک لمحے میں پلٹے

اور ریو اور سیدھے کمرے کے دروازے پر تان کر کمرے کی جانب بڑھے اس سے پہلے کہ وہ کمرے کے دروازے کے قریب پہنچے۔۔۔ دروازہ ٹوٹ کر سامنے کے کمرے کے دروازے سے جاگ۔۔۔ کسی نے اندر سے زوردار رات رسید کی۔

”او۔۔۔ میرے۔۔۔ خدایا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا۔۔۔ اتنی حسین۔۔۔ اور اتنی بھیاں۔۔۔ اے ایس پی آئی طاہر نے انسپکٹر سجاد سے کہا۔

”اپنے حواس پر قابو پاؤ۔۔۔ یہ معمولی لڑکی نہیں ہے۔ اسی نے کاشمیل راشد کو شدید زخمی کر دیا تھا۔۔۔ میں نے تمہیں ان دونوں کے بارے میں بتایا تھا۔۔۔ یہ بہت طاقت ور ہے۔“ انسپکٹر سجاد نے اے ایس پی آئی طاہر سے کہا۔

لڑکی بھیاں تک حالت میں کی بھیاں تک قاتل سے کم دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے منہ سے سرخ جھاگ نما خون ٹپک رہا تھا۔ کپڑے چند ایک جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور وہاں زخم تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ ہاتھوں کے ناخن لمبے نوکیلے ہو چکے تھے۔ بال کھڑے ہوئے۔ مگر ان سب کے باوجود۔۔۔ وہ بلا کی حسین تھی۔۔۔ نہایت ہی حسین و شیرازہ۔ اب دونوں اسے اور وہ ان دونوں کو گھور رہی تھی۔ جیسے حملے کے لئے خود کو تیار کر رہی ہو۔

”لڑکی خرائی۔۔۔ اور تیزی سے دوڑی۔۔۔ طاہر نے گولی چلا دی۔۔۔ گولی سیدھی اس کے سر میں لگی۔ لڑکی ہوا میں اچھل اور زمین پر گری۔۔۔ مگر اس کی غراہٹ قائم تھی۔۔۔ اور وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اٹھتی۔۔۔ انسپکٹر سجاد نے پہلے ایک سر میں اور پھر دوسری اس کے دل کے مقام پر ماری۔۔۔ اب وہ وہاں بے حس و حرکت پڑی تھی۔۔۔ انہوں نے گاڑی سے کچھ چھوٹے پلاسٹک کورنگلے اور انہیں پھاڑ کر لڑکی کو ان میں لپیٹ دیا۔۔۔ اور پھر گاڑی تھانے کی طرف رواں کر دی۔ تھانے پہنچنے کے بعد لڑکی کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا گیا اب

انتظار پوسٹ مارٹم رپورٹ کا تھا جو کہ صبح آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

انسپیکٹر سجاد اپنے آفس میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے ٹیبل پر اس بھیاں تک قاتل صف خونی آدم خور کی پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑی تھی۔ اور سامنے کی کرسی پر اے ایس آئی طاہر بیٹھا پوسٹ مارٹم فائل کو تک رہا تھا۔

”یار رکھو ایس رپورٹ کی فائل کو۔“ اے ایس آئی طاہر نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ چلو کھولتے ہیں۔۔۔۔۔ آخر چیک تو کریں کہ۔۔۔۔۔ وہ لڑکی اتنی خونخوار کیسے اور کیوں ہو گئی۔۔۔۔۔؟“ انسپیکٹر سجاد نے کہا۔ انسپیکٹر سجاد نے رپورٹ کی فائل کھولی اور پھر دونوں اسے پڑھنے لگے۔

”Zombies۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔ ایسی بیماری ہے جو کتوں کے کاٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر انسان کی سوچنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر اسے کچھ یاد رہتا ہے۔۔۔۔۔ تو وہ صرف۔۔۔۔۔ خون گوشت دوسروں کو کاٹتا۔۔۔۔۔ انہیں اپنا شکار بناتا۔ یہ کتے کے کاٹنے کے بعد بروقت طبی علاج نہ کروانے کی وجہ سے جنم لیتی ہے اور اس سے پہلے جتنی اموات ہوئی تھیں جن کی لاشیں حویلی کے اندر یا باہر سے ملی ان پر موجود نشان اسی لڑکی کے ہاتھوں اور دونوں کے تھے۔۔۔۔۔ حتیٰ کہ اسی نے دنیا بآب کا قتل بھی کیا تھا۔ یہ بائیں اس پوسٹ مارٹم رپورٹ سے صاف ظاہر ہیں۔“ انسپیکٹر سجاد نے اے ایس آئی طاہر سے کہا۔

”گروہ جو شام شروع۔۔۔۔۔ ارے ہمیں کیا۔۔۔۔۔ کیس حل ہو گیا۔۔۔۔۔ اب اس حویلی میں کوئی لاش کوئی موت نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ چلو آؤ۔۔۔۔۔ اے ایس آئی صاحب کو بتاتے ہیں“ طاہر نے سجاد کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

اے ایس آئی اسلم یار خان نے دونوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے گریڈ بڑھانے کے لئے اپنے

سینئرز سے بات کرنے کے لئے میٹنگ کا انتظام کیا لیکن اس سے پہلے اے ایس آئی نے میڈیا کو بلوایا اور کیس کے متعلق انفارمیشن دی۔

اس بات کا علم تھا کبھی ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ سو اس نے انسپیکٹر سجاد کو کال کی۔۔۔۔۔ وہ اس کی بے حد شکر گزار رہی تھی جبکہ انسپیکٹر سجاد کا کہنا تھا کہ اس نے تو بس اپنا فرض نبھایا ہے مگر نشانے اس کو ہر صورت رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ جس کے لئے انسپیکٹر سجاد کا ذکر نہ کر سکا۔

انسپیکٹر سجاد دس بجے نشانے گھر موجود تھا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اتنی بڑی عظیم شہرت کی مالک سپر ماڈل آج رات دس بجے کچن میں موجود خود کھانا تیار کر رہی تھی۔ اور اس نے تمام لوگوں کو شام سے ہی چھٹی دے دی تھی۔ یہاں تک کہ۔۔۔۔۔ مین گیٹ کھولا۔۔۔۔۔ تو صحن کے سر اے کو دیکھ کر انسپیکٹر سجاد کی جودت جواب دے گئی تھی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا گاڑی سے نکلنے کے بعد سری جیلو۔۔۔۔۔ ہائے کے بعد وہ اسے گھر کے اندر لے گئی۔ گاڑی سے نکلنے کے بعد گھر کے اندر داخل ہونے تک اس مخصوص مختصر راستے کو کافی محنت سے آراستہ کیا گیا تھا اور کمرے کی آرائشی کا جواب نہیں تھا۔

”مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ آپ جیسی عظیم شہرت یافتہ سپر ماڈل نے ایک انسپیکٹر کے لئے آج خود اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا ہے۔۔۔۔۔ تکلف کیا آپ نے۔۔۔۔۔ آپ اتنی آزاد طبع ہیں پھر بھی۔۔۔۔۔ اتنا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔۔ کسی ذکر سے کہہ دیا ہوتا۔“ انسپیکٹر سجاد نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد ٹیبل پر پڑے قیمتی برتنوں میں موجود کھانے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”آپ ایک آزاد شخص ہیں اور ویسے بھی جیسا کہ آپ نے ہمارے لئے کیا ہے اس کا اشارہ اس کی آثار حنا ویدکی جانب تھا اتنا تو بنتا ہے اور ویسے بھی بچی بات تو یہ ہے کہ مجھے آپ سے بات کرنے کا دل کر رہا تھا۔۔۔۔۔ بس ایسے ہی۔“ نشانے نے کہا۔

کھانے کے دوران خاموشی رہی۔ لیکن

پھر بھی کبھی کبھی وہ کرسی سے اٹھ کر ڈیش بڑھے کر دیتی۔ ”یہ چیک کر لیں۔۔۔۔۔ ہاں یہ بھی کھالیں۔۔۔۔۔ میں نے خاص آپ کے لئے بنائی ہے۔“ اور انسپیکٹر سجاد حیرانی اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس حسین پاکرہ کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا کہ۔۔۔۔۔ سجاد۔۔۔۔۔ اتنی عزت تو کبھی۔۔۔۔۔ اپنے گھروالوں نے نہیں دی تھی مجھے کے سینئرز نے بھی اور یہ اتنی خوب صورت لڑکی مجھے چلوں پر بیٹھا رہی ہے۔۔۔۔۔ اصل میں سجاد کو بھی زندگی میں اتنی ہی خوبصورت اور ڈیزائن لڑکی کی تلاش تھی جواس کی زندگی میں آئے اور پھر اس کی زندگی میں کسی سوئیٹ کی طرح ہو جائے کیونکہ اب وہ بھی اس دنیا میں نشا کی طرح اکیلا ہی تھا اب وہ چاہتا تھا کہ اسے اپنی زندگی میں شامل کر لے۔ کیونکہ یہ قدرت کا قانون ہے کہ کوئی انسان ساری زندگی اکیلا نہیں رہ سکتا اسے ہر لمحے ہر بل کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی زندگی میں رنگ بھروے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ باہر لان میں بیٹھے تھے۔۔۔۔۔ اور حویلی کے متعلق بات ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ انسپیکٹر سجاد بتا رہا تھا کہ اس نے کس طرح اس آدم خور کا خاتمہ کیا۔۔۔۔۔ اور وہ جنگلی باندھے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کئے اس کی آواز کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک انسپیکٹر سجاد نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

”نشانی کدھر گم ہیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں میں تو بس غور سے آپ کی باتیں سن رہی ہوں۔۔۔۔۔ اصل میں جب کسی کو اس جیسا کوئی دوست مل جائے نا جو اسے کچھ سکے تو پھر دوست بنی کہتا ہے۔۔۔۔۔ اوئے کدھر گم ہو۔۔۔۔۔ مجھے کھور کھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔۔۔۔۔ میں اصل میں اتنی بھیڑ کے ہوتے ہوئے بھی تجلیہ کی شکار تھی۔۔۔۔۔ شو بڑ کی دنیا میں ہر کوئی بس اپنے فائدے کی خاطر دوسروں سے تعلقات رکھتا اور بناؤنی مسکرانہ۔۔۔۔۔ بس یہ معمول ہے اور جب سے آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔۔۔۔۔ میں اندر

سے جاگ گئی ہوں۔۔۔۔۔ سب کچھ۔۔۔۔۔ سب کچھ اچھا سا لگنے لگا ہے۔“ نشانے نے کہا۔

”میں بھی تو یہی چاہتا ہوں نا۔۔۔۔۔ کہ ہم دونوں اس تفاوت کو مٹا دیں۔“

”کیا۔۔۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ایسے ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ میں ایسا ویسا تھوڑی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔۔۔۔۔ پلیز ذرا کھل کر کہو نا۔۔۔۔۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔ اس لئے کہا۔۔۔۔۔ ذرا پھر سے کہو۔۔۔۔۔ اب وہ کرسی پر سے اٹھی اور انسپیکٹر سجاد کی کرسی کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔“

”وہ۔۔۔۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ انسپیکٹر صاحب پولیس۔“

”وہ۔۔۔۔۔ یہ کہہ جا آپ نے کھانا بنایا تھا۔۔۔۔۔ وہ بہت لذیذ تھا۔“

”وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔۔۔۔۔ پلیز آپ وہ پولیس نا۔۔۔۔۔ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کہہ رہے تھے وہ کیا تفاوت؟“

انسپیکٹر مکمل طور پر ڈرا ہوا تھا وہ بھی صرف ایک لڑکی سے جو کبھی اکیلا دشمنوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتے تھا۔۔۔۔۔ آج ایک لڑکی کے سامنے خود کو اتنا بے بس محسوس کر رہا تھا۔

”اصل میں بات یہ ہے۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ کہ میں نے کبھی کسی لڑکی کو دوست بنایا ہی نہیں۔۔۔۔۔ کاش آپ یہاں ہم دونوں کے ساتھ ایک تیسرا ہوتا۔۔۔۔۔ تو وہ ضرور میری بات آپ کو سمجھا پاتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ تیسرا کون۔۔۔۔۔؟“

”ارے۔۔۔۔۔ تیسرا میرا بچپن کا دوست اے ایس آئی طاہر اور کون۔۔۔۔۔؟“

”اچھا۔۔۔۔۔ جو بات آپ مجھے سمجھا رہے ہیں وہ آپ کی طرف سے آپ کا دوست مجھے سمجھتا۔۔۔۔۔“



بدھو۔“

”کیوں تا میں ایسا کروں..... کہ سیدھی اے  
ایس آئی طاہر کے پاس چلی جاؤں..... وہ آپ سے  
بہتر سمجھا سکتا ہے..... کیونکہ وہ پارٹ ٹائم میٹھیٹک کا  
ٹیچر ہے..... اور لگتا ہے..... آپ کو میٹھیٹک آتا ہی  
نہیں ہے۔“

”ارے..... نہیں..... نہیں..... ایسا کچھ نہیں ہے  
میٹھیٹک کہاں سے ہم دونوں کے بیچ میں آ گیا۔“  
”یہی تو میں کہہ رہی ہوں..... کہ اس وقت ہم  
دونوں کے بیچ میں طاہر کہاں سے آ گیا۔“

”لگتا ہے آپ سے کچھ نہیں ہوگا..... میں اپنے  
کمرے میں جا رہی ہوں.....“ وہ تیزی سے اٹھی اور  
اپنے کمرے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔  
کمرے میں پہنچ کر وہ بیڈ کے قریب کھڑی تھی  
..... کہ اسے احساس ہوا انیکٹر سجاد اس کے پیچھے ہی کھڑا  
ہے۔

وہ چلتی..... وہ واقعی وہیں موجود تھا۔  
”میرے ساتھ بھی پہلے ایسا نہیں ہوا.....  
بہر حال اب بتائی دیتا ہوں..... ہمیں یہ فاصلے اب مٹا  
دینا چاہئے.....“ اور پھر اس نے جھٹ سے اس کے  
ہونٹوں پر ایک بوسہ دے دیا۔

”میں بھی تو یہی چاہتی ہوں..... ناں.....  
“ جواب میں اس نے بھی اسے ایک بوسہ دے دیا۔  
انیکٹر سجاد تھوڑا آگے بڑھا اور نشانے اسے کار سے  
پکڑ کر..... خود کو بیڈ پر گرالیا۔ اور وہ دونوں گناہوں کی  
دلدل میں دھستے چلے گئے۔

صبح کھڑکی سے آنے والی سورج کی روشنی کی وجہ  
سے نشا جاگ اٹھی اس نے سجاد کی جانب دیکھا وہ بھی  
بیدار ہو چکا تھا دونوں فریٹش ہوئے اور اس کے بعد  
ناشہ کیا اور ساتھ ہی دونوں خاموشی سے ایک دوسرے  
کو دیکھ رہے تھے کہ جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

”نشا رات کو جو کچھ بھی ہوا میں نے جان بوجھ  
کر نہیں کیا..... بس ہو گیا۔“ انیکٹر سجاد نے سب کے

جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”Its ok۔ اس میں میرا بھی برابر کا قصور ہے  
جو کچھ ہوا ہم دونوں کی مرضی سے ہوا۔“ نشانے بریڈ  
پر جام لگاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں شادی کر لینی چاہئیں کیونکہ یہی  
دستور العمل ہے۔“ سجاد نے کہا۔

”میں بھی تو یہی چاہتی ہوں..... اور وہی بھی  
اس نشا سے تھک چکی ہوں..... میرا اصل نام حنا شہریار  
ہے اور اب مجھے حنا سجاد بننا ہے۔ تم مجھے نام دو گے  
نا..... میں اب شو بیز کی دنیا کو خیر باد کہنا چاہتی ہوں۔“

”میں تو تمہیں اپنا چکا ہوں..... بس اب صرف  
دنیا والوں کو بتانا ہے۔“ سجاد نے کہا۔

اس کے بعد وہ آفس روانہ ہو گیا جہاں پر پہلے  
سے ہی اس کا جگری دوست اے ایس آئی طاہر  
انتظار میں تھا۔

”یار میں تیرا کب سے انتظار کر رہا ہوں۔“ سجاد  
کے آفس پہنچتے ہی طاہر نے کہا۔

”یار ٹائم پر پہنچ گیا ہوں..... آج تم اتنی جلدی  
کیسے.....؟“

”یاد ہے تمہیں وہ دن..... جب ہم کوئی کیسی حل  
کرتے تو اس کے بعد..... پھر کہاں جاتے تھے.....

وہیں..... یار..... مزہ آئے گا..... شباب..... تاج  
گانا۔“

”نہیں یار اب نہیں..... ارے چلو نا.....“  
اور پھر..... دونوں روانہ ہو گئے۔

وہ دونوں جان بانو کے ہاں موجود تھے بانو  
مشہور طوائف حسن کا اعلیٰ شاہکار 23-24 سالہ چلتی  
بھرتی حسن کی دیوی ان سے مخاطب تھی۔

”20 سال کی تھی نا چنانچہ شروع کیا تھا..... تب تم  
لوگ اکثر آیا جایا کرتے تھے..... میں بھی تب ہی تھی  
..... مگر اب میری شہرت دور دور تک ہے..... مگر میں تم  
دونوں کو بھولی نہیں۔“ جان بانو نے آداب کے بعد  
عرض کیا۔

”بس کچھ معروفیات تمہیں اس لئے تقریر یا تین  
چار سالوں بعد حاضر ہوئے ہیں سوچا آج ذرا بانو کے  
جلوے ہی دیکھ لیں۔“ طاہر نے مسکراتے ہوئے  
آنکھوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”آج کل آپ دونوں کی اخباروں میں بڑی  
چرچہ ہو رہی ہے..... سنا ہے کوئی اہم کیس حل کیا ہے۔“  
”ہاں.....“ کافی اہم تھا اور تم تو جانتی ہو کہ ہم  
پرانے شکاری ہیں۔“

”اس دوران میری بھی کچھ دوست غائب  
ہوئیں اور کچھ پتا نہ چلا۔“ اس نے سگریٹ سلگاتے  
ہوئے کہا۔

”وہ انسانوں کا شکاری تھا..... حسین اور بے حد  
پرشش نوجوان اور نازک اندام دوشیزاؤں  
کا.....“ بانو نے سگریٹ کا ایک اور کش لیا اور اس کے  
بل کھاتے نیلگوں دھوئیں کوند سے خارج کرتے  
ہوئے کہا۔

”ذرا کھل کر بتاؤ..... کون سا شکاری.....“  
”ہم بھی دیکھیں کہ زیادہ بڑا شکاری وہ تھا یا ہم  
ہیں.....؟“

”جس حویلی میں تم لوگوں نے آپریشن کیا ہے  
کسی زمانے میں اس حویلی کے مالک شہریار کی دشمنی  
فہیم انجم سے تھی ان دونوں کے مرنے کے بعد شہریار کی  
بہن نشا تو شہر جا کر سپر ماڈل بن گئی..... اور اس دوران  
ملک فہیم انجم کا ایک بیٹا سہیل انجم لندن سے سائنس بن  
کر لوٹا میڈیکل کے شعبہ سے اس کا تعلق تھا وہ اکثر  
یہاں آیا کرتا تھا..... اور گاؤں والی حویلی میں جس میں  
وہ مقیم تھا جو اس کے باپ کی تھی..... لڑکیاں منگواتا  
تھا..... وہ تاج گانے کا بڑا شوقین تھا..... لیکن رفتہ رفتہ  
وہ پاگل ہو گیا..... یہاں سے جو لڑکیاں اس کے پاس  
جانی وہ واپس نہ آتی..... اور کچھ دنوں بعد ان کی  
لاشیں اسی بھیا تک حویلی کے باہر ملتی..... جب اس  
سے پوچھا جاتا تو وہ کہتا کہ لڑکیاں تو یہاں آتی ہی  
نہیں..... آس پاس کے لوگوں نے کہا..... کہ یہ لڑکا

پاگل ہو چکا ہے..... دراصل اس نے لڑکیوں پر تجربے  
شروع کر دیئے تھے..... گاؤں والوں نے پولیس میں  
رپورٹ درج کرا دی..... لیکن وہ اچانک کہیں غائب  
ہو گیا..... اس کا کچھ پتا نہ چلا..... سگریٹ وہ بھی یہی  
انٹرنیشنل اسموگ کلاس ون پیتا تھا تم لوگوں نے جو کسی  
حل کیا ہے وہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے..... بس آپ  
لوگوں کو دیکھ کر یاد آ گیا۔“

”او..... شٹ.....“ انیکٹر سجاد نے کہا۔  
”کیا ہوا.....“ طاہر بولا۔

”وہ زندہ ہے..... کیس ابھی حل نہیں ہوا.....  
تمہیں یاد ہے ہم نے جو حویلی میں سلگتا سگریٹ  
دیکھا تھا وہ کس پگنی کا تھا.....“ سجاد نے کہا۔

”انٹرنیشنل اسموگ کلاس ون.....“ طاہر چلایا۔  
”ہیں جلد از جلد اسلحہ لے کر نگرے کے ساتھ  
حویلی ریٹ کرنا ہوگا..... وہاں پر ضرور کوئی خفیہ تہ خانہ  
ہے۔“

”شکر ہے جان بانو یہ لو.....“ طاہر نے اس کے  
ہاتھ میں پیسوں کی ایک گڈی دی اور وہ دونوں وہاں  
سے جلدی نکل گئے۔

☆.....☆.....☆  
وہ دونوں حویلی کے اندر داخل ہو رہے تھے.....  
”چلو جلدی اس کمرے کی جانب..... جہاں وہ لڑکی  
دیکھی تھی..... ضرور وہاں کوئی سراغ  
ہوگا.....“ انیکٹر سجاد نے اے ایس آئی طاہر سے کہا  
اور اس نے اپنے پیچھے موجود ہیں کا ٹھیکس لے لیا۔  
اے ایس آئی طاہر کی ہدایت پر ایک کانشیل  
نے لات مار کر کمرے کا دروازہ توڑ ڈالا.....  
اندر اندر داخل ہوا تھا..... کانشیل اندر داخل ہوا..... ابھی وہ  
اندر داخل ہوا ہی تھا کہ اچانک وہ اندر سے اڑتا ہوا  
سانے کی دیوار پر جا لگا اس کا رخا کٹ چکا تھا..... گلے  
سے گرم گرم سرخ خون تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا.....  
ساتھ ہی اندر سے ایک حسین خونی دوشیزہ نے جھلا تک  
لگا کر دوبارہ کانشیل پر حملہ کرنا چاہا..... جیسے ہی اس نے

چلا تک لگائی..... کھلے ہوئے منہ اور کانٹیل پر مگر نے ہی والی تھی کہ اے ایس آئی طاہر نے فوراً گولی چلا دی..... گولی سیدھی اس کے منہ میں لگی..... اور دوسری جانب سے باہر نکل گئی..... وہ وہی ڈھیر ہو گئی..... کمرے کے اندر فرش سے زمین ایک جگہ سے سرکی..... اور وہاں سے ایک اور لڑکی باہر لگی جو نہایت غضب ناک آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی..... وہ ان کی جانب بھاگی اور انسپکٹر سجاد کے پاس کھڑے کانٹیل نے ایک اور فائر کیا اور وہ بھی وہی ڈھیر ہو گئی..... پھر اس تہہ خانے سے کوئی باہر نہ آیا تو انسپکٹر سجاد کی ہدایت پر تمام کانٹیل جو تہہ خانے کے اندر داخل ہو گئے.....

آگے سے ان پر پانچ آدم خور آدمیوں نے حملہ کر دیا وہ بہت طاقت ور تھے..... ان آدمیوں کی حالت بھی لڑکیوں جیسی ہی تھی..... کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور وہاں زخم تھے..... جن سے خون برس رہا تھا..... منہ سے سرخ رنگ کی جھاگ نکل رہی تھی لیکن وہ طاقت میں لڑکیوں سے زیادہ طاقتور تھے..... دیکھتے ہی انہوں نے پولیس کانٹیل پر حملہ کر دیا..... چشم زدن میں پانچ پولیس کانٹیل کے گلے چرے جھاڑ ڈالے..... وہ وہی ٹوپ کرٹھنڈے ہو گئے..... باقیوں نے اپنے اسلحہ کے منہ کھول دیئے..... پانچوں کو گولیوں سے چھلٹی کر دیا اور آگے بڑھے..... آگے ایک کمرہ تھا..... جو خالی تھا اور اندر سفید بلب روشن تھا آگے جانے کا راستہ بھی وہی سے تھا..... باقی کانٹیل نے پہلے چیک کیا اور پھر اندر داخل ہو گئے..... کمرے میں چھ کمرہ آگے بڑھنے ہی والے تھے..... کہ بلب بندھ ہو گیا..... اور اندر عجیب قسم کی گیس خارج ہونے لگی..... وہ کمرے کے دروازے کی طرف بھاگے مگر دروازہ بند ہو چکا تھا ان کے لئے سانس لینا مشکل ہوتا جا رہا تھا..... انہوں نے دروازہ توڑنے کے لئے فائر کئے مگر وہ بولٹ پروف تھا گیس اتنی زہریلی تھی کہ کانٹیل کے جسم کا ماس گلنے لگا..... اور انہوں نے دیں

ٹوپ ٹوپ کر جان دے دی.....

اے ایس آئی طاہر اور انسپکٹر سجاد حویلی کے باقی کے کمرے چیک کر رہے تھے..... کہ سجاد نے طاہر سے کہا..... کہ وہ نیچے تہہ خانے میں جائے اور وہ اکیلا باقی کا ایریا چیک کر کے آتا ہے..... کہ ہمیں کوئی خونی آدم خور صفت درندہ حویلی سے باہر نہ چلا جائے.....

اے ایس آئی طاہر تہہ خانے میں داخل ہو کر آگے بڑھ رہا تھا..... آگے میڈیکل لیب تھی..... وہ اندر داخل ہو گیا..... سامنے ایک کرسی پر حنا شہریار رسیوں سے بندھی تھی طاہر کرسی کی طرف بڑھا آگے پیچھے کوئی نہ تھا حنا کے منہ پر ٹیپ چپکادی تھی وہ رسیاں کھول رہا تھا کہ حنا..... او..... ہوں.....

..... وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہی تھی..... طاہر نے اس کے منہ پر سے ٹیپ اتارنے ہی لگا تھا..... کہ..... کسی نے پیچھے سے زوردار لوہے کی راڈ طاہر کے سر کے پچھلے حصے پر دے ماری..... اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا.....

”غلط بندے سے پنکالے لیا..... عبرت ناک موت دوں گا..... تم دونوں کو..... اور تمہارا تیسرا ساتھی وہ انسپکٹر ابھی تک تو ہمیں ہموں ہو چکا ہوگا..... میں نے اس کی طرف اپنے دو بہترین زہریلے جانور بھیجے ہیں وہ ابھی واپس آ رہے ہوں گے پھر تم لوگ بھی اسی کے پاس پہنچ جاؤ گے..... اچھے خاصے دونوں پولیس میں ہو..... عیاشی کرتے..... اور تم سپر ماڈل ہو..... اس پرانی بوسیدہ حویلی کو کیا کرنا تھا تمہیں..... مجھے زہریلی سانس سے پیار ہے..... عشق ہے..... لوگوں پر تجربے کر کے ان میں سانپوں، کتوں..... اور طرح طرح کے زہریلے جانوروں کی خصوصیات پیدا کرنے اور پھر انہیں اپنے کنٹرول میں رکھنے میں مزہ آتا ہے..... سکون ملتا ہے..... مجھے..... اور تم تینوں مل کر میرا سکون چھیننا چاہتے ہو؟“ سنیل نے کہا.....

”تم جو کرتے رہے ہو اور کر رہے ہو..... اس کی تمہیں سزا ضرور ملے گی..... تم انسانیت کے خلاف

ہو..... تم قدرت کے خلاف کام کر رہے ہو..... اس لئے تم غرق ہو جاؤ گے..... بہتر یہی ہے کہ سرخڑ کر دو..... اور ہمیں کھول دو..... کیونکہ تمہارا پچنا مشکل ہے..... اور نامکون بھی..... کیونکہ وہ بہت جلد تمہیں مار دے گا..... وہ آ رہا ہے..... تمہاری موت رسیوں سے بندھے ہوئے طاہر نے کہا.....

”ہا ہا ہا..... کون آئے گا..... کیسے آئے گا..... کہاں سے آئے گا..... کب آئے گا..... بلاؤں اے.....“ سنیل نے غصے سے غراتے ہوئے کہا.....

”وہ کوئی ٹرین یا بس نہیں جس کے آنے کا نام ہو.....“

”طوفان بلائے پر نہیں آتا..... اپنی مرضی سے آتا ہے اور تباہی مچاتا ہے..... تو اس کے قہر سے بچ نہیں پائے گا آ رہی ہے تیری موت..... میری بات مانو اور سرخڑ کر دو..... کیونکہ جب تم جیسوں کی موت آتی ہے تو وہی آتا ہے.....“ طاہر نے کہا.....

”کون آتا ہے.....؟ جلدی نام بتاؤں ورنہ میں اپنے کتوں کے آنے سے پہلے ہی تمہیں اردوں گا.....“ سنیل انہم نے کہا.....

”انسپکٹر سجاد میرا دوست..... وہ خطروں سے بھی زیادہ خطرناک ہے..... آ رہا ہے تمہاری موت.....“

”لیکن اس وقت تم میرے قبضے میں ہو..... اور یہ میرا پیرا ہے.....“ سنیل انہم نے نوک دار پتلی لوہے کی راڈ اٹھائی اور بھاگ کر طاہر کی جانب بڑھا..... وہ اسے طاہر کے پیٹ میں گھونپنے ہی والا تھا کہ..... کہ عین نام پر کسی نے ریو اور کابئن دیا یا گولی سنیل انہم کے بازو پر لگی اس کے ہاتھ سے لوہے کی راڈ جو بالکل طاہر کے پیٹ کے قریب تھی اس کے پاؤں میں گر گئی.....

”ایریا کتوں کا ہوتا ہے..... شیروں کا نہیں..... شیر اپنی مرضی سے آتا ہے اور تباہی مچاتا ہے.....“ سنیل انہم نے گولی چلانے والے کی جانب دیکھا..... تو اس پر ریو اور تانے انسپکٹر سجاد کھڑا تھا..... اس کے ایک بازو پر گولی لگ چکی تھی..... وہ آدھا ناکارہ ہو چکا تھا.....

انسپکٹر سجاد نے اسے گرفتار کر لیا..... پھر اے ایس آئی طاہر اور حنا شہریار کو رسیوں سے آزاد کیا..... اور تھانے روانہ ہو گئے..... تعینات کرنے پر پتا چلا کہ سنیل انہم احساس کمتری، پاگل پن کا شکار تھا میڈیکل سائنس دان بننے سے پہلے اس کا کسی لڑکی سے چکر تھا..... لیکن اس نے کسی اور سے شادی کر لی.....

سنیل انہم نے غصے میں آ کر اسے اور اس کے شوہر دونوں کو شادی کی پہلی رات ہی قتل کر ڈالا..... وہ اس لڑکی کے حادثے کی وجہ سے شروع میں بہت زیادہ اپ سیٹ رہنے لگا..... اور رفتہ رفتہ اس نے وہ حادثہ اپنے دل پر لے لیا..... پھر جب وہ مکمل سائنس دان بن گیا تو اسے ہر خوب صورت ترین لڑکی میں اپنی دھوکے باز محبوبہ دیکھتی اور وہ اسے اغوا کر لیتا..... اسے اپنا غلام بنالیتا..... کہ کہیں یہ لڑکی بھی اس کی محبوبہ کی طرح کسی کو دھوکہ نہ دے..... وہ واقعہ اس کے دماغ پر مسلط ہو چکا تھا..... اور مزید تعینات کرنے پر پتا چلا کہ جس لڑکی کو یہ اپنی محبوبہ کہتا تھا..... اور بعد میں اس کا قتل کر ڈالا..... دراصل وہ اس سے محبت کرتی ہی نہیں تھی وہ جس سے پیار کرتی تھی اس نے اسی سے شادی کر لی..... سنیل انہم زبردستی اس پر اپنا حق جتانا رہتا تھا..... دراصل اسے شروع سے ہی انسانی میڈیکل سائنس سے گہری دلچسپی تھی اسے جنون کی حد تک شوق تھا..... اور اس جنون کو حالات نے پاگل پن سے بھی آگے پہنچا دیا..... اور آخر کار اسے موت کی سزا سنائی گئی.....

”کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب ان کے پاس تھوڑا بہت علم، دولت آ جاتا ہے تو وہ خود کو دوسروں سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اپنی حیثیت بھول جاتے ہیں کہ خدا نے انہیں کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط؟ انسان خاکی ہے خالی ہاتھ دنیا میں آتا ہے اور خالی ہاتھ ہی دنیا سے جاتا ہے سوائے اپنے اعمالوں کے وہ یہ بھول جاتا ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا افضل ہے.....

☆☆

# رنگ دھنک

آپ کی بیاض، پسندیدہ اشعار کا انتخاب

دیوانی سے کم نہ تھی کچھ اپنا جنس  
ہم بے وفا جہاں میں وفا ڈھونڈتے رہے  
(اکرام اللہ - حیدر آباد)

پیار سے تم جب پیار مت کرو  
جب تک پیار تم سے پیار نہ کرے  
جب پیار تم سے پیار کرے  
تو پیار کو اتنا پیار کرو  
کہ پیار کسی اور کو پیار نہ کرے  
(عدنان علی - لاہور)

اس نے ہم کو دیکھا تو خود کو چھپالیا  
تجائے لوگوں نے اس کو کیا کیا سکھادیا  
گھر بھی اس نے بنایا تو مسجد کے سامنے  
اس کی یاد نے ہم کو نمازی بنادیا  
(فلک زاہد - لاہور)

دفن ہوئے اس کے شہر کے قبرستان میں تو وہ رونے لگا خود  
شاہد جو کہا کرتا تھا، لوترب ہی کوئی ٹھکانہ کہ ملنا آسان ہو  
(شاہد رفیق - سکس کیروالا)

ہم تو مجبور تھے تم سے جو دور تھے  
پیار کرتے صنم تم کو ضرور تھے  
پر کر نہ سکے تم سے اظہار ہم  
تکسیر کرتے اولیں! تم تو مغرور تھے!!!  
(اولیں نور - میرپور ماٹھیل)

رات کیا دھلی ستارے چلے گئے  
غیروں سے کیا گلہ جب اپنے چلے گئے  
جیت تو سکتے تھے باری باری ہم بھی  
پر اس کو جتانے کے لئے ہم ہارے چلے گئے  
(شرف الدین جیلانی - ٹنڈوالہیار)

کچھ لوگ زندگی میں آتے ہیں بیٹھے بیٹھے  
اپنا بنا کے دور چلے جاتے ہیں وہ ایسے

ہم ہی پیچھے رہ گئے وہ اڑ گئے ہم سے آگے  
دور دے گئے دینے والے گلاب کو بیٹھے بیٹھے  
(گلاب خان موگلی - راولپنڈی)

میرے سجدوں کے تسلسل کو تو کیا جانے تبسم  
سر جھکایا تو خوشی مانگی ہاتھ اٹھایا تو زندگی مانگی  
(راہبہ عباس - ہستی نئے والی)

دل کے گلشن سے محبت کے کنول لایا ہوں  
اپنے دل کے کسی کونے میں مگورا کرلو  
(سوج دین - کھنڈر سندھ)

ہمراہ تیرے پھول کھلاتی تھی جو دل میں  
اب شام وہی دور سے خالی نہیں جاتی  
ہم جان سے جائیں گے جیسی بات بنے گی  
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی  
(انتخاب: نادیا یاسین - کھنڈر سندھ)

عشق کی منزلیں دشوار کیوں ہیں  
چہار سوں پھیلی ہوئی دیوار کیوں ہے  
جس کو کبھی میری یاد تک نہیں آئی  
مجھ کو اس کا ہی انتظار کیوں ہے  
(انتخاب: انھیں ستار - کھنڈر سندھ)

ملا تھا ایک دل جو تمہیں دے دیا ساحل  
ہزاروں بھی ہوتے تو تیرے لئے ہی ہوتے  
(خضر حیات - روڈہ محل)

بہت برا ہوں میں کہ کسی کا برا نہ کر پایا  
وہ اس لئے کہ کبھی بد دعا نہ کر پایا  
قصور وار ہوں آگے نکل گیا ہوں کہیں  
میں لامکاں پر اکٹھا نہ کر پایا  
(سنبل ماہن - سرگودھا)

خاک پر آنسو بہا کر کیا کریں  
پتھر دل والوں کو آزما کر کیا کریں  
دنیا والوں نے بے آرام کر رکھا ہے  
اب تیری آرام گاہ میں آکر کیا کریں  
(راہبہ عباس - ہستی نئے والی)

☆☆

# غزل

آپ کی پسندیدہ غزلوں کا انتخاب

تجھ سے دور رہ کے بھی ہم بھلا نہ سکے  
تیرے تھے پھر بھی تجھے ہم اپنا بنا نہ سکے  
دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے آخر  
ہم تاریکیوں میں پھر کوئی چراغ جلا نہ سکے  
تجھ سے گلہ کیا کریں ہم تیری بے وفائی کا  
بڑے ہوئے حالات سے ہم پھر بھلا نہ سکے  
لے تھے ہمیں بہت سے زخم تیری محبت میں  
چہر کے شکستہ دل ہم یوں بھی تجھے دکھا نہ سکے  
تیری یادوں سے دامن چھڑاؤں پھر میں کیسے  
امیر تھے تیری زلفوں کے ہم نظروں کو بچا نہ سکے  
اس دیوانے دل کو میں کیا کروں پھر جاوید  
دیران محفل میں پھر کوئی پھول کھلا نہ سکے  
(محمد اسلم جاوید - فیصل آباد)

☆☆☆

یاد رکھنا تم میرے کچھ مہر کو  
بھولنا مت مجھ پہ ڈھائے قہر کو  
ہے سلام ہر وقت میرا فخر سے  
نام دینے والے میرے شہر کو  
کل پایا تھا حق پہ جو ستراف نے  
آج ہی میں نے پایا اس زہر کو  
عاشقی فرہاد پر ہے ختم بس  
کس نے کھودا دودھ کی پھر نہر کو  
اب بھی تم کو یاد کرتی ہوں بہت  
کیوں دباؤں دل میں اٹھتی لہر بس  
راہ نکلتی تھی تمہاری میں کبھی  
روز ہی تپتی ہوئی دوپہر کو  
مجھ پر خانم رب کی رحمت ہے بڑی  
بس خدا قائم رکھے اس مہر کو  
(فریدہ خانم - لاہور)

خونفاک کہانیاں [213] اپریل 2018ء

تغیر شام ہجر کے سماں ہوئے تو ہیں  
ٹپکوں پہ اہتمام چھاواں ہوئے تو ہیں  
ان کی نگاہ شوخ میں اک بے رخی سہی  
میری طرف وہ بزم میں مگراں ہوئے تو ہیں  
پھر بام و در چمک اٹھے چہروں کے نور سے  
تسکین اشتیاق کے سماں ہوئے تو ہیں  
برسات تو ہمارے مقدر کی بات ہے  
روشن ہوا پر ابر پریشان ہوئے تو ہیں  
برپا ہے بھرے خانہ زنجیر کی صدا  
شاید کہیں بہار کے سماں ہوئے تو ہیں  
قمر ہو اپنے شہر سے گرما نہ سکے بزم  
یہ بھی بہت ہے لائق یاراں ہوئے تو ہیں  
(چوہدری قمر جہاں لی پوری - ملتان)

☆☆☆

میرے شہر کے گلستاں میں گلی آگ کو بجھا دو  
بچے ہوئے پھولوں کو جلنے سے بچا دو  
ہر روز ہے اک نئی داستان خون میں ڈوبی ہوئی  
قاتل کب تک رہیں گے ماحولم اتنا تو تباہ دو

کون مرا کس نے مارا پوچھتے ہیں لوگ آتے جاتے  
تھک چکے ہیں ہاتھ لاشے اٹھاتے اٹھاتے  
کب ختم ہوئی ظلم کی یہ سیاہ رات باہر  
مجھے میرا پہلے والا شہر کراچی لوٹا دو

(بابر علی رند بلوچ - بھولے دی جھوک، ساہیوال)

☆☆☆

بیارا و دلکش ہے کونستہ کا منظر  
دھرتی نے اوڑھ لی سفید چادر  
روٹی کے گالوں کی سی ہے برف باری  
آنکھوں کو لگتی ہے بہت بیاری  
ہلکی ہلکی ہوا بھی ہے در آئی  
سردی کی لہر جسم میں اتر آئی  
برف کے گولے بچے اچھا رہے ہیں  
جسموں میں برف کو ڈھال رہے ہیں  
برف باری کاہنہ میں ہے ظلم چھایا  
پورا شہر یہاں آج اللہ آیا

خونفاک کہانیاں [212] اپریل 2018ء



ہر طرف ہے ٹھنڈا و خوب صورت سماں  
ہر چہرہ ہے خوشی سے شادماں  
(سائل ابود۔ ذریعہ اللہ یار بلوچستان)

☆☆☆

نہم پاس سے بلا سکے  
ندول کی بات بتا سکے  
وہ ہنسی ہنسی چل دینے کے  
ہم ہاتھ تک نہ ملا سکے  
یونگی سوچتی رہی دیر تک مگر  
ہم اسے کچھ نہ بتا سکے  
یہ مقام ہی تھا عجیب سا کہ  
ہم خود کو بھی نہ بچا سکے  
وہ جدا ہوا تو کچھ اس طرح  
کوئی رسم تک نہ بھاگے  
اسے جانا تھا وہ چل دیا  
اسے آج تک نہ بھلا سکے

(اقرابہم۔ ہستی فتنے والی)

☆☆☆

ستارہ ہماری قسمت کا اسی سے ملا ہی نہیں  
وہ کیسے ہوتا ہمارا ایسا بھی ہوا ہی نہیں  
ہم نے اپنی ہر خوشی دوسروں میں بانٹ دی  
کسی نے ہمیں کیا دیا یہ بھی سوچا ہی نہیں  
باتوں باتوں میں محبت اس قدر بڑھ گئی  
اسے اب بھول جائیں کیسے اتنا حوصلہ ہی نہیں  
ہر کسی نے ہمیں مطلب تک پیار کیا  
کوئی ہمسفر بن کر ساتھ چلا ہی نہیں  
ہر کوئی میری چاہت کو مذاق سمجھتا رہا  
دل میں ہے درد کتنا کوئی سمجھتا ہی نہیں  
(شاہد رفیق سہو۔ کبیر والا)

☆☆☆

زندگی میں تو نہیں تو آرزو کس لئے  
یہ محبت کس کے لئے یہ جتو کس کے لئے  
میں تجھے دیکھا کروں اور تو مجھے دیکھا کرے  
یہ نہیں تو جان جاناں رو برو کس کے لئے

ہر سچاوت جسم و جاں کی میں نے کی تیرے لئے  
تو اگر ملتا نہیں تو رنگ و بو کس کے لئے  
دلبری کے تیرے چہرے چاہے جا بجا میں نے سنے  
تو اگر میرا نہیں تو یہ چاہت کس کے لئے  
ہر غزل میں نے لکھی اسے جان جاں تیرے لئے  
تو اگر سنتا نہیں تو مستگو کس کے لئے  
(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

☆☆☆

ہم زبان میرے تھے مگر ان کے دل اچھے نہ تھے  
مزیں اچھی تھیں مگر میرے ہمسفر اچھے نہ تھے  
جو خبر پہنچی یہاں تک، اصل صورت میں نہ تھی  
تھی خبر اچھی، مگر اہل خبر اچھے نہ تھے  
ہم کو خوابوں میں نظر آتی تھیں کتنی خوبیاں  
جس قدر اچھے لگے تھے س قدر اچھے نہ تھے  
اسی لئے آتی نہیں گھر میں محبت کی ہوا  
اس محبت کی ہوا کے شہر اچھے نہ تھے  
(سہل مایین۔ راولپنڈی)

☆☆☆

پڑے ہیں زندگی پر غم کے سائے  
یہ فصل گل کہاں تک دل بھائے  
وہ گل چینوں کے ہاتھوں ٹوٹتے ہیں  
گھڑی بھر کے لئے جو مسکرائے  
اداء اس کی بدلتے موسموں سی  
مزاج یار پہچانا نہ جائے  
سنبھل جانا بہت مشکل ہے اس کا  
نہ جب تک کوئی انسان منہ کی کھائے  
میں جس کے ہر ستم کو سہہ رہا ہوں  
مری باتوں پر وہ کیوں تھلائے  
لرز جاتا ہے جھوٹا سو اسے  
گمروئے ریت کے جس نے بنائے  
قر وہ وقت بھی آئے گا شاید  
تری غزلیں بھی مستگنائے  
(ریاض حسین قر۔ سنگا ڈیم)

☆☆☆

ہستے ہوئے لوگوں کو دلانے والے بہت  
چہرے پہ آنسو چھپانے والے بہت  
ہم جن پر اعتبار بہت زیادہ کرتے رہے  
مگر ان اعتباروں کو توڑنے والے بہت  
جس طرح شیشہ ٹوٹ کر زخم دیتا ہے  
شیشہ دل کو توڑ کر زخم دینے والے بہت  
ہستے ہوئے لوگوں کو دلانے والے بہت  
(راہبہ عباس۔ ہستی فتنے والی)

☆☆☆

یہ دنیا کیسی دنیا ہے یہاں کسی سے کسی کو پیار نہیں  
کہنے کو سب مسلم ہیں پر غیر مذہب جتنا بھی مان نہیں  
جب چھوٹے تھے سب کہتے تھے ہیں پاکستان کا مستقبل  
دل روٹی کے پیچھے پڑے ہیں سب بڑا پاکستان کی شان نہیں  
کیا ایسا کیا ہے تم نے بڑے فخر سے کہتے ہو مسلم ہو  
کیا قربانی دی اسلام کی خاطر اپنانے اللہ کے فرمان نہیں  
ماں بہن سمجھا جاتا تھا آج ہوس بھری ہے آنکھوں میں  
کیوں اتنی شیطانیت بھری ہے کیا اب رہے ہم مسلمان نہیں  
کیا ہوا میری نوجوان نسل کو کچھ کرنے کا کیوں جذبہ نہیں  
آج ہوس اور شوکت بھری ہیں ان میں گتے پاکستان کے جوان نہیں  
گر ہوتے آج قائد اعظم تو روتے حالت وطن دیکھ کر  
جو ہم نے دیا تھا اس قوم کو یہ اب وہ پاکستان نہیں  
فرض تمہارا اللہ کا یا ذمہ داری بھائی اس ملک کی  
گر ہوتے ہم مومن تو آج ہوتے یوں پریشان نہیں  
کیوں بے ہوئے ہیں فرقوں میں کیوں قومیت کی خاطر لڑتے ہیں  
اگر ہماری قومیت ہے پاکستانی کیا اللہ اور ایک قرآن نہیں  
کیوں ایسی باتیں کرتے ہو سب تم کو پاگل کہتے ہو  
مانتا ہوں میں پاگل ہوں خود کہتا ہوں میں عرفان نہیں  
(عرفان محمود۔ سیدین ملز)

☆☆☆

یہ جلوہ نما کی کس کارن۔ دیوار اٹھائی کس کارن  
اب بچ ہمارے دونوں کے ہے یار جدائی کس کارن  
ہر لکھ نظر کے صحرا میں ہر ذرہ ہی مثل لیلیٰ ہے  
مگر لوٹ چلاؤ اب انجمنوں، یہ حال سدائی کس کارن  
جب خواب جلتے تھے سارے، ہم بھی راگہ ہوئے جب جل کر

اب آنکھ کے ٹھہرے پانی میں، آگ لگائی کس کارن  
جب عہد تمہارے کی شیریں، رسموں کے سندرمیں ڈوبی  
پھر کاٹ کے تو نے پتھر کو یہ نہ چلائی کس کارن  
کب رہتا ہے سدا بندے نے جب دنیا ساری ہے فانی  
دو دن کے لئے عامر، پھر تو نے عمر گنوائی کس کارن  
(عامر زمان عامر۔ پورے والا)

☆☆☆

سرد راتوں کو میرے پاس آتی ہیں تیری یادیں  
ہر شب تنہائی میں ستاتی ہیں تیری یادیں  
لوٹ کر اب بھی نہ آئے گا تیرے پاس  
ہر شب بھی کہہ کر مجھے دلاتی ہیں تیری یادیں  
روز و شب تجھے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں  
تیرا ٹیم لے کر تیرا پیانی ہیں مجھے تیری یادیں  
جب بھی بچھ جاتا ہے تیرے پیار کا دیا  
مجھ سے پوچھتے بغیر اسے جلاتی ہیں تیری یادیں  
فلک بھلانا چاہتا ہوں جس صورت کو  
ہر شب وہی صورت دکھاتی ہیں تیری یادیں  
(فلک زاہد۔ لاہور)

☆☆☆

کیوں ہے تو مجھ سے خفا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا  
کیوں ہے تو مجھ سے جدا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا  
بے وفا کہتا نہیں تو ہیں ہے اس میں تری  
یار دوری کی وجہ، کچھ تو بتا کچھ تو بتا  
بس یہی ہے تم سے مرا سوال ہے جواب دو  
کس جرم کی ہے سزا، کچھ تو بتا  
کیا محبت کی عبادت میں ختم مجھ سے ہوا  
فرض ہے کوئی قضا کچھ تو بتا کچھ تو بتا  
وہ مری تقدیر میں تو نے لکھی ہے کہ نہیں؟  
اے خدا تو ہی بتا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا  
تم کرو گے مجھ سے دھوکا یہ بھی سوچا نہ تھا  
یہ لہ کیا ملا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا  
ہاں مجھے تو تو سے یہ امید ہی نہ تھی ادیس!  
یہ اچانک کیا ہوا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا  
(ادیس نور۔ میر پور اٹھیلو)

☆☆☆

# پراسرار ہستی

رزاق شاہد کوہلر - ڈیرہ اسماعیل خان

اس واقعے کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، ہر وقت عمر رفتہ کا خیال رہتا ہے، بابا کی ہر وقت یاد آتی ہے، مگر اب بپانہ ہی خواب میں اور نہ ہی جاگتی آنکھوں سے کہیں نظر آتے ہیں۔

ان دنوں شہر کے تمام تعلیمی ادارے فسادات کی وجہ سے غیر معینہ مدت کے لئے بند تھے اور میرے پاس فراغت ہی فراغت تھی، اس فراغت کا بہترین مصرف میں نے یہ نکالا کہ سارا دن لمبی تان کر سویا رہتا تھا شام کو کالے کر دوستوں کے ساتھ گیارہ بارہ بجے تک گھومتا رہتا اور اس کے بعد صبح تک ایڈوچر پڑھتی موویز دیکھتا رہتا تھا۔ رات کا کھانا میں ہمیشہ دوستوں کے ساتھ کسی فائو اسٹار ہوٹل میں کھالیا کرتا تھا۔

امی ابو میری اس روٹین سے سخت تالاں تھے اور اکثر اوقات مجھے اس آوارہ گردی سے منع کرتے رہتے تھے مگر میں جوانی کے جوش میں ان کی کسی نصیحت کو خاطر میں نہیں لاتا تھا ویسے بھی میں ان کی انکوئی نرینہ اولاد تھا اس لئے وہ مجھ سے کسی قسم کی سختی وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ تاہم مجھے ذہانی کلاسی ڈانٹ تقریباً ہر دوسرے روز سننا پڑتی تھی۔

مجھے سے بڑی ایک بہن تھی جو دو سال قبل بیاہ کر پادیس سدھار چکی تھی اور چھوٹی ابھی میٹرک میں زیر تعلیم تھی اب ایک مشہور و معروف کنسرٹیشن کمپنی کے مالک تھے جس کا ہیڈ آفس لاہور میں جبکہ ڈیلی برانچیں کراچی سے لے کر ہزارہ ڈویژن تک پھیلی ہوئی تھیں اس لئے ہمارے ہاں دولت کی ریل پیل تھی گھر میں ایک چھ تین تین نئے ماڈل کی گاڑیاں موجود درہن تھیں جو میرے ذاتی اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے

جمع رہتا تھا اپنی کوئی بھی ضرورت پوری کرنے کے لئے میں جب چاہتا تھا بینک سے رقم نکلوا کرتا تھا۔ دوسرے دن ابو میرے اکاؤنٹ میں نکالی گئی رقم کا دو گنا جمع کر دیتے تھے یہ سلسلہ اس وقت شروع کیا گیا تھا جب میں میٹرک کا طالب علم ہوا کرتا تھا۔

کہتے ہیں دولت کا نشہ سرچھ کر بولتا ہے اور اچھے خاصے شریف انسان کو دنوں میں بگاڑ کر رکھ دیتا ہے مگر میں نے اس کیاوت کو غلط ثابت کر دکھایا تھا میں اپنی امدت پر آج تک بھی اترا ہوا اور نہ ہی دولت کا سہارا لے کر کوئی ایسا کام کیا تھا جو میرے اور میرے والدین کے لئے باعث شرم و عار کہلاتا۔ تاہم میں اپنے دوستوں پر بے دریغ دولت لٹایا کرتا تھا خصوصاً غریب دوسوں پر ان کی مالی امداد کر کے مجھے بے پناہ خوشی اور سکون حاصل ہوتا تھا۔

ابو نے کبھی میرے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی تھی کبھی کبھار امی عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے ٹوکنے کی کوشش کرتیں تو ابو میرا بھرپور ساتھ دیتے تھے اور پھر امی کو چپ کر کر ہی دم لیتے تھے۔

چند روز پہلے کا ذکر ہے، میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو پچاس ہزار روپے بطور قرض حسدہ دیئے تو امی حسب معمول مجھ پر برس پڑیں۔

”سرمد.....؟“ وہ مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔

”تمہارا دل نہیں دکھتا باپ کی محنت کی کمائی لٹاتے ہوئے۔ وہ دن رات ایک کر کے کماتے ہیں اور تم بن مانگے کسی کی بھی جھوٹی بھر دیتے ہو۔“

”امی..... امی نے اسے قرض دیا ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”تین چار ماہ کے بعد لوٹا دے گا۔“

”ہونہ۔ قرض.....“ وہ قدرے غصے سے بولی۔

”آج کل کون واپس کرتا ہے قرض؟ لوگ تو سرکاری قرضے تک ہضم کر جاتے ہیں، جنہیں کون پوچھے گا.....؟“

”کیوں نہیں پوچھے گا.....؟ میرا دوست ایک شریف اور خوددار انسان ہے۔“

”خوددار ہوتا تو پھر یوں تمہارے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتا بلکہ محنت مزدوری کر کے کماتا۔“ امی نے استہزاء انداز میں جواب دیا۔

”میں دوست ہوں اس کا۔“ میں نے ناگوار انداز میں کہا۔

”اور دوست ہی دوست کے کام آتا ہے..... کل مجھ پر بھی وقت آ سکتا ہے، ہم انسان اگر ایک دوسرے کے کام نہیں آئیں گے تو اور کون آئے گا.....؟“

مجھے واقعی امی کی سوچ پر دھوکہ ہوا تھا مگر ان کے سامنے گستاخی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اوپر والے نے میری جنت اس کے قدموں تلے رکھ رکھے امتحان میں ڈال دیا تھا لگتا ہے۔ ”تمہیں ٹیکل ڈالنا پڑے گی۔“ مجھے برا مانتے دیکھ کر وہ موضوع بدل کر بولیں۔

”جب ٹوکنے والی کوئی ہوگی تو تمہارے سارے کس بل لٹل جائیں گے۔ ماں کی باتیں تو تمہیں بری لگتی ہیں ناں۔“

”نہیں.....“ میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

”مجھے آپ کی باتیں بالکل بری نہیں لگتیں، اس لئے مجھے ٹیکل ڈالنے کا ارادہ فی الحال ملتی کر دیں، میں ابھی پڑھنا چاہتا ہوں، کچھ بن کر دکھانا چاہتا ہوں.....“

”ایک شرط پر تمہیں چھوڑ سکتی ہوں.....“

”شرط..... کیسی شرط.....؟“ میں نے تحیر انداز میں پوچھا۔

”آئندہ تم اپنے کسی دوست کو قرض نہیں دو گے۔“ امی نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔

”بہت نامعقول شرط ہے۔ لیکن.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ کر سر کھانچا شروع کر دیا۔

”لیکن کیا.....؟“ امی نے کھو کر پوچھا۔

”سوچ کر بتاؤں گا.....؟“

”ٹھیک ہے تم سوچتے رہو، میں آج ہی تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں دیکھتی ہوں تم کیسے انکار کرتے ہو.....؟“ اتنا کہہ کر وہ چل دیں اور میں سوچوں میں غرق ہو گیا۔

میں اگر چاہتا تو امی سے جھوٹا وعدہ کر کے اس معاملے سے جان چھڑا سکتا تھا مگر امی سے جھوٹا وعدہ کرنا مجھے نامناسب لگتا تھا ویسے بھی کسی ضرورت مند دوست کو میں چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے امی سے سوچنے کی مہلت مانگی تھی لیکن امی نے میری بات سننا گوارا نہیں کی تھی۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ امی ضرور ابو سے میری شادی کی بات کریں گی اور ابو بھی وقتی طور پر ان کی ہاں میں ہاں ملائیں گے مگر ایک بات میرے لئے باعث اطمینان تھی کہ ابو ہر صورت میرا عندیہ ضرور جانیں گے اور بغیر سوچے سمجھے کہیں بھی میرا رشتہ طے کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی وہ باپ سے زیادہ میرے دوست تھے۔ آج تک میری مرضی کے خلاف انہوں نے مجھ سے متعلق کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا تھا تو اب کیسے کر سکتے تھے یہی سوچ کر میں مطمئن ہو گیا تھا۔

مگر دوسرے دن ابو نے مجھے سنجیدگی سے بتایا کہ امی فوراً میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔

”نہیں ابو.....“ ان کی بات سن کر میں نے انکار میں ہلایا۔

”شادی کرنے کے لئے ابھی عمر بڑی ہے۔ فی الحال میں صرف پڑھنا چاہتا ہوں۔“

”پڑھائی کا کیا ہے۔ وہ تو شادی کے بعد بھی جاری رکھی جاسکتی ہے۔“ ابو نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تم کوئی لڑکی تو نہیں ہو کہ گھر میں بیٹھ جاؤ گی بہتر ہے کہ اپنی ماں کا کہنا مان لو، ہر ماں کو بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کا بڑا ارمان ہوتا ہے۔“

”ابو، کیا واقعی امی کو میرے سر پر سہرا سجانے کا ارمان ہے..... یا پھر کوئی اور چکر ہے.....؟“

”چکر.....“ ابو نے الجھ کر پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”چکر.....؟“ ابو نے الجھ کر پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟“

”ابو..... دراصل امی مجھے سزا دینے کے لئے میری شادی کرنا چاہتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ میں بہت فضول خرچ ہوں اور اپنے دوستوں کو قرض وغیرہ دے کر باپ کی کمائی لٹا رہا ہوں، اس لئے وہ میری اصلاح کے لئے مجھ پر ایک کبجوں لڑکی مسلط کرنا چاہتی ہیں جو وقت بے وقت میرا دماغ چاٹ سکے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ارے نہیں بھئی یہ تمہارا دم ہے۔“ ابو نے مسکرا کر کہا۔

”تمہاری امی کو واقعی ایک عدد بہو کی ضرورت ہے۔“

”بہو کی نہیں، حمایتی کی ضرورت ہے جو میرے خلاف ان کا ساتھ دے سکے۔“

”دیکھو بیٹے.....“ ابو نے ایک دم نامحانہ انداز اختیار کر لیا۔

”ماں باپ ہمیشہ اولاد کے بھلے کا ہی سوچتے ہیں تمہاری امی نے بھی یقیناً یہ فیصلہ سوچ کر کیا ہو گا اس لئے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ان کے اس فیصلے پر غور کرو اور چند روز کے بعد مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔“

”پلیز ابو.....“ میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔

”مجھے اس آزمائش میں مت ڈالنے میں شادی

کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں، آپ امی کو سمجھا دیں۔“

”استحانہ باتیں مت کرو.....“ انہوں نے سر دھنکی۔

”میں تمہاری امی کی مرضی کے خلاف کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ شادی تو تمہیں ہر صورت کرنا ہی پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے تو پھر میری بھی ایک بات سن لیں مجھ پر اگر زبردستی کی گئی تو میں کھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

اتنا کہنے کے بعد میں پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھ پر ایک دم ہی جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی تھی، زندگی میں پہلی بار ابو نے میری کوئی بات ماننے سے انکار کیا تھا، حالانکہ اس سے قبل انہوں نے میری ہر جائز و ناجائز خواہش بلا تردد پوری کی تھی۔

دل پر ایک بوجھ لئے میں پیدل ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میرا رخ ایک قریبی پارک کی طرف تھا۔ دراصل میں وہاں کسی پرسکون گوشے میں بیٹھ کر اس معاملے پر غور کرنا چاہتا تھا مجھے اگر قبل از وقت معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ اس قدر سنجیدگی اختیار کرے گا تو شاید میں امی سے بحث کرنے کی بجائے ان سے جھوٹا وعدہ ہی کر لیتا، وہ کون سا ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھیں وہ تو میرے دوستوں کے ناموں تک سے ناواقف تھیں۔

میں ان کے علم میں لائے بغیر بھی اپنے دوستوں کی مدد جاری رکھ سکتا تھا۔ اب اگر میں ان سے وعدہ کرتا تو وہ مجھ پر کسی طرح بھی اعتبار نہ کرتیں بلکہ صاف کہہ دیتیں کہ میں شادی کوٹا لئے کے لئے جھوٹا وعدہ کر رہا ہوں۔

انہی سوچوں میں غلطانہ دھچکان میں ٹپکنے کے انداز میں چلتا ہوا پارک میں داخل ہوا اور قدرے ایک سستان گوشے میں موجود سنگی بیچ پر بیٹھ گیا وسیع و عریض پارک میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ جوڑے بچوں پر بیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے کچھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پارک کی نرم زم زم گھاس پر چھل قدی کر رہے تھے اور بچے مختلف ٹیکل، ٹیکل، ٹیکل رہے تھے، جن میں کرکٹ سر فہرست تھا۔



مجھے پارک میں بیٹھے ابھی چند لمحات ہی گزرے تھے کہ میری نگاہ ایک عجیب و غریب بوڑھے شخص پر پڑی وہ بالکون کی طرح پارک میں موجود ایک شخص کو گور سے دیکھتا پھر رہا تھا۔ یوں جیسے اس کا کوئی کھوکھلا ہو، ہر شخص کے قریب پہنچ کر وہ لمبے بھر کے لئے رکتا، دیکھ دیکھ کر اسے دیکھتا اور پھر تاسف سے سر ہلاتا ہوا کسی دوسرے شخص کے سامنے جا رکتا۔ ایک بار پھر وہی وہی عمل دہراتا اور دوبارہ آگے چل دیتا۔

اپنے میلے کھیلے لباس اور جھل جھلکار بالوں اور داڑھی کے ساتھ وہ بڑی حد تک پراسرار نظر آ رہا تھا۔ کچھ افراد نے اسے بھیک دینے کی بھی کوشش کی مگر وہ بے نیازی کے ساتھ ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ مین میرے سامنے پہنچ کر رک گیا اور بغیر پلک جھپکائے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی لال لال آنکھوں میں ایک عجیب سا اثر تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی جگہ فردا کی نظر آ رہی تھی، گوکہ وہ نام ملنگوں اور رویش کھلانے والے نام نہاد شخصوں کے جیسا تھا، انہی کی طرح اس نے میلا کچلا لباس پہن رکھا تھا اور شاید بھینوں سے اس نے پانی کی غسل نہیں دینی تھی مگر پھر بھی اس کی غلیظ شخصیت میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ مجھ پر کراہیت کی بجائے مروجہ بیت کا احساس غالب آ رہا تھا۔ میں عام لوگوں کی طرح ضعیف عقیدے کا مالک نہیں تھا مگر پھر بھی لمبے لمبے اس کی شخصیت سے متاثر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی لال لال آنکھیں مجھے اپنے اندر تک اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کوئی ساحر لگتا تھا جو بھلک کر اس پارک میں آ نکلتا تھا۔

چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد اس نے ”حق اللہ“ کا نعرہ مستانہ لگایا اور مسکراہٹ آمیز انداز میں بولا۔

”مل گیا بل گیا۔“  
”کک۔۔۔۔۔ کون مل گیا بابا۔۔۔۔۔؟“ میں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

”جس کی تلاش تھی۔“ مختصر سا جواب دے کر اس نے دوبارہ نعرہ بلند کیا۔ ”حق اللہ۔“  
”کیا آپ مجھے تلاش کر رہے تھے۔۔۔۔۔؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ایک انسان کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں بڑی مشکل سے ایک انسان ملا ہے۔ ایک عرصہ بیت گیا ہے میں نے انسان نہیں دیکھا۔ پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں انسان۔۔۔۔۔؟“

وہ عجیب فلسیانہ انداز میں بول رہا تھا اور میں اچھے ہوئے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں، اتنے بہت سے انسانوں کی موجودگی میں بھی وہ انسان تلاش کرتا پھر رہا تھا اور یہ بات مجھے کسی طرح ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ سب انسان ہی تو ہیں بابا۔“ قدرے توقف کے بعد میں نے اچھے کر کہا۔

”آپ کسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔۔۔۔۔؟“

”من کی آنکھ کھول کر دیکھ نادان۔“ وہ ناراض ہو کر بولا۔

”ان آنکھوں سے تو صرف ظاہر نظر آتا ہے۔ یہاں کوئی انسان نہیں ہے، وہ دیکھ۔“ اس نے انگلی سے پارک کے ایک سسٹان کو نے کی طرف اشارہ کر دیا۔

”وہاں انسانیت انسانوں کی بے جی دیکھ کر اکیلی بیٹھی رو رہی ہے۔ جاؤ جا کر اس کے آنسو پونچھ کر اسے گلے لگاؤ، فلاح پا جاؤ گے۔۔۔۔۔“

”شاید پاگل ہے۔“ اس کی باتیں سن کر میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

”سب یہی سوچتے ہیں جو تم سوچ رہے ہو۔“ اتنا کہہ کر اس نے پھر نعرہ بلند کیا۔

”حق اللہ۔۔۔۔۔ انسان کہاں ہیں؟ میری تلاش کب ختم ہوگی۔ یہ تم نے مجھے کس چکر میں ڈال دیا۔“

”مم۔۔۔۔۔ معاف کر دے بابا۔“ میں نے احساس مروجہ بیت سے کاٹتی ہوئی آواز میں کہا۔

”مم۔۔۔۔۔ مجھ سے۔۔۔۔۔ بھول ہو گئی۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔ میں بہت پریشان ہوں۔“  
”وہ دیکھ۔“ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

”وہاں ادھر بیٹھا ہے معاف کرنے والا۔۔۔۔۔ میں تو خود قاتل رحم اور اس کی معافی کا طلب گار ہوں، کون جانے وہ معاف کرتا بھی ہے یا نہیں۔۔۔۔۔؟ تو بھی اسی سے معافی مانگ، وقت گزر گیا تو پچھتائے گا۔ پھر کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”میں۔۔۔۔۔ آپ کو پہچان نہیں سکا بابا، ورنہ ایسا سوچنے کی غلطی بھی نہ کرتا۔۔۔۔۔ آپ تو بہت پچھتے ہوئے ہیں۔“

”چپ۔۔۔۔۔“ اس نے قدرے سخت انداز میں قطع کلامی کی۔

”مجھے تکبر کی سیڑھیاں چڑھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ اوپر والا جانتا ہے۔۔۔۔۔ سب کو میں اور تو، تو اس کی بچھاؤ ہوئی بساط کے ادنیٰ سے مہرے ہیں، جن کے ادھر ادھر ہونے سے بساط پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس کا جواب سن کر میں چپ سا دھ کر بیٹھ گیا۔ وہ واقعی کوئی پچھتی ہوئی ہستی تھا۔ انسان کی سوچیں تک بڑھ لیتا تھا، شاید معرفت کے کسی بلند مقام پر فائز تھا لیکن زبان سے اس کا اقرار کرنا اسے منظور نہیں تھا اور اللہ والے ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔ بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی خود کو ایک حقیر تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے کہ تکبر تقویٰ کا لازمی رکن ہے۔ سچ کہوں تو اس کی مدخلت نے میری پریشانی کو کافی بڑھا کر ڈال دیا تھا حالانکہ اس کی آمد سے کل میں بہت پریشانی کے عالم میں بیٹھا جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔

”مجھے کھانا کھلا دے۔“ اس نے ایک بار پھر آسمان کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اس نے بھیجا ہے مجھے۔۔۔۔۔ تمہارا مہمان بنا کر۔۔۔۔۔“

اس کا حکم سن کر میں بلا تردد اٹھا اور اس کے ساتھ

چل دیا وہاں موجود لوگ ہمیں عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کچھ کی آنکھوں میں حیرت تھی تو کچھ کا انداز تحسّر تھا۔ لیکن بابائے کسی پر تو یہ نہ دی اور بے نیازی سے آگے بڑھتا چلا گیا یوں جیسے پارک میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا موجود ہی نہ ہو۔

پارک سے نکلنے کے بعد ایک لمبے کے لئے رک گیا، سڑک پر ٹریفک کا اڑدھام تھا اور پیدل سڑک پارک کرنا مشکل نظر آ رہا تھا ہمارے دائیں جانب کچھ فاصلے پر ٹریفک سٹنل موجود تھا وہاں سے سڑک پارک کرنے کے بعد ہی سامنے والے فائبر اسٹار ہوٹل میں پہنچا جاسکتا تھا۔

”آئیے۔۔۔۔۔“ میں ٹریفک سٹنل کی طرف بڑھتے ہوئے بابا سے مخاطب ہوا۔

”میں آپ کو بہترین کھانا کھلاؤں گا۔ وہ سامنے ہی ہوٹل ہے، وہاں کا کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔“

”ناں۔۔۔۔۔“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔

”میں گھر کا کھانا کھاؤں گا۔۔۔۔۔ ہوٹل کا کھانا ہوتا تو تجھے کیوں کہتا۔۔۔۔۔؟“

”میرا گھر تو بہت دور ہے بابا۔“ میں نے راستے کی طوالت کے پیش نظر کہا۔

”اور پھر وہاں کھانا بھی مخصوص وقت پر پکتا ہے میں آپ کو تکلیف سے بچانا چاہتا ہوں۔“

”آسانیاں انسان کو ناکارہ بنا دیتی ہیں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

”مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

اتنا کہنے کے بعد میں اسے ساتھ لئے گھر کی طرف روانہ ہو گیا مگر پہنچ کر میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا اور خود خانساں کے پاس بچن میں پہنچ گیا اسے کھانا تیار کرنے کا حکم دے کر جب میں واپس لوٹا تو امی کو ڈرائنگ روم کے دروازے پر بٹھ کر پایا۔ چند لمبے وہ مجھے ملامت آمیز نگاہوں سے گھورتی رہیں اور پھر غصے سے بولیں۔

”یہ ڈرائنگ روم میں کسے بیٹھا رکھا ہے۔“  
”میرا مہمان ہے، کھانا کھا کر چلا جائے گا۔“ میں



”اس نے جتنا کھانا تھا کھالیا..... تم یہ برتن اٹھا کر لے جاؤ۔“ میں نے باہر جاتے ہوئے اسے حکم سنایا۔

”تھوڑی دیر کے بعد فی وی لاؤنج میں میرے لئے کافی لے آتا۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“ وہ برتن سمیٹتے ہوئے بولا اور میں باہر نکل کر فی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔

میرا ذہن بدستور اس پراسرار بابا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جس کی باتیں بظاہر اچھی ہوتی تھیں لیکن حقیقت میں بامقصد تھیں وہ یقیناً کوئی نیچے ہوئی ہستی تھا یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اس نے پارک میں موجود اسٹے سارے لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی میزبانی کے لئے صرف مجھے ہی کیوں منتخب کیا تھا؟ میں تو ایک جام سا گناہ گار شخص تھا۔ میرے کریڈٹ پراسی کوئی نیکی نہیں تھی کہ اللہ کا کوئی برگزیدہ بندہ مجھے اپنے التفات کے لائق سمجھتا۔

یہ سوال میرے لئے نہ صرف اہم بلکہ قابل غور تھا کہ اسٹے بہت سارے لوگوں کی موجودگی میں آخر میرا انتخاب ہی کیوں کیا گیا تھا؟ بابا نے جاتے ہوئے مجھے اپنا چٹا ٹھکانہ تک نہیں بتایا تھا ورنہ میں اس سے دوبارہ ملنے کی کوشش ضرور کرتا پراسرار ہونے کے باوجود وہ مجھے اچھا لگا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد انور کافی لے کر پہنچ گیا اسے دیکھ کر مجھے پھر بابا کی بات یاد آگئی مگر میں انور سے دل کی بات کہہ کر اسے خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا نہ جانے بابا نے کس ترتیب میں آ کر وہ بات کہہ دی تھی میں صرف اندازے ہی لگا سکتا تھا۔ اگر بابا نے مجھے واضح الفاظ میں انور سے متعلق کسی ممکنہ خطرے سے آگاہ کر دیا ہوتا تو میں انور سے اس موضوع پر بات ضرور کرتا اور اسے محتاط رہنے کی خصوصی تاکید بھی کر دیتا مگر ایسی لالچی کی صورت حال میں اس سے کچھ کہنا بجا ہے اسے پریشانی میں مبتلا کرنا تھا وہ کافی کا کپ ٹیمبل پر رکھ کر وہاں جانے لگا تو میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

”انور چچا کے ساتھ تمہارے تنازعہ کا کیا بنا.....؟“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”ابھی تک تو کچھ بھی نہیں بنا صاحب۔“ وہ اداس انداز میں بولا۔

”میرا چچا انتہائی لالچی انسان ہے، میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں لیکن وہ کسی طرح بھی میرے حصے کی زمین دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ اس کے خلاف دعویٰ دائر کروں مگر پھر خیال آتا ہے کہ ایسا کرنے سے میری اکلوتی بہن کا گھر اجڑ جائے گا۔ بد قسمتی سے وہ چچا کی بہو ہے۔“

”تم نے علاقے کے پنواری سے بات کی ہے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے باپ کے نام پر زمین ہے کہ نہیں.....؟“

”کئی بار کی ہے صاحب، مگر وہ سننا ہی نہیں ہے چچا نے ملی بھگت کر کے پنواری سے لے کر تحصیل دار تک کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے سب یہی کہتے ہیں کہ میرے باپ نے مرنے سے پہلے اپنے حصے کی زمین چچا کے ہاتھ ڈال دی تھی لیکن خدا جانتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے میرا باپ تو ساری زندگی محنت مزدوری کر کے ہمیں پالتا رہا ہے وہ پرکھوں کی زمین بیچنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ سب چچا کا چلایا ہوا چکر ہے مگر میں بھی اسے چھوڑوں گا نہیں۔ چاہے میری جان کیوں نہ چلی جائے.....؟“ اس نے پر عزم انداز میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ”میری مانو تو عدالت سے رجوع کرو تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔“

”کل میں جاؤں جا رہا ہوں صاحب چچا سے دو ٹوک بات کروں گا اگر وہ نہ مانا تو پھر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔“

”چچا سے تو تم پہلے بھی کئی بار بات کر چکے ہو۔“ میں کسی خدشے کے تحت بولا۔

”لیکن نتیجہ کیا نکلا.....؟“ اس نے تمہارا حق تسلیم

کرنے کی بجائے تمہیں دھمکانا شروع کر دیا اب اگر تم نے اسے عدالت میں جانے کی دھمکی تو مشتعل ہو کر تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔“

”تو پھر میں کیا کروں.....؟ کیا اپنے حصے کی زمین چھوڑ دوں یا.....“

”زمین چھوڑنے کے لئے کون کہہ رہا ہے.....؟“ میں نے قطع کلامی کی۔

”میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم اسے مطلع کئے بغیر عدالت سے رجوع کر دو تا کہ وہ کوئی بھی غلط قدم اٹھانے سے گریز کرے۔“

”نہیں صاحب جی.....“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔

”چچا سے بات کئے بغیر میں عدالت تک نہیں جاؤں گا ورنہ وہ لوگ میری بہن کا جینا دو بھر کر دیں گے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اپنے چچا کی طرف سے محتاط رہنا۔“ میں نے اسے تاکید کی۔

”بہتر ہوگا کہ تم گاؤں کے کسی معتبر شخص کو ساتھ لے کر چچا کے پاس جانا۔“

”بہت اچھا صاحب جی..... میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔ اب میں جاؤں.....؟“

میں نے کافی کا کپ اٹھا کر ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”انور! میں کیسا انسان ہوں.....؟“

”میں سمجھا نہیں صاحب.....؟“ میرا غیر متعلق سوال سن کر اس نے الجھ کر پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کہ میں کیسا انسان ہوں.....؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا ہوں کہ برا ہوں.....؟ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟“

”صاحب.....! میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ مالک ہیں اور میں.....“

”انور.....!“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے

کہا۔

”تم یہ مت سوچو کہ میں تمہارا مالک ہوں۔ میں جیسا تمہیں لگتا ہوں، تم بلا تردد کہہ ڈالو میں برا نہیں مناؤں گا۔“

”صاحب..... آپ بہت رحم دل انسان ہیں۔“ وہ بولا۔

”ہر ضرورت مند انسان کی مدد کرتے ہیں حالانکہ دولت مند اکثر مغرور ہوتے ہیں مگر آپ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں ہوں لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

”ذرومت انور۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

”تم جانتے ہو کہ میں نوکروں کو بھی اپنا دوست سمجھتا ہوں اور سچا دوست وہی ہوتا ہے جو اپنے دوست کو نہ صرف اس کی خوبیاں بتاتا ہے بلکہ اسے اس کی خرابیوں سے بھی آگاہ کرتا رہتا ہے۔“

”بندے پر دھوکہ کے حقوق ہوتے ہیں صاحب۔“ وہ کسی داعظ کے سے انداز میں بولا۔

”حقوق اللہ اور حقوق العباد..... آپ حقوق العباد تو باقاعدگی سے اور خوشی سے ادا کرتے ہیں لیکن حقوق اللہ پر توجہ نہیں دیتے آپ میں بس یہی غامی ہے صاحب۔“

”شکریہ انور..... مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے تمہاری کھری اور غیر جانبدار رائے سن کر اب تم جاسکتے ہو۔“

میری اجازت پا کر وہ سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا اور میں نے ریسوٹ کنٹرول اٹھا کر فی وی آن کر دیا ایک اسپورٹس چیمبل کا انتخاب کرنے کے بعد میں صوفے پر نیم دراز ہو کر کرٹ نیچ سے محفوظ ہونے لگا۔ دو بجے تک میں نیچ دیکھتا رہا پھر فی وی آن کرنے کے بعد نیچ کرنے کے لئے ڈائننگ ہال کی طرف چل دیا۔

ڈائننگ ہال میں امی اور فائزہ میری منتظر تھیں



فائزہ کے اسکول میں ڈیڑھ بجے تک چھٹی ہو جاتی تھی اس لئے وہ بچہ ہمارے ساتھ ہی کیا کرتی تھی کبھی کبھار اگر وہ اسکول سے لیٹ بھی ہو جاتی تو امی اور میں اس کا انتظار کر لیا کرتے تھے۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ بہت لاڈلی اور امی کو بہت پیاری تھی ایک دن غلطی سے اس کی عدم موجودگی میں امی اور میں نے بچہ کر لیا تو اس نے وہ ادھم چلایا کہ خدا کی پناہ، پورے دن وہ لگا تار رو رہی تھی اور امی کی لاکھ کوششوں کے باوجود اس نے بچہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اس دن کے بعد امی نے کبھی اس کی غیر حاضری میں بچہ نہیں کیا تھا تاہم میں اس پابندی سے آزاد تھا مجھے جب کوئی ضروری کام ہوتا تھا تو میں بچہ لے کر آگے پیچھے کر لیا کرتا تھا۔

”آج تم لیٹ کیوں ہو گئے ہو۔۔۔۔۔؟“ میرے سینہ سنبھلنے ہی امی نے سوال کر دیا۔

”میں اس بھکاری کے ساتھ بچہ۔۔۔۔۔“

”پلیز امی۔۔۔۔۔“ میں نے بے چارگی کے عالم میں قطع کلامی کی۔

”آپ ایک معزز اور صاحب کشف و کرامت بزرگ کا مذاق اڑا رہی ہیں۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ امی نے ناگواری سے کہا۔

”تم نے اس میں کون سی کرامت دیکھ لی ہے کیا سر کے بال اور داڑھی بڑھا کر مینوں نہ تھا نے سے آدمی صاحب کشف و کرامت بن جاتا ہے؟ خدا کی پناہ اس کے جسم سے بدبو کے بجائے اٹھ رہے تھے میں تو ایک پل بھی اس کے پاس نہ بٹھرتی۔“

میں نے کہا۔ ”امی۔۔۔۔۔ آپ نے صرف اس کا ظاہر دیکھا ہے وہ عام ملکوں کی طرح ظاہر میلہ پھیلا لگتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ جیسا نظر آتا ہے ویسا ہے نہیں اس کی آنکھیں انکسے مشین کی طرح انسان کے اندر تک کھنگالنے کی صلاحیت رکھتی ہیں وہ من کی باتیں تک جان لیتا ہے۔“

”ایسا کیا بتا دیا ہے اس نے تمہیں، ذرا میں بھی

توسنوں۔“ امی نے طنز یہ انداز میں سوال کیا۔

”اس نے میرے بتائے بغیر نہ صرف میرا نام جان لیا بلکہ انور کو بھی اس نے نام لے کر پکارا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں اس کے لئے قطعی اجنبی تھے۔“ میں نے پر جوش انداز میں جواب دیا۔

”اس نے پہلے ہی کسی سے تم لوگوں کے نام معلوم کر لئے ہوں گے ایسے لوگ بہت عیار اور چالاک ہوتے ہیں۔“ امی نے فائزہ کی پلیٹ میں سالن ڈالنے ہوئے کہا۔

”تم محتاط رہنا اس سے، ہو سکتا ہے وہ کوئی فوسر باز ہو۔۔۔۔۔؟“

”نہیں امی۔۔۔۔۔“ میں نے تردید یہ انداز میں کہا۔

”آپ متنی انداز میں سوچ رہی ہیں وہ کوئی مجذب تو ہو سکتا ہے مگر فرادین ہو سکتا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔۔۔۔۔“

”ہو سکتا ہے وہ کوئی ٹیلی پیتھی وغیرہ جانتا ہو۔“ امی نے قطع کلامی کی۔

”اور اپنے اس علم کے ذریعے اس نے تم لوگوں کے نام معلوم کر لئے ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے اس علم کی حقیقت سے انکار نہیں ہے مگر یہ علم صرف انسانوں اور فلموں تک محدود ہے عملی زندگی میں آج تک میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جو ٹیلی پیتھی کا علم جانتا ہو اور اہم بات یہ ہے کہ ٹیلی پیتھی کا علم رکھنے والے یوں مجذب بن کر نہیں بھرتے بلکہ وہ اس علم کے ذریعے لاکھوں میں بھیتے ہیں۔“

”پھر ظاہر ہے اس کے پاس کوئی سٹیلی علم ہی ہو سکتا ہے۔“ امی نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں یہ سٹیلی علم اور کالا جادو وغیرہ صرف ڈھکوسلے ہیں، میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا وہ باہر رو کوئی صاحب معرفت ہے۔“

”ناہمکن۔۔۔۔۔“ امی بولی۔

”اس جدید دور میں ایسا سوچنا محض ایک حماقت ہے۔ وہ یقیناً تم لوگوں کے نام پہلے سے جانتا ہوگا۔“

”اگر بات ہمارے نام جان لینے تک محدود رہتی تو شاید اسے میں قابل توجہ نہ سمجھتا لیکن اس نے انور کے مستقبل کے متعلق ایک جملہ بول کر مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔“

”کیا کہا ہے اس نے۔۔۔۔۔؟“ امی نے ایک دم دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن اس نے مستقبل قریب میں انور کی موت کی پیش گوئی کی ہے اس نے انور کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ بے شک کبھی کوئی اس کی طرف لوٹ کر جاتا ہے کسی کا انتظار طویل اور کسی کا مختصر ہوتا ہے۔“

”اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ خدا خواستہ انور مستقبل قریب میں مرنے والا ہے؟“ امی نے طنز یہ انداز میں استفسار کیا۔

”ثابت تو ہو رہا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”آپ نہ مانیں تو اور بات ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک۔“ امی نے اکتا کر کہا۔

”اب کھانا کھاؤ اس موضوع پر بعد میں بات کر لیں گے۔“

بچہ سے فارغ ہونے کے بعد امی نے دوبارہ وہی موضوع چھڑ دیا میری بیسیوں دلیلوں کے باوجود وہ بابا کو محض ایک بھکاری ماننے پر تلی رہیں۔ فائزہ ہماری باتوں سے اکتا کر اپنے کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے چلی گئی اور پھر بیس بجیں منٹ کے بعد میری ادرازی کی بحث بھی بغیر کسی نتیجے کے اختتام پذیر ہو گئی۔

دن کا بقیہ حصہ میں نے اس پراسرار بابا کے متعلق سوچتے ہوئے گزار دیا، خصوصاً انور کے متعلق اس کا کیا گیا جملہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا میں نے اس جملے کے سر سے آزاد ہونے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انور لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھ رہا ہو مگر اسے بچانے کے لئے میں عملی طور پر کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ گھر میں کوئی بھی میری بات سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں اگر زیادہ

زور دیتا تو وہ یقیناً مجھے باطل قرار دیتے ہوئے کسی باہر نفسیات کو دکھانے کی کوشش کرتے اور یہ مجھے کسی صورت منظور نہیں تھا تاہم میں انور کو متوقع حادثے سے بچانے کے لئے مسلسل سوچ رہا تھا۔

اس مقصد کے لئے میں شام سے تھوڑی دیر قبل کارے کر گھر سے نکل کھڑا ہوا دراصل میں اس بابا کو تلاش کر کے اس جملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا جو اس نے انور کو دیکھ کر کہا تھا میں جانتا چاہتا تھا کہ انور کو کس قسم کا حادثہ پیش آ سکتا ہے؟ ظاہر تو بچپا کے علاوہ کوئی اس کا دشمن نہیں تھا لیکن چچا شاید اس کی جان لینے کی حد تک نہیں جاسکتا تھا، البتہ انور حادثاتی یا طبعی موت سے دوچار ہو سکتا تھا حادثاتی اور طبعی موت کی بے شمار اقسام ہوتی ہیں اور میں بابا کو تلاش کر کے انور کی موت کا سبب معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ حادثاتی موت مرے گا، طبعی موت یا پھر خدا خواستہ وہ کسی شقی القلب شخص کے ہاتھوں مل ہونے والا ہے۔

ایک گھنٹے تک میں شہر کے مختلف پارک اور مارکیٹیں دیکھتا رہا کئی فقیروں کو دیکھ کر مجھے ان پر اسی پراسرار بابا کا گمان گزرا۔ چند ایک فقیروں سے میں نے بابا کا حلیہ بیان کر کے استفسار بھی کیا لیکن کوئی بھی فقیر مجھے بابا کے متعلق نہ بتا سکا۔ آخر کار تھک ہار کر میں نے بابا کی تلاش کا کام صبح تک ملتوی کرتے ہوئے گھر کی راہ لی۔

رات کو کھانے کی میز پر میری ابو سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس جدید کمپیوٹرائزڈ دور میں ایسی دقیقہ نوسی سوچ محض ایک جماعت ہے وہ آدمی کوئی شعبہ بازی ہی ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ابو۔۔۔۔۔ ابو اگر شعبہ باز ہوتا تو کہیں مجمع لگا کر تماشہ دکھاتا، نجومی ہوتا تو کہیں آفس بنا کر پیش گوئیاں کرتا یوں سڑکوں پر اور پارکوں میں نہ گھومتا پھر تا شعبہ ہائے پیہ کمانے کے لئے کئی طرح کے ہتھ کندے آزماتے رہتے ہیں مگر میں نے اس بابا کی آنکھوں میں ایسا کوئی لالچ نہیں دیکھا حالانکہ وہاں

پارک میں موجود کئی لوگوں نے برس نکال کر بن گئے  
ہی اسے پیسے دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے لوگوں  
کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں دی تھی۔  
”تم ابھی بچے ہو سرمد۔۔۔“ اوشیق انداز میں  
بولے۔

”آج کل شعبہ باز دس بیس روپے کو قابل اعتناء  
نہیں سمجھتے، ان کی نگاہ لاکھوں پر ہوتی ہے وہ اگر تمہارے  
سامنے لوگوں سے دس دس بیس بیس روپے لیتا رہتا  
تو پھر تمہیں کیسے متاثر کر سکتا تھا۔ اس نے صرف تمہاری  
ہمدردی حاصل کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کی طرف  
توجہ نہیں دی۔“

”نہیں ابو۔۔۔“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔  
”میرا دل نہیں مانتا کہ وہ کوئی شعبہ باز تھا۔“  
”میں نے اس کی آنکھوں میں سچائی دیکھی  
ہے۔“

”پاکل ہو تم۔“ ابو نے کہا۔  
”وہ فی الحال تمہیں متاثر کرنے کے چکر میں ہے  
۔ جب تم مکمل طور پر اس کے بچھائے ہوئے جال میں  
پھنس جاؤ گے تب تمہیں معلوم ہوگا کہ اس کی آنکھوں  
کی سچائی تو صرف ایک جھوٹ تھا۔ اس وقت تمہیں اس کی  
آنکھوں میں صرف لالچ نظر آئے گا۔“

میں کافی دیر تک ابو سے بحث کرتا رہا لیکن ای کی  
طرح انہیں بھی قائل کرنے میں ناکام رہا۔ اس کے  
بعد ابواٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں نے بھی  
اپنے کمرے کی راہ لی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے خلاف معمول  
تھوڑی دیر تک مطالعہ کیا حالانکہ اس سے قبل میں نے  
رات کے وقت بھی یہی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اپنی  
داستان کے شروع میں، میں یہ بات بتا چکا ہوں کہ  
نصف شب تک دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا میرا  
معمول تھا۔ تاہم اس رات پر اسرار بابا فالے چکر میں  
پھنس کر میں گھر سے باہر نہیں نکلا تھا میرے موبائل فون  
پر دوستوں کی کالز بھی آئی تھیں لیکن میں نے ناسازی

طبیعت کا بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیا تھا۔  
میں خطرناک بہت لالچالی واقع ہوا ہوں، کوئی بھی کام  
نک کر نہیں کرتا، جب بھی ذرا سی سستی یا پوری سستی  
ہوتی ہے تو میں شوق اور لگن سے شروع کیا گیا منصوبہ  
ادھوڑا چھوڑ دیتا ہوں۔

البتہ دو سال قبل میرا ایک شوق ایسا بھی رہا ہے  
جسے میں نے باہر تکمیل تک پہنچا کر چھوڑا تھا وہ شوق تھا  
مارشل آرٹ سیکھنے کا اور میں اسے سیکھ کر ہی رہا۔ آج  
میں مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ ہولڈر ہوں۔ اب تک  
فائننگ کے کئی مقابلے جیت چکا ہوں بات کہاں سے  
کہاں کھل گئی، حالانکہ میں ذکر کر رہا تھا خلاف معمول  
مطالعہ کرنے کا۔

رات کے دس بجے کے قریب میں نے کتاب  
ایک طرف رکھ دی اور پھرٹی وی سپٹ آن کر دیا باقی  
گھر والے ٹی وی لاونج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کرتے  
تھے لیکن میں اپنے بیڈ روم میں دیکھنے کا عادی تھا۔  
ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے کر میں کوئی پسندیدہ چینل  
تلاش کرنے لگا اسپورٹس کے علاوہ میں ایکشن  
اور ہارر موزیز دیکھنے کا بھی شوقین تھا جلد ہی اپنا مطلوبہ  
چینل مجھے مل گیا جس پر ایک بار اور ایڈوچر مودی کے  
ابھی ابتدائی مناظر چل رہے تھے۔ مستقبل بنی پر بنائی گئی  
یہ فلم نہ صرف دل چسپ تھی بلکہ بہت زیادہ تہنشی خیز بھی  
تھی مرکزی کردار ایک لڑکی ادا کر رہی تھی جسے مستقبل  
قریب میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا قبل از  
وقت پتہ چل جاتا تھا تاہم مستقبل میں پیش آنے والے  
واقعات وہ اپنی مرضی سے دیکھنے پر قادر نہیں تھی بس ویسے  
ہی کبھی کبھار سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے یا چلتے پھرتے کسی  
بھی وقت بالکل اچانک چند لمحوں کے لئے اس پر ایک  
خصوص کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور پھر مستقبل کا کوئی  
اہم واقعہ یوں اس کی نگاہوں کے سامنے کھوٹنے لگتا تھا  
جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو ایسی کیفیت میں وہ جس  
کسی کو بھی مصیبت میں گمراہاؤ دیکھتی تھی فوراً اسے آگاہ  
کرنے کے لئے ڈھونڈنا شروع کر دیتی تھی۔

لوگ اس کی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے اس کا  
مذاق اڑاتے لگتے تھے مگر جب لڑکی کی پیشین گوئی سچ  
ثابت ہو جاتی تھی تو اسے لوگ سارہ سمجھنا شروع  
کر دیتے تھے چند ایک مجرم پیشہ لوگ تو ہاتھ دھو کر اس کے  
پیچھے پڑ جاتے ہیں، وہ اس سے اپنے بھرمند منصوبوں  
کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا چاہتے، لیکن لڑکی  
صاف کوئی کامظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اپنی بھوری  
بنادیتی، مجرم اس کا یقین نہ کرتے ہوئے اسے اغوا  
کر لیتے، یہیں سے فلم ایک زبردست اور اہم موڑ لیتی  
ہے اور پھر اپنے انجام تک دیکھنے والے کو سحر کرتی ہے۔  
فلم دیکھنے کے دوران کئی بار میرا دھیان اس  
پراسرار بابا کی طرف بھی گیا تھا بلکہ سچ پوچھتے تو فلم نے  
مجھے سحر کر لیا تھا اور میرے دل میں شدت کے ساتھ یہ  
خواہش اگڑائیاں لینے لگی کہ کاش کسی طرح میں بھی  
مستقبل کے بارے میں جان سکتا اور فلم کے مرکزی  
کردار کی طرح لوگوں کے سامنے پیش گوئیاں کرتا پھرتا  
ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ بار بار میرا خیال اپنے نوکرانور  
کی طرف بھی چلا جاتا تھا جس کے متعلق بابا نے ایک  
جملہ بول کر مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

انہی خیالات میں مستغرق میں نے فلم ختم ہونے  
کے بعد ٹی وی آف کر دیا اور پھر سونے کے لئے  
بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند مجھ سے روٹی رہی اور اس کی  
غالباً دو دو جہات تھیں ایک تو یہ کہ میں معمول سے بہت  
پہلے سونے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا  
دماغ مسلسل اس پر اسرار بابا کے بارے میں سوچ رہا تھا  
جو بہت کچھ جاننے کے باوجود مجھے کچھ بھی بتانا نہیں  
چاہتا تھا۔

امی ابو نے اسے بالکل فراڈ قرار دے دیا تھا  
مگر میں ایسا سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے وہ  
بابا کوئی بہت پہنچا ہوا انسان لگا تھا دیا داری اسے چھو  
کر بھی نہیں گزرتی تھی۔ وہ اگر لاپرواہی یا شہدہ باز یا پھر کوئی  
بہرو پیدا وغیرہ ہوتا تو جب میں نے اس سے اپنے مستقبل  
کے بارے میں پوچھا تھا تو اس وقت وہ مجھ سے ایک

بڑی رقم کا مطالبہ با آسانی کر سکتا تھا لیکن اس نے  
ایسا نہیں کیا تھا۔  
فٹ ہاتھوں پر بیسیوں مستقبل کا حال بتانے  
والے بیٹھے ہوتے ہیں ان میں سے بعض بھاری کوتاہ  
تک معلوم نہیں ہوتا کہ دن، مہینہ اور تاریخ کون سی ہے  
مگر دعوے بڑے بڑے کرتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو فراڈ اور بہرو دیے ہوتے  
ہیں وہ سرعام مستقبل بینی کا دعویٰ کرتے ہیں چالیس  
پچاس روپے لے کر کسی بھی شخص کو اس کے مستقبل کا مکمل  
زائچہ بنا کر دے دیتے ہیں اس کے علاوہ ایسے بھی  
ہوتے ہیں جن کے پاس ہیکٹی کے ذرائع ہیں وہ پرنٹ  
اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے سے ایسے ایسے دعوے  
کرتے ہیں کہ نوحہ باللہ جیسے اللہ تعالیٰ نے مکمل دنیاوی  
امور ان کے حوالے کر دیئے ہوں اور وہ جو چاہیں کرتے  
پھریں، چاہیں تو کسی کو امیر بنادیں اور کسی کو غریب، کسی  
کو بیمار کر دیں اور کسی کو تندرست، مہن پسند شادی سے  
لے کر خاندان اور عدالتی مسائل انہی کے کنٹرول میں  
ہوتے ہیں ایسے بہرو دیوں اور چکر بازوں کی خدمات  
حاصل کرتے وقت کوئی بھی یہ سوچنا گوارا نہیں کرتا کہ  
عالم اگر اتنا ہی پہنچا ہوا ہے تو وہ اپنے حالات سدھار  
نے کے لئے کوئی عمل وغیرہ کیوں نہیں کرتا۔ خود کو امیر  
کیوں نہیں بناتا؟ اپنا دعویٰ اور امریکہ وغیرہ کا ویزہ کیوں  
نہیں لگوا لیتا؟ گا بک کو اس کا مستقبل بتانے والا اپنے  
مستقبل سے کیوں غافل رہتا ہے؟

میں جوں جوں بابا کے متعلق سوچتا گیا میرا یہ  
یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ وہ واقعی کوئی صاحب کشف  
و کرامات شخص تھا، جو اتفاقاً ہی مجھے ٹکرایا تھا اور میری  
بدقسمتی کہ میں اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکا تھا۔

رات دیر گئے تک میں جاگتا رہا اور بے چینی  
کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا پھر کسی نہ کسی طرح مجھے  
نیند آئی گئی۔

عالم خواب میں ایک بار پھر میں اسی پارک میں  
پہنچ گیا میری نگاہیں پارک میں بابا کو تلاش کر رہی تھیں

”آپ کچھ بھی کہیں ماما، لیکن میں کچھ یا کر ہی

آنکھیں بند کرنے کا حکم دے دیا جو میں نے بالآخر د  
مان لیا اور فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جسین و جمیل اور سرسبز و شاداب وادی میں کھڑا ہوا تھا

خوفناک کہانیاں 31

مجھے یہ امید ضرور تھی کہ وہ خود ہی میری بھوک کا احساس



کرتے ہوئے مجھے پھل کھانے کی اجازت دے دیں گے۔

چلتے چلتے ہم دونوں ایک چشمے کے کنارے پہنچ گئے خوب صورت اور رنگ برنگ پتھروں کے اوپر سے گزرتا ہوا چشمے کا پانی اس قدر صاف و شفاف تھا کہ تہہ تک سب کچھ واضح نظر آتا تھا وہ منظر اتنا خوب صورت تھا کہ اس سے قبل کبھی میرے گمان سے بھی نہیں گزرا تھا۔ چشمے کے شفاف پانی کو دیکھ کر میری طبیعت لپٹانے لگی تھی مگر پھر وہی اندیشہ دامن گیر ہو گیا کہ میں اپنی مرضی سے پانی کو چھوؤں گا تو بابا ناراض ہو جائیں گے معصیت تو یہ تھی کہ میں ان سے اجازت بھی نہیں لے سکتا تھا انہوں نے مجھے بولنے سے پہلے ہی منع کر رکھا تھا میری نگاہیں بدستور چشمے کے شفاف پانی پر لگی ہوئی تھیں کہ

اچانک ہی میں شدت کے ساتھ پیاس محسوس کرنے لگا ایسی پیاس میں نے زندگی میں اس سے قبل کبھی محسوس نہیں کی تھی اب میری سب سے بڑی بیک خواہش تھی کہ میں کسی طرح سیر ہو کر پانی پی سکوں میں پانی کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ بالآخر مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے جیسے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

بابا مجھ سے بے نیاز سا ہو کر چشمے کے کنارے موجود پھل دار درختوں کے سامنے نہایت اطمینان کے ساتھ ٹہل رہے تھے انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ ادھر میری پیاس ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی اور مجھے کچھ اس طرح محسوس ہونے لگا کہ اگر میں نے فوراً پانی نہ پیا تو شاید میری سانسیں بند ہو جائیں گی مجھے یوں لگا جیسے سورج کی تمازت ایک دم دوگنی ہو گئی ہو۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر پیشانی پر رکھا تو میری ہتھیلی سینے سے جھیک گئی، مجھے اپنا بدن کسی نادیدہ آگ میں جھلسنا ہوا محسوس ہونے لگا اور دل پہلو میں پوری شدت کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔ اب میری پیاس بالکل ناقابل

برداشت ہو چکی تھی اور میں غیر ارادی طور پر چشمے کے کنارے کی طرف بڑھنے لگا تھا میں اپنی دیرینہ خواہش اور بابا کو بکسر بھول چکا تھا بلکہ سچ کہوں تو اس وقت دو گھونٹ پانی کے بارے میں اپنی زندگی سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار تھا چشمے کے کنارے تک پہنچ کر میں ایک دم پانی کی طرف جھک گیا لیکن مجھے پانی پینے کا موقع نہ مل سکا۔ اچانک ہی میری ساعتوں سے بابا کی ٹوک دار آواز گونجی۔

”رک جاؤ بے وقوف آدمی.....“ وہ میری جانب بڑھتے ہوئے بولے۔

”پہلے یہ پھل کھا لو بعد میں پانی پی لینا۔“  
”لیکن..... بابا! مجھے سخت پیاس لگی ہے میں پہلے پانی پینا چاہتا ہوں۔“ میں نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا۔

”نہیں.....“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔  
”کیا تم بھول گئے ہو کہ تم نے میرا حکم ماننا ہے۔؟“  
میں نے بے چارگی کے عالم میں بابا کی طرف دیکھا تو انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پھل میری طرف بڑھا دیا۔

”کو یہ کھاؤ۔“ اس نے حکیمہ انداز میں کہا۔  
میں نے بلا تردد سیب سے ملتا جلتا پھل ان کے ہاتھ سے لے لیا اور کھانا شروع کر دیا، پھل شکل میں بالکل سیب کی طرح تھا لیکن خاصیت میں نہ صرف سیب سے بہت نرم تھا بلکہ اس کا ذائقہ بھی سیب سے قطعی مختلف تھا، لیکن اور شیریں ذائقہ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ایک ایسا ذائقہ تھا جو اس سے قبل میری زبان نے نہیں چکھا تھا۔

پھل کھاتے ہوئے میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی میں ایک ایسی لذت محسوس کر رہا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

بابا بڑے غور کے ساتھ میرے تاثرات دیکھ رہے تھے، میں نے دیکھتے ہی دیکھتے سالم پھل کھالیا۔ حیرت

انگیز طور پر اب میری بھوک اور پیاس بالکل ختم ہو چکی تھی اب مجھے کبھی بھی چیز کی طلب محسوس نہیں ہو رہی تھی میں اپنے آپ کو مکمل طور پر چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا اور میری مستقبل بینی کی خواہش بھی کہیں پس پرودہ چلی گئی تھی اب میرا دل چاہ رہا تھا کہ چھلانگیں لگا تا ہوا کہیں دور نکل جاؤں اور اس حسین و جمیل وادی کا کوئی نہ کوئی چمکتا پھروں جس کی خوب صورتی نے پہلی ہی نظر میں مجھے مسحور کر دیا تھا۔

بابا میری اس کیفیت سے بے خبر نہیں تھا۔ دیسے بھی اس کے پاس انسان کا باطن ٹٹولنے والی آنکھیں تھیں۔ وہ انسان کے دماغ میں پیدا ہونے والی سوچیں تک پڑھ لیتا تھا۔

”بس اب پانی پی لو۔“ اس نے قدرے توقف سے میری طرف متنی خیر انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جو تم سوچ رہے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔

میرا دل چاہا کہ اس سے پوچھوں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا، لیکن مجھے اس کی تاکید اچھی طرح یاد تھی اس لیے میں چپ چاپ چشمے کے کنارے بیٹھ کر پانی پینے لگا۔ پھل کی طرح پانی کا ذائقہ بھی منفرد تھا۔ ہلکا اور میٹھا میٹھا سا۔ پاس نہ ہونے کے باوجود میں بہت زیادہ پانی پی گیا۔

پانی پی کر میں اٹھا اور واپس بابا کی طرف پلٹا مگر اس دوران وہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی تلاش میں ادھر ادھر گھومیں دوڑا میں اسے آواز میں دیں لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ میں ایک دم پریشان سا ہو گیا۔ ایک لمحے میں وادی کا سارا حسن و جمال میری نگاہوں میں اپنی دقت کھونے لگا۔ اب میں وہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ جگہ میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ نہ جانے وہ وادی دنیا کے کس کونے میں واقع تھی؟ بہر کیف یا کہ جانبِ منتخب کر کے میں روانہ ہو گیا۔

ابھی میں نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اچانک مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میری پلکیں خود بخود

جڑنے لگیں۔ شاید یہ چشمے کے میٹھے پانی کی تاثیر تھی یا پھر اس کا تعلق بابا کی براسرار شخصیت سے تھا۔ میں نے نیند سے لڑنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ دوسرے ہی لمحے میں وہیں چشمے کے نزدیک اونگٹھا ہوا لیٹ گیا اور پھر گہری نیند میں ڈوب گیا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں اپنے بیڈروم میں بستر پر موجود تھا۔ کمرے میں زیر و پا در بلب کی مدہم روشنی بجھ چکی ہوئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ مجھ پر ابھی تک خواب کی کیفیت طاری تھی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میری زبان ابھی تک اس پھل کا ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔

”یہ کیسا خواب تھا؟“ میں نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ معاً میری نگاہ اپنے ہیروں پر پڑی اور میرے بدن میں منشی کی ایک تیز لہر سہایت کر گئی۔ میرے ہیروں میں جو تے موجود تھے۔ تو مجھے مدہم اور لکی سی سرگوشی سنائی دی۔

”سر مد اب تم دنیاوی چکروں میں بالکل نہ پھنسا، بلکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا۔ تمہارا دل پر سکون اور مطمئن رہے گا۔ امید ہے اب تمہیں مستقبل بینی کی خواہش کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

پھر بابا نے حق اللہ کا نعرہ لگا یا اور آواز معدوم ہو گئی۔

آواز کے معدوم ہوتے ہی مجھے قلبی سکون کا احساس ہوا، میری مستقبل بینی کی خواہش اپنا دم توڑ چکی تھی۔ میں اب خود کو ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ اور میں نے تمہیر کر لیا کہ اپنی پوری زندگی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد سے کسی طور غافل نہیں رہوں گا۔

اور اب اس واقعے کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، ہر وقت عمر فریاد کا خیال رہتا ہے، بابا کی ہر وقت یاد آتی ہے، مگر اب بابا نہ ہی خواب میں اور نہ ہی جاگتی آنکھوں سے کہیں نظر آتے ہیں۔

☆☆

# برفانی طوفان

منزلہ محسن۔ کراچی

میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں، لیکن مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ میری بیوی کون ہے اور کہاں ہے..... نا معلوم میری قسمت میں اس سے کبھی ملنا ہے بھی کہ نہیں۔

**ہماری تاریخ کا ناقابل فراموش دور تھا۔**  
1811ء کے اختتام کا ذکر ہے کہ معزز گاوریلا گاوریلوچ اپنی جاگیر نینارادووا میں رہتے تھے۔ علاقہ بھر میں ان کی رحم دلی اور مہمان نوازی کا چرچا تھا۔ ان کے قریبی پڑوسی اکثر ان کے ہاں آتے رہتے تھے، بعض کھانے پینے کے شوق میں، بعض ان کی بیوی کے ساتھ پانچ کوپک کی بازی لگا کر کھیلنے کے لئے، اور بعض ان کی بیٹی ماریا گاوریلووا کے شوق دیدار میں، اس سترہ سالہ نازک اندام دوشیزہ کے بہت سے امیدوار تھے، لوگ جانتے تھے کہ وہ ایک امیر دہن ثابت ہوگی۔ کوئی خود شادی کرنا چاہتا تھا اور کوئی اپنے بیٹے سے اس کی شادی کا خواہشمند تھا۔

ماریا گاوریلووا بچپن سے رومانی فرانسیسی ناول پڑھ پڑھ کر پلی تھی۔ لہذا عشق میں مبتلا تھی، اس کا محبوب ایک غریب اور ادنیٰ فوجی اسر تھا جو چھٹیاں گزارنے اپنے آبائی گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ عشق کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ لیکن جو بیٹی ماریا کے والدین کو اس دور طوفان کا پتہ چلا، انہوں نے بڑی سختی سے اپنی بیٹی کو اس نوجوان کا خیال دل سے نکال دینے کا حکم دیا اور نوجوان سے ان کا برتاؤ اس قدر سرد مہری کا ہو گیا کہ وہ محکمہ آبکاری کا رہائے ہوئے جمنٹریٹ ہو۔

اس پر بھی یہ محبت کے دیوانے کسی نہ کسی طرح کرنے میں کافی ہچکچاہٹ تھی۔ بھاگنے کی سختی ہی

خوفناک کہانیاں [234] اپریل 2018ء



تجوہیزیں پیش ہوئیں اور سترہ دہائیوں مگر آخر کار وہ بھی راضی ہو گئی۔ طے یہ پایا کہ فرار ہونے کے دن وہ کھانے پر نہ جائے اور سر کے درد کا بہانہ کر کے کمرے میں لپٹی رہے۔ اپنی ایک خادمہ کو شریک راز بنالے۔ رات گئے دونوں لڑکیاں بچھلی طرف سے باغ میں اتر جائیں جہاں ان کو گاڑی تیار ملے گی۔ اس میں بیٹھ کر وہ نینارادووا سے پانچ کوس دور ژادریو کے گاؤں میں پہنچ کر سیدھی گرجا گھر کے سامنے جا اتریں۔ وہاں ولادیمیر ان کا منتظر ہوگا۔

بھاگنے سے ایک دن پہلے ماریا گاوریلووا رات بھر نہ سوئی، کچھ دیر تو ساتھ لے جانے کے لئے کپڑے وغیرہ رکھتی رہی، پھر ایک طویل دور بھر خط اپنی ایک جذباتی سہیلی کے نام لکھا۔ ایک اور خط اپنے والدین کو لکھا جس میں اس نے نہایت برا اثر انداز میں ان سے رخصت چاہی اور لکھا کہ جذبہ عشق سے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھا رہی ہوں۔ لیکن سچی خوشی مجھے اس

وقت ہوگی جب آپ معاف کر کے اپنے قدموں پر سر جھکانے کی اجازت دیں گے۔ پھر اس نے دونوں خطوں پر شہر تو لا کی بنی ہوئی مہر لگائی جس پر ایک باموقع تحریر کے اوپر دو بھڑکتے ہوئے دل کندہ تھے، دن نکلنے سے پہلے وہ بڑھ حال ہو کر بستر پر گر پڑی اور کچھ دیر کو اس کی آنکھ جھپک گئی۔ مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ڈراؤنے خواب دیکھ کر چونک اٹھی۔ کبھی دیکھتی کہ گر جا جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے اس کا باپ عین وقت پر آ جاتا ہے اور اسے ایک اٹھارہ تارک غار میں پھینک دیتا ہے، وہ نہایت تیزی سے نیچے کی طرف گر کر جا رہی ہے اور جیسے اس کے دل کی حرکت بند ہونے کو ہے دوسری دفعہ سوئی تو اس نے ولادیمیر کو خون میں شرابور نیم جان گھاس پر پڑے دیکھا مرنے مرنے وہ بڑے دغراش لہجے میں شادی میں جلدی کرنے کی التجا کرتا ہے۔ اس طرح کے بے ربط خوفناک ہولوے خواب میں اس کی نگاہوں کے

خوفناک کہانیاں [235] اپریل 2018ء

سانے سے گزرتے رہے۔

آخر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا تھا اور سر میں جھج جھج درد شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی حالت دیکھ کر شکر ہو گئے اور بہت محبت سے پوچھا ماما کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟ ان کی دلجوئی دل پر برقی کی طرح لگی اس نے چاہا کہ ان کی فکر دور کرنے کو چہرے پر خوشی پیدا کر سکے مگر کامیاب نہ ہو سکی شام ہوئی تھی اس کے دل میں اس خیال سے ہوک اٹھ رہی تھی کہ خاندان والوں کی محبت بھری آغوش میں یہ اس کی آخری شام ہے اس کا دم جیسے گھٹ جا رہا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی جانی بچانی ہر چیز کو الوداع کہا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور ماں باپ کو شب بخیر کہا۔ انہوں نے حسب معمول پیار کیا اور دعا مانگیں دیں۔ ماریا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے بڑی مشکل سے کمرے تک پہنچی اور دروازہ بند کرتے ہی کرسی پر بے قابو ہو کر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خادمہ نے اسے تکی نشینی دی جانے کی سب تیاریاں مکمل تھیں ادھا گھنٹے بعد ماما اپنے والدین کے گھر اپنے کمرے اپنی بچپن کی الوداع دے کر زندگی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والی تھی۔ باہر طوفانی برقیاری ہو رہی تھی ہوا غرار تھی تھلی تھلیاں چرچرائی تھیں اسے یہ سب چیزیں کسی بدشگونی کی علامتیں معلوم ہو رہی تھیں کچھ دیر میں سارا گھر نیند کے جادو میں مدھوش ہو گیا۔ ماما نے سر پر شال اوڑھی گرم لہادہ لپیٹا اپنے زیور کا صندوقچہ اٹھایا اور پچھلے دروازے سے باہر نکل آئی۔ پیچھے پیچھے خادمہ ہاتھ میں دو پارسل اٹھائے تھی دونوں بارغ میں پہنچیں طوفان کی تیزی میں ذرا کی نہ ہوئی تھی منہ پر ہوا کے تھپڑے تو عمر بھرم کو گناہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ غرض وہ بمشکل بارغ کے دوسرے سرے تک پہنچیں سڑک پر سب ان کے انتظار میں کھڑی تھی، کھوڑے سردی سے ٹھس ہو چکے تھے اور

دوڑنے کے لئے بے قرار ہو کر ٹاپیں مار رہے تھے۔ ولادیمیر کا کوچوان گاڑی کے بھوس کے سامنے ٹھل رہا تھا تاکہ کسی طرح جو شیلے کھوڑوں کو قابو میں رکھ سکے۔ اس نے سہارا دے کر ماریا اور اس کی خادمہ کو گاڑی میں بٹھایا۔ ہنڈل اور صندوقچہ اندر رکھا لگا میں تھا تھے ہی کھوڑے سڑک پر سر پٹ دوڑنے لگے اب ہیرڈن کو قسمت اور کوچوان تریسکا کی مہارت کے سپرد کر کے ہم نو جوان عاشق کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں۔ ولادیمیر دیر بھر ادھر ادھر مارا مارا بھرتا رہا۔ صبح کو پہلے تو ڈاؤرینو کے پادری صاحب کے پاس گیا اور ان کو بڑی مشکل سے شادی کی رسم ادا کرنے پر راضی کیا۔ پھر وہ گواہوں کی تلاش میں آس پاس کے زمینداروں کے ہاں جانے کے ارادہ سے نکلا۔ سب سے پہلے وہ دراوون نامی ایک چالیس سالہ ریٹائرڈ عہدیدار کے ہاں گیا جو فوراً گواہی دینے پر راضی ہو گیا اور کہنے لگا کہ اس تذکرے سے مجھے پرانے زمانے کی فوجی زندگی کی ہنگامہ خیزیاں یاد آئیں۔ اس نے ولادیمیر کو کچھ دیر ٹھہرنے اور اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت بھی دی اور یقین دلایا کہ اسے بقیہ دو گواہ بھی باآسانی مل جائیں گے اور ہوا بھی یہی، کھانے کے فوراً بعد انسپکٹر اراشی صمت موہنچیں چڑھائے ہمیز لگائے قصبہ کے پولیس انسپکٹر کے بیٹے کے ہمراہ داخل ہوئے یہ نو جوان جس نے عمر کی سولہ بہاریں دیکھیں تھیں حال ہی میں الائنز کی رجمنٹ میں بھرتی ہوا تھا جب انہوں نے ولادیمیر کی درخواست سنی تو نہ صرف وہ خوشی سے گواہ بننے پر راضی ہو گئے بلکہ یہاں تک کہا کہ وہ اس کی خاطر جان تک دینے میں دریغ نہ کریں گے۔ ولادیمیر جوش و خروش کے ساتھ ان سے گلے ملا اور خوش خوش باقی تیاریاں کرنے اپنے گھر چل دیا۔

شام کا دھندلکا چھا چکا تھا اس نے اپنی تین کھوڑوں کی گاڑی اپنے معتمد تریسکا کے ساتھ مکمل ہدایات دے کر نینار ادو وار روانہ کی اور خود اپنی چھوٹی ایک کھوڑے کی برف گاڑی لے کر ڈاؤرینو کی طرف

روانہ ہو گیا جہاں دو گھنٹے بعد ماریا کا دریلوونا کے آنے کی امید تھی۔ راستہ اس کا جانا پوچھا تھا زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں وہ منزل مقصود تک پہنچ سکتا تھا۔

لیکن ولادیمیر گاڑوں سے باہر نکلا ہی تھا کہ ہوا میں تندی پیدا ہوئی اور برفانی طوفان نے وہ شدت اختیار کی کہ ولادیمیر کو کچھ نظر نہ آتا تھا منٹ بھر میں سڑک پر برف کی تہہ بچھ گئی اور ارد گرد کی سب چیزیں ایک بے نور پہلے دھندلکے میں ڈوب گئیں جس میں برف کے سفید گالے تیر رہے تھے زمین اور آسمان مل کر ایک ہو گئے۔ اسے میں ولادیمیر کو احساس ہوا کہ اس کی گاڑی کسی کھیت میں گھس گئی ہے اس نے دوبارہ سڑک پر گاڑی ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ کھوڑا کسی نامعلوم سمت میں اڑا چلا جا رہا تھا کبھی برف کے تودوں میں جا پھنستا، کبھی کسی گڑھے میں بھٹک جاتا۔ ہر لمحہ گاڑی الٹ جاتی تھی ولادیمیر کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ راستے کا سراغ نہ کھو جائے۔ اسی حالت میں (اس کے خیال میں) آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر وہ ڈاؤرینو کے جنگل تک نہ پہنچ سکا دس منٹ اور گزر گئے لیکن پھر بھی درختوں کا جھنڈ نہ دکھائی دیا اب وہ ایک ایسے کھلے میدان میں جا پہنچا تھا جہرے گہری گھاٹیوں نے آڑاڑ چھا کاٹ رکھا تھا طوفان اسی شدت سے جاری تھا آسمان بادلوں سے چھپا ہوا تھا کھوڑا تھک چکا تھا اور ولادیمیر برف میں کمر تک دھنسا ہوا ہونے کے باوجود پسینے میں شرابور تھا۔

بہت دیر بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ بالکل غلط طرف جا رہا ہے اس نے لگام ڈیلی چھوڑ دی اور اندازہ کرنا چاہا کہ وہ کس طرف ہے اور اب اسے کدھر مڑنا چاہیے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اسے دائیں ہاتھ کی طرف مڑنا چاہیے تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اسی طرف چل پڑا۔ کھوڑا بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح راستے پر ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا۔ اور اس نے سوچا کہ اب ڈاؤرینو زیادہ دور نہ ہوگا وہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ ان کھیتوں کا کہیں

اختتام ہی نہیں ہے۔ ہر طرف برف کے انبار اور گھاٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا ہر قدم پر گاڑی الٹ الٹ جاتی تھی اور ولادیمیر ہر بار گاڑی کو ٹھیک اور سیدھا کرتا تھا۔ وقت گزرتا گیا ولادیمیر کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

بہت دیر بعد اسے افق پر ایک سیاہ دھبہ نظر آیا، ولادیمیر نے فوراً کھوڑے کا رخ ادھر موڑ دیا نزدیک آیا تو اسے ایک جنگل دکھائی دیا اس نے یہ سمجھ کر کہ اب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچ گیا ہے خدا کا شکر ادا کیا، کھوڑے کو تیز کیا تاکہ جلد از جلد جنگل کو پار کر کے دوسری طرف جانی بچانی سڑک پر پہنچ جائے جہاں سے وہ بھٹک گیا تھا۔ اسی سڑک کے دوسری طرف ڈاؤرینو تھا چند منٹ میں وہ سڑک پر پہنچ گیا گاڑی موسم سرما کے بے برگ وبار درختوں کے اداس سایوں کے نیچے چلنے لگی یہاں ہوا کا زور کم تھا سڑک ہموار تھی کھوڑے میں بھی کچھ دم آ گیا تھا اور ولادیمیر کے حواس بھی کچھ درست ہوئے۔

وہ یونہی بڑھتا گیا مگر حد نظر تک ڈاؤرینو کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جنگل کی طرح شمع ہونے میں نہ آتا تھا ہر ٹھوڑی دیر بعد اسے اس خیال سے وحشت ہونے لگتی کہ اب وہ کسی اور انجانے جنگل میں بھٹک گیا ہے۔ پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں اس نے کھوڑے کو بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ بے چارہ کھوڑا پہلے تو بوکھلا کر سر پٹ بھاگا مگر چندہر منٹ بعد تھک کر پھر قدم قدم چلنے لگا اور پھر مصیبت زدہ ولادیمیر کی انتہائی کوشش پر بھی اس کی رفتار میں جتنی پیدا نہ ہوئی۔

رفتہ رفتہ جنگل چھٹ گیا مگر جب ولادیمیر باہر نکلا تو بھی ڈاؤرینو نظر نہ آیا۔ اسے یقین تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس نے اندھا دھند گاڑی چلائی شروع کر دی۔ طوفان ٹھم چکا تھا بادل اڑ گئے تھے حال تک سفید برف سے ڈھکا ہوا میدان لہریں لے رہا تھا۔ رات خاصی روشن تھی دفعتاً ذرا فاصلے پر اسے ایک چھوٹی سی بستی نظر



آئی گھوڑے کو تیز کر کے اس کے قریب پہنچا اور پہلے  
جھوپڑے کے قریب گاڑی سے کود پڑا اور کھڑکی کا پٹ  
دھڑ دھڑ لگا منٹ بھر بعد چوٹی چھلکی کھلی اور ایک  
بوڑھے آدمی نے سفید واڑی باہر نکال کر کھانکا کیا کام  
ہے؟ کیا ڈاڈر بیٹو یہاں سے بہت دور ہے؟ نہیں زیادہ  
دور نہیں ہے، کوئی دس کوس ہوگا، یہ سن کر ولادیمیر نے  
اپنے سر کے بال توجہ لئے۔ اس وقت اس کی حالت  
اس آدمی کی سی تھی جس نے مزائے موت کا حکم سنا ہو۔  
”تم کہاں سے آ رہے ہو؟“ مگر ولادیمیر کی  
جواب دینے کی طاقت گویا سلب ہو چکی تھی بڑے میاں  
کیا مجھے ڈاڈر یونٹک جانے کے لئے گھوڑا مل سکتا ہے۔  
”لہجی ہمارے ہاں کیا گھوڑے بندھے ہوئے ہیں؟“  
اچھا کوئی مجھے وہاں کا راستہ دکھا سکتا ہے؟ میں اسے منہ  
مالکا انعام دوں گا۔ ایک منٹ ٹھہرا اس نے کھڑکی بند  
کرتے ہوئے کہا ”میں اپنے بیٹے کو بھیجتا ہوں وہ تمہیں  
راستہ بتا دے گا۔“ ولادیمیر انتظار کرنے لگا لیکن اسے  
ایک منٹ گزرتا مشکل ہو رہا تھا اس نے پھر کھڑکی پر  
ہاتھ مارا کھڑکی کھلی اور وہی سفید واڑی وہ پارہ نمودار  
ہوئی کیا ہے تمہارا بیٹا کہاں رہ گیا؟ ابھی آتا ہے ذرا  
جو تے پکھن رہا ہے۔ اندر آ جاؤ اگر سردی لگ رہی ہو تو  
آگ تاپ لو۔ نہیں..... نہیں مجھے بہت جلدی ہے اپنے  
بیٹے کو مجھ کو جلدی سے۔

دروازہ چرچا رہا اور ایک نو جوان لڑکا سونٹا ہاتھ  
میں لئے باہر نکلا اور آگے آگے چلے گا کبھی وہ اشارے  
سے راستہ دکھاتا، کبھی رک کر راستے کا کھوج لگاتا  
کیونکہ برف نے سب نشانات مٹا دیے تھے ولادیمیر  
نے اس سے وقت پوچھا۔ صبح ہونے والی ہے وہ بولا یہ  
سننے ہی ولادیمیر کی زبان لنگ ہو گئی۔

جب وہ ڈاڈر بیٹو پہنچے تو سرخ یا رنگ دے رہے  
تھے۔ پھو پھوٹ چکی تھی مگر جا کے دروازے میں تالا پڑا تھا  
ولادیمیر نے رہبر کو انعام دیا اور پارسی کے گھر کی  
طرف چل پڑا۔ مگر گاڑی وہاں بھی نہ تھی پتہ نہیں آگے  
کیا ہونے والا تھا۔

اب ہم نینار ادودا کے کینوں کی طرف لوٹتے  
ہیں تاکہ دیکھیں کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔  
مگر وہاں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ لوگ  
حسب معمول اٹھے ماریا کے معمر والدین روز کے  
معمول کے مطابق ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔  
ماریا گاوریلا گاوریلا دوچ شب خوانی کی فونی اور فلاپین  
کی واسکٹ پہنے ہوئے تھے اور پراسکودیا پتروونا روٹی  
کے فرغل میں ملیں تھیں سادہ کمرے میں لا کر رکھا گیا  
گاوریلا گاوریلا دوچ نے ایک خادمہ سے کہا کہ جا کر  
ماریا گاوریلا دوچ کی طبیعت پوچھو اور معلوم کرے کہ ان  
کورات کو کیسی نیند آئی؟ خادمہ ذرا دیر بعد واپس آئی  
اور کہنے لگی کہ بی بی کو نیند تو اچھی طرح نہیں آئی مگر  
طبیعت بہتر ہے وہ ابھی نیچے آ رہی ہیں اسی وقت  
دروازہ کھلا اور ماریا گاوریلا دوچ نے داخلہ کر اپنے  
والدین کو سلام کیا۔

ماشائیں تھارے سر کا رداب کیسا ہے؟ گاوریلا  
گاوریلا دوچ نے پوچھا، بہتر ہے پاپا، اس نے جواب  
دیا، کل دیر تک آتشزدگی کے پاس بیٹھے رہنے سے سر  
میں درد ہوا ہوگا، پراسکودیا پتروونا نے کہا شاید یہی بات  
ہو ماں، ماشائے نہا۔

دن بخیر و خوبی گزر گیا مگر رات کو ماشائیں پڑ گئی  
قریب کے قصبے سے ڈاکٹر کو بلوایا گیا جو اگلے دن شام  
ہوئے وہاں پہنچا اس وقت تک ماشائیں سرسائی کیفیت  
ہو چکی تھی۔ بخار بہت تیز تھا غریب لڑکی دو ہفتے تک  
موت اور زندگی کی گیمس میں مبتلا رہی۔

گھر میں کسی کو اس کے فرار ہونے کا علم نہ تھا ماشا  
نے جانے سے پہلے جو خط لکھے تھے واپس پر جلا دیے  
ماشائیں خادمہ نے اپنے آقا کے ڈرے کسی کے سامنے  
ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا پارسی، ریٹائرڈ فوجی  
عہدیدار مچھوں والا اسپتال اراضی اور نو جوان فوجی بھی  
اپنی اپنی مصیحتوں سے خاموش تھے یہاں تک کہ سائیں  
تربشکا کے منہ سے بھی کبھی کوئی بات نہ نکلی، نشے کی  
حالت میں بھی نہیں اور اس طرح یہ راز جس میں چھ

سات آدمی شامل تھے رازی رہا لیکن ماریا گاوریلا دوچ  
نے اپنی طویل ہڈیانی حالت میں خود ہی یہ راز اگل دیا  
مگر اس کی باتیں اتنی ناقابل فہم تھیں کہ اس کی ماں جو  
دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں صرف اتنا  
سمجھ سکیں کہ ان کی بیٹی ولادیمیر نیکولائے دوچ سے بے  
تحاشہ محبت کرتی ہے اور شاید یہ محبت ہی اس کی بیماری  
کی جڑ ہے۔ اس نے اس بات کا اپنے شوہر سے ذکر کیا  
انہوں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا اور سب کی سبھی  
راے ہوئی کہ شاید لڑکی کی قسمت میں یہی لکھا ہے اور  
تقدیر کے لکھے سے کوئی مفر نہیں انہوں نے اپنے دل کو  
یہ کہہ بھی سمجھایا کہ مفلسی کوئی جرم نہیں اور زندگی  
روپیوں کی تحصیل کے ساتھ نہیں گزاری جاتی بلکہ انسان  
کی رفاقت میں بسر ہوتی ہے۔ غرض اس قسم کے اور  
سب فرسودہ قول دہرائے گئے جو ایسے موقعوں پر کام  
آتے ہیں جب ہم اپنے فیملوں کی اور کوئی توجیہ نہیں  
کر سکتے۔

اسی دوران میں لڑکی رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے  
لگی ولادیمیر بہت عرصے سے گاوریلا گاوریلا دوچ کے  
ہاں نہ آیا تھا کیونکہ وہ ان لوگوں کے برتاؤ سے کافی  
خائف ہو چکا تھا۔ اب اسے ایک دن خاص طور پر بلایا  
گیا اور ماشائے شادی کی غیر متوقع خوشخبری سنائی گئی۔  
نینار ادودا کے مالکوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب  
جواب میں انہیں اس نو جوان کا ایک نیم جھوٹا خط ملا  
جس میں اس نے لکھا تھا کہ آئندہ کبھی وہ ان کی دلہیز پر  
قدم نہ رکھے گا اور یہ کہ وہ اس قسمت کے ستارے  
بد نصیب کو بالکل بھول جائیں جس کے لئے اب  
سوائے موت کے کوئی چارہ نہیں..... چند دن بعد سنا گیا  
کہ وہ واپس فوج میں چلا گیا ہے یہ واقعہ 1812ء کا  
ہے۔

زمانہ گزرتا رہا، کسی کو بیمار ماشا کے سامنے اس  
واقعہ کا ذکر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خود ماشائے بھی  
ولادیمیر کا نام تک زبان سے نہ نکالا کئی مہینے بعد اتفاق  
سے اس نے ان لوگوں کی فہرست دیکھی جنہیں یورڈینو

کی جنگ میں جابازاری کے انعام میں تمغے عطا ہوئے  
تھے اور جو خطرناک طور پر زخمی ہو گئے تھے اس فہرست  
میں ولادیمیر کا نام دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گئی۔ سب کو  
اندیشہ ہوا کہ کہیں پھر بخار نہ رہے لگے مگر شکر ہے کہ اس  
بے ہوشی کا کوئی خطرناک نتیجہ نہیں نکلا۔

چند ہی دنوں بعد اس غریب کو ایک اور صدمہ پہنچا  
پڑا یعنی اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اب وہ ساری  
جائیداد کی تہا دار تھی مگر اس ورثے سے اسے کوئی  
خوشی نہ ہوئی۔ اس کا دل اپنی غمزدہ ماں کی بیوی کے دکھ  
سے اتنا مقرر تھا کہ اس نے جہیز کر لیا کہ کبھی اس سے  
جدانہ ہوگی۔ نینار ادودا سے بہت سی زمینیں یادیں وابستہ  
تھیں اس لئے دونوں ماں بیٹیاں وہاں سے اپنی جائیداد  
کے ایک گاؤں میں رہنے چلی گئیں۔

وہاں بھی اس حسین امیر زادی کے گرد  
امیدواروں کا ایک جھلکٹ ہو گیا مگر اس نے کبھی کسی کی  
ہمت افزائی نہ کی اس کی ماں اکثر اس کو زندگی کا ساشی  
چھنے پر اکساتی تھی تو ماریا گاوریلا دوچ سارے بھلا کر خاموش  
ہو جاتی۔ ولادیمیر اب اس دنیا میں نہ تھا جس دن  
فرانسیسی ماسکوس داخل ہوئے اس شام اس نے دم توڑ  
دیا۔ ماشائے اس کی یاد کی مقدس سرمائے کو سینے سے لگا  
رکھا تھا اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی یاد کا محفوظ ٹکڑا۔ اس  
کی کتابیں، اس کی بیانی ہوئی تصویریں، اشعار اور  
موسیقی جو اس نے ماریا کے لئے نقل کئے تھے سب جوں  
کے جوں محفوظ تھے جب ہمایوں کو اس بات کا علم ہوا تو  
وہ اس وفات پر سخت پر دکھ رہ گئے اور سوچنے لگے کہ ما معلوم  
وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس پاکباز آئرس کی  
سوگوارا نہ وفا شعاری پر فخر پائے گا۔

اسی دوران میں جنگ ختم ہو گئی اور ہماری فتیاب  
فوجیں دوسرے ملکوں سے واپس آنے لگیں۔ بیڑ پر  
مفتوح دشمن سے جھپٹے ہوئے نغموں ”ویو ہنری کاتر“  
ترویلیر والٹر اور لا گوئو کی دھنیں بجائی جانے لگیں۔  
افسر جو بھرتی کے وقت محض کس لڑکے تھے میدان جنگ  
سے پختہ کار اور با شعور ہو کر بہادری کے تحفے سینوں پر

لگائے واپس لوٹے ہر طرف فوجی خوش خوش آپس میں چہلیں کرتے تو ان کی گفتگو میں فرانسسی اور جرمن لفظوں کی آمیزش ہوتی وہ بھی کیسے ناقابل فراموش دن تھے اچ کا سرانی کے دن! ہر روزی کا دل لفظ وطن کی پکار پر کس شدت سے دھڑکتا تھا برسوں کی جدائی کے بعد ملاقات کے آنسو کس قدر شیریں تھے سب رویوں کے دل میں قوی فخر و مباہات اور ذرا کی محبت کا جذبہ ہم معنی ہو چکا تھا اور خود زار کے لئے یہ لمحہ کس قدر محبوب آفریں تھا!

اور اس زمانے میں روسی عورتوں کی دلوازی بے مثال تھی ان کی فطری سردمہری غائب ہو چکی تھی وہ خوشی کے نشے میں سرشار تھیں جب وہ فاتح نو جوانوں سے ملتیں تو اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھال اچھال کر لرزے بلند کرتیں۔

اس زمانے کا کوئی فوجی انرا ایسا نہیں جو یہ نہ مانے کہ اس کی جانبازی کا سب سے بیش قیمت صلہ کسی روسی نازنین کا سر ہون منت تھا۔

اس خیرہ کن زمانے میں ماریا گاور یلیوونا اپنی ماں کے ساتھ ”خ“ میں رہتی تھی اس نے وہ جوش و خروش نہیں دیکھا جو فوجوں کی آمد کے جشن پر دونوں دارالحفاظوں میں تھا لیکن ہر طرف ایک عام جوش پھیلا ہوا تھا جو گاؤں میں شہروں سے بھی بڑھ گیا تھا ان جگہوں میں کسی افسر کا نظر آنا ایک شاندار واقعہ تھا اس کے سامنے اور نو جوانوں کی کوئی بات تک نہ پوچھتا۔

ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ باوجود سردمہری کے ماریا گاور یلیوونا چاہنے والوں کے مجمع میں گہری رہتی تھی مگر اس زمانے میں ایک ذہنی فوجی افسر جس کا نام کرل برسن تھا اس علاقے میں آیا اور چند ہی دنوں میں اور سب نو جوان پس پشت پڑ گئے۔ اس کے سینے پر سینٹ جارج کا تمغہ آویزاں تھا اور مقامی نو جوان لڑکیوں کے خیال میں اس کے چہرے کی رنگت میں ایک دلکش زردی تھی۔ اس کی عمر کوئی پچیس سال کی ہوئی وہ چشموں میں اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کرنے آیا

تھا جو ماریا گاور یلیوونا کی جاگیر کے بالکل قریب تھی۔ ماریا گاور یلیوونا بھی اس کے ساتھ کچھ خصوصیت برتی تھی۔ اس کی موجودگی میں ماریا کے چہرے کی عکسین گفتگو میں تبدیل ہو جاتی اور گواس کے انداز میں مشوہ و ناز کا شائبہ تک نہ تھا مگر کوئی شاعر اس کو دیکھتا تو کہہ اٹھتا ”اگر یہ محبت ہیں تو کیا ہے؟“

برسن کی شخصیت بڑی دلاویز تھی اس کی طبیعت اس قسم کی تھی جو عورتوں کے لئے خاص طور پر پرکشش ہوتی ہے شائستہ اور بااخلاق فصیح اور بناوٹ سے پاک، ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی شرافت کی چاشنی انداز میں۔ ماریا گاور یلیوونا کے سامنے اس کے انداز میں نہایت سادگی ہوتی مگر وہ جو کچھ کہتی جہاں کہیں جاتی برسن کا خیال اور نظریں اس کا پیچھا کرتے بظاہر وہ بڑا خاموش طبیعت اور محتاط تھا لیکن یہ افواہ کسی کوئی تھی کہ کسی زمانے میں وہ بڑا مچھلا تھا مگر ماریا گاور یلیوونا کی نظروں میں اس وجہ سے اس کی قدر کچھ کم نہ ہوئی کیونکہ اور نو جوان لڑکیوں کی طرح وہ بھی گرمی جذبات اور جرأت کی ماحر تھی۔

مگر جس چیز نے ماریا کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ برسن کا شریفانہ انداز، مزاحیہ اور دلچسپ گفتگو، چہرے کا دلکش حزن اور ذہنی بازو نہ تھا بلکہ وہ ضبط اور جھجک تھی جو برسن کے انداز سے ظاہر تھی۔ ماریا گاور یلیوونا کو یقین تھا کہ برسن کے دل پر محبت کا نقش پڑ چکا ہے دوسری طرف برسن بھی اپنی فراست اور تجربے کی مدد سے یہ جانتا تھا کہ ماریا گاور یلیوونا اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہے اسی لئے ماریا گاور یلیوونا کو حیرت تھی کہ آج تک برسن نے اس کے قدموں پر جھک کر اظہار محبت کیوں نہیں کیا۔ کس خیال نے اسے روک رکھا ہے؟ یہ بھی محبت کی بے زبانی تھی یا خودداری اور تکبر، یا تجربے کا رکھل کھیلے ہوئے مرد کی عیاری، وہ ماریا گاور یلیوونا کے لئے معصہ بنا ہوا تھا۔ آخر بڑے غور و فکر کے بعد اس نے یہی طے کیا کہ پاس محبت ہی برسن کو اظہار جذبات سے روکے ہوئے ہے چنانچہ اس کی

ہمت افزائی کرنے کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ اور بھی خصوصیت کا اظہار کرے گی بلکہ موقع پڑنے پر قہوڑے بہت التفات سے پیش آئے گی۔ اس نے ایک ایسی تجویز سوچی جو بالکل غیر متوقع ہوگی اور جو برسن کو اپنے دل کا حال کہنے پر مجبور کر دے گی۔ عورت کے دل کو معصوں سے بڑی آنکھن ہوتی ہے خیر ماریا گاور یلیوونا کی یہ کوششیں اس قدر کامیاب ہوئیں کہ برسن ہر وقت کسی خیال میں کھویا کھویا رہنے لگا اس کی نگاہ شوق اس والہانہ انداز سے ماریا گاور یلیوونا کے چہرے کی باتیں لیتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ کن لمحہ آچنچا ہے۔ پڑوسیوں میں شادی کا تذکرہ اس طرح ہونے لگا گویا یہ کوئی طے شدہ بات ہو، نیک دل پر اس کو یوا پترونا بھی خوش تھیں کہ آخر ان کی بیٹی نے اپنے لئے ایک لائق برجن لیا۔

ایک دن معمر خاتون ڈرائنگ روم میں تاش پھیلائے ٹیبلٹس کھیل رہی تھیں کہ برسن داخل ہوا اور ماریا گاور یلیوونا کے متعلق پوچھا۔ ”وہ بارخ میں ہے“ معمر خاتون نے جواب دیا۔ ”تم وہی چلے جاؤ میں یہاں تم دونوں کا انتظار کرتی ہوں۔“ برسن باہر چلا گیا۔ بڑی بی نے مارے خوشی کے اپنے پر صلیب کا نشان بنایا، انہیں یقین تھا کہ آج سب معاملہ طے ہو جائے گا۔

برسن نے دیکھا کہ ماریا گاور یلیوونا سفید لباس میں ملبوس ٹالاب کے کنارے بید بخنوں کے درخت کے سائے میں کتاب پڑھ رہی ہے۔ بالکل جیسے کسی نادل کی ہیروئن ہو، معمولی علیک سلیک کے بعد ماریا گاور یلیوونا جان بوجھ کر خاموش ہو گئی۔ اس خاموشی نے دونوں کے درمیان جھجک اور ہلکی سی گھبراہٹ پیدا کر دی جس کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ برسن اپنی محبت کا اظہار کر دے اور ہوا بھی یہی، برسن کو اس وقت کی خاموشی کے بے شک پن کا احساس تھا۔ ایک دم اس کی زبان کو کو بائی مل گئی۔ اس نے کہا کہ مدت سے وہ ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب وہ اپنا حال دل

ماریا گاور یلیوونا کے سامنے بیان کر سکے۔ پھر اس نے اکتیا کی لمحے بھر کے لئے اس کی بات توجہ سے سنے۔ ماریا گاور یلیوونا نے کتاب بند کر دی اور آنکھیں جھکا کے اسے عرض شوق کی اجازت دے دی۔

”مجھے تم سے محبت ہے، انتہائی محبت ہے“ (ماریا گاور یلیوونا کے گال شرم سے چمٹانے لگے اور سر اور بھی جھک گیا) میں نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی، میں جانتا ہوں کہ تمہیں روز دیکھنے اور تمہاری شیرین گفتگو سننے کی آرزو میری بڑی نادانی تھی۔ (ماریا گاور یلیوونا کو سینٹ پرے کے پہلے خط کا خیال آیا) مگر آہ اب بہت دیر ہو چکی ہے، اب میں اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتا۔ تمہاری یاد، تمہاری حسین اور بے مثل تصویر ہمیشہ میرے دل پر نقش رہیگی، جو میری زندگی کی واحد خوشی بھی ہوگی اور رنج کا باعث بھی اب مجھے ایک ناخوشگوار فرض اور انجام دینا ہے میں ایک راز تمہارے سامنے کھولنے پر مجبور ہوں جو ہمارے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دے گا۔ ماریا گاور یلیوونا نے بڑی بے ثباتی سے اس کی بات کا ٹی یہ رکاوٹ تو ہمیشہ سے موجود تھی میں تمہاری کبھی نہیں ہو سکتی مجھے معلوم ہے اس نے بڑی ملامت سے جواب دیا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کسی اور سے محبت کرتی تھیں لیکن موت نے تین سال ہوئے تمہیں اس سے جدا کر دیا مگر بیماری رحل ماریا گاور یلیوونا زندگی میں صرف ایک خوش فہمی میرے لئے تسکین کا باعث ہو سکتی ہے اس سے مجھے محروم نہ کرو، مجھے اس خوش فہمی سے نہ نکالو کہ شاید تم میری خوشی کی خاطر میری بات مان جاؤں اگر ذرا خاموشی سے میری بات سنو، میں اکتیا کرتا ہوں کہ ذرا خاموش رہو۔ آف مجھے کس قدر رازیت ہو رہی ہے مجھے معلوم ہے مجھے امید ہوتی ہے کہ تم میری ہو سکتی تھیں لیکن..... میں بڑا بد قسمت ہوں کیونکہ میری شادی ہو چکی ہے۔

ماریا گاور یلیوونا حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ میری شادی ہو چکی ہے اس نے اپنی بات جاری رکھی میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں لیکن مجھے یہ نیک

معلوم نہیں کہ میری بیوی کون ہے اور کہاں ہے نامعلوم میری قسمت میں اس سے بھی ملنا ہے بھی کہ نہیں۔  
کیا مطلب؟ ماریا گادریلو وانا نے تعجب سے پوچھا عجیب بات ہے پوری بات بتاؤ، میں بھی پھر قصہ سناؤ مگر تم خدا را بتاؤ پھر کیا ہوا۔

1812ء کے شروع کی بات ہے برمن نے کہا میں جلدی میں ولنا چار ہاتھ جہاں ہمارا فوجی دستہ ٹھہرا تھا اس دفعہ میں رات کو ایک چوکی پر پہنچا میں نے حکم دیا کہ فوراً گھوڑے جو تھے جائیں لیکن اسی وقت طوفانی ہوا چلنا شروع ہوئی داروغہ اور کوچوان دونوں نے مجھے انتظار کرنے کا مشورہ دیا میں نے ان کی بات تو مان لی پر ایک عجیب سی بے چینی مجھ پر طاری ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے کوئی یوں ہی ڈھکیل رہا ہے اس عرصہ میں طوفان کسی طرح کم نہ ہوا، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے پھر گھوڑے جو تھے کا حکم دیا اور طوفان ہی میں چل کھڑا ہوا۔ کوچوان کو دریا کے برابر چلنے کی سوچی کیونکہ اس طرح راستہ تین کوس کم ہو جاتا تھا کنارے گر گئے تھے اور کوچوان اس جگہ سے آگے نکل گیا جہاں مڑ کر راستہ پر آتا تھا اس طرہ ہم نامعلوم علاقہ میں پہنچ گئے طوفان تھا کہ کم ہونے کا نام نہ لین تھا تین دنوں سے روشنی دیکھی اور ادھر ہی چلنے کا حکم دیا۔ ہم گاؤں میں پہنچ گئے لکڑی کے گر جا میں روشنی تھی گر جا کھلا ہوا تھا اور منڈیر کے پاس کچھ برف گاڑیاں کھڑی تھیں برساتی میں لوگ گھوم رہے تھے ”ادھر آؤ!..... ادھر آؤ“ کچھ لوگ چلانے لگے میں نے کوچوان سے ادھر چلنے کو کہا کہ ہے تم نے اتنی دیر کہاں لگائی کسی نے مجھ سے کہا ”دلہن بے ہوش ہے پادری کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے ہم تو واپس جانے کی سوچ رہے تھے۔ چلو اتر بھی چکو میں خاموشی سے گاڑی سے نیچے کود پڑا اور گر جا میں داخل ہوا جہاں دو تین موم بتیوں کی مدھم روشنی تھی گر جے کے ایک تاریک کونے میں لڑکی ایک بیچ پر بیٹھی تھی کوئی دوسری اس کی کنپیاں سہلا رہی تھی چلو شکر ہے یہ

دوسری بولی آپ پہنچ تو گئے لی کو تو آپ نے ماری ڈالا تھا بوڑھے پادری نے میرے پاس آ کر پوچھا کیا شروع کرنے کا حکم ہے؟ شروع کیجئے شروع کیجئے قادر میں نے کھوئے ہوئے جواب دیا لڑکی کو اٹھایا گیا میں نے دیکھا کہ وہ صورت شکل کی بری نہیں عجیب سی ناقابل معافی شرارت مجھے سوچتی..... میں اس کے برابر لڑکے سامنے کھڑا ہو گیا پادری جلی میں تھا تین مرد اور خادمہ لڑکی کو پکڑے تھے اور صرف اس کی طرف متوجہ تھے ہمارا نکاح کر دیا گیا ”پیار کرؤ“ ہمیں حکم ملا..... میری بیوی نے اپنا زرو چہرہ میری طرف پھیرا۔ میں اسے چومنے ہی والا تھا کہ وہ چلا آئی ”ارے یہ وہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے“ اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ گواہوں نے مجھ کو سمجھی ہوئی نظروں سے دیکھا میں مڑا اور گر جے سے باہر آیا کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہ کی جلدی سے میں گاڑی میں بیٹھا اور چلا آیا..... چلاؤ۔

”او خدا یا!“ ماریا گادریلو وانا چلا آئی..... ”اور تمہیں یہ تک معلوم نہیں کہ تمہاری بد نصیب بیوی پر کیا گزری؟“

”نہیں مجھے تو اس گاؤں کا نام تک معلوم نہیں جہاں میری شادی ہوئی تھی اور نہ یہ یاد ہے کہ میں کس چوکی سے آیا تھا۔ اس وقت اس پورے واقعہ کو میں نے اتنی کم اہمیت دی کہ گر جا سے نکلے ہی مجھے نیند آ گئی اور اگلے دن صبح میں تین چوکیوں تک سوتا رہا۔ میرے ساتھ جو نوکر تھا لڑائی میں کام آ گیا..... اب مجھے قطعاً امید نہیں کہ میں اس لڑکی کا پتہ چلا سکوں، جس کے ساتھ میں نے اس قدر بے رحمی سے مذاق کیا تھا۔

”خدا یا“ ماریا گادریلو وانا نے اس کی آستین پکڑ کر کہا۔  
”وہ تم تھے؟ اور تم نے مجھے پہچانا نہیں؟“  
برمن کا رنگ فق ہو گیا اور وہ اس کے قدموں پر گر پڑا۔

☆☆